اولد بوائے

ملیگڈھ اولڈ بوائز کا ادبی، تاریخی اور تعلیمی ماہنامہ

فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۲۷ء

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۴۰۱۲ سلطان پورہ حیدر آباد دکن سے شائع کیا

قیمت ششماہی

قیمت سالانہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توارُدِ معنوی

از جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے

دو مہینے ہوئے کہ "نگار" میں ایک مضمون حافظ اور ابن یمین کے متعلق چھپا تھا۔ اسے پڑھ کر ان لوگوں کو دلی صدمہ ہوا ہوگا۔ جو حافظ کے گرویدہ اور ثنا خواں ہیں، اور انہیں میں یہ ہیچمیرز بھی ہے اس تاسف کا باعث یہ نہیں ہے کہ مضمون نگار نے حافظ اور ابن یمین کی غزلوں کا مقابلہ کرکے یہ دکھایا ہے کہ حافظ کا ماخوذ عنہ ابن یمین کا دیوان ہے، بلکہ وجہ افسوس یہ ہے کہ حافظ پر علانیہ "سرقہ" کا الزام لگایا گیا ہے، اور پھر یہ نہیں کہ دو چار شعر کا سرقہ کر لیا ہو۔ بلکہ اس مضمون کا لب لباب ہی یہ ہے کہ حافظ نے ابن یمین کا دیوان غایب کر لیا، اور اسی میں کچھ رد و بدل کر کے اسے اپنا بنا لیا، اور (صاحب مضمون کے نزدیک) ابن یمین کے دیوان کے مشہور نہ ہونے بلکہ تقریباً مفقود ہو جانے کا سبب بھی ہے۔

ابن یمین کے ایسے مشہور و معروف شخص کے پورے دیوان کا استتار و انتساب (یعنی اسے اڑا لینا اور اپنا بنا لینا) تو بڑی بات ہے، شعرا ایک شعر کا بھی اپنی ملک سے نکل جانا کسی ملک کے نکل جانے سے کم نہیں سمجھتے۔ اسی باب میں ایک دلچسپ واقعہ قابل بیان ہے: قم میں دو شاعر

ملک تخلص کرتے تھے۔ ان میں سے ایک میرزا ملک قمی ہندوستان آگیا۔ دوسرے شاعر ملک طیفور کے ایک شعر کی نسبت قم میں یہ چرچا ہوا کہ یہ شعر میرزا ملک کا ہے۔ طیفور نے خاص اسی غرض کے لئے ایک قاصد ہندوستان بھیجا، اور میرزا ملک سے سند حاصل کر کے لوگوں کو ساکت کر دیا۔ شعر بھی لاجواب ہے۔

خونچکانست ملک تیغ ستم میترسم — کہ پے آخر بدر خانۂ قاتل بردد

جب ایک شعر کی نسبت یہ انہماک و انہمام ہے، تو کیسے ممکن ہے کہ ابن یمین کا دیوان ان کی زندگی ہی میں غائب کر لیا گیا ہو، اور انہوں نے اس کی تلافی کی سعی نہ کی ہو۔ بہرحال، مضمون نگار کے اصول موضوعہ کو قبول کرتا، اگرچہ عقلا و نقلا دونوں طرح بعید از قیاس و خلاف واقعہ ہے، مگر اسے رد کرنے کے لئے بھی طولانی بحث کی ضرورت ہے، اور میں اپنی حالت کے اعتبار سے اس بحث میں نہیں پڑھنا چاہتا! بلکہ میں اصل مقصود توارد لفظی و معنوی پر ایک دوسری ہی نوعیت سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

شاعری کی تاریخ، ایسے اتفاقات سے خالی نہیں ہے، کہ دو شاعروں کے یکساں جذبات تقریباً یا کلیتہً "ایک ہی سے الفاظ میں ادا ہوئے ہوں۔ حال میں عبدالعلی صاحب شوق (سندیلوی) نے ایک کتاب "اصلاح سخن" کے نام سے شائع کی ہے۔ اتحاد لفظی کا لطف اٹھانا ہو تو اسے دیکھئے۔ متعدد مصرعے ایسے ہیں، کہ مختلف شعرا نے ان پر اصلاح کا قلم چلایا ہے، اور اصل مصرعے کو کاٹ کر، ان کے بجائے، اپنی طرف سے دوسرے مصرعے لکھے ہیں اور چونکہ ردیف و قافیہ کو قائم رکھنا لازمی تھا اس لئے اکثر یہ اصلاحی مصرعے متحد الالفاظ ہو گئے ہیں۔ مگر اتحاد الفاظ کے سوا ایک اور شئے توارد معنوی بھی ہے اور مجھے اس توارد معنوی سے خصوصیت کے ساتھ دلچسپی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں مینے عربی، فارسی اور اردو کے ایسے اشعار کی ایک کافی تعداد "گلچین" میں شایع کی تھی، جو بالکل ہم معنی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ وہ "سرقہ" نہیں ہیں اشعار کے مقابلہ کا عام و مقبول طریقہ اتحاد ردیف و قافیہ کے ساتھ ہے۔ مگر مجھے خاص

اتحاد خیال میں ایک عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔ میں زیادہ تر یہ دیکھا کرتا ہوں کہ کس طرح کوئی "خیال" کسی شاعر کے ذہن میں آتا ہے، اور وہ اسے بلا تکلف نظم کرکے اپنے "افکار ابکار" میں شامل کرلیتا ہے، اور یہ محسوس بھی نہیں کرتا "کاین عروس ہزار داماد است"۔ اس کے بعد دوسری خلش میرے دل میں یہ پیدا ہوا کرتی ہے کہ ایک ہی خیال مختلف ماحول کے زیر اثر کس طرح مختلف انداز میں ظاہر کیا جاتا ہے۔

ان دونوں امور کو چند مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔ میرے دوست سید فضل الحسن حسرت موہانی کا ایک بے نظیر شعر ہے:-

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاری دل　　　التفات اُس کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ اس شعر کے کہتے وقت کسی دوسرے ہم معنی شعر کا وہم و گمان بھی حسرت کے ذہن میں تھا۔ مگر ایک فارسی شاعر سات سو برس قبل کہہ گیا ہے:-

اول نظر ار چہ سرسری بود　　　سرمایۂ اصل دلبری بود

فارسی کے شعر میں "سرسری" کے لفظ نے اُردو شعر کے مصرع ثانی کا پورا کام دیا ہے بلکہ اس سے کچھ زائد کا بھی اظہار کر دیا ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو، رشید لکھنوی نے ایک مطلع بڑی شان کا کہا تھا؎

سنے جاتے ہیں کہن آپ کے دیوانوں کے　　　چاک دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے

لکھنؤ میں اس کی بڑی دھوم مچی۔ میرے مکرم حضرت ریاض نے اس پر مطلع کہا؎

گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے　　　شکل معشوق کی، انداز ہیں دیوانوں کے

اخباروں میں اس کا بہت چرچا ہوا، مطلع لاجواب قرار پایا، اور یہ مسلم ہوگیا کہ "گل" میں ایک ساتھ "عاشق" "معشوق" کی شان کا جمع کردینا بالکل نیا خیال ہے؛ جسے آج تک کسی نے نظم نہیں کیا۔ مگر سنئے، ایسے کئی صدی قبل کا شعر:

گل را اگر ز لطف نسیے گذار آمد　　　دل پارہ پارہ کرد و دلدار آمد

کیا حضرت ریاض نے جس وقت مذکورہ بالا مطلع کہا تھا، ان کو اس فارسی شعر کا علم تھا؟

میں تیقن کے ساتھ کہتا ہوں کہ نہیں ہرگز نہیں۔ حضرت ریاض کے ساتھ باوجود کمال عقیدت
میں اسقدر ظاہر کر دینے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ ریاض کے شعر نے اگرچہ دنیائے اردو کو
مسخر کر لیا مگر تشبیہ میں ایک تناقص رہ گیا۔ "گل" کی کامل تطبیق "عاشق چاک گریبان"
کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ مصرع ثانی یہ چاہتا ہے کہ کوئی معشوق ہو اور کسی عاشق کا دہجیاں
اڑا ہوا پیرہن اس کے گلے میں ڈالدیا جائے۔ فارسی کے مصرع ثانی کا کمال یہی ہے
کہ تضاد میں تطبیق پیدا کر دی ہے۔

علیٰ ہذا داغ کا (یا شاید کسی اور کا) یہ شعر زبانزد ہے ؎

کوئی کھیل نہیں نظربازی　　نام اس کھیل کا ہے سربازی

حافظ مدتوں پہلے کہہ گئے ہیں ؎

عشقبازی کار بازی نیست اید ل سر بباز　　ورنہ گوئے عشق نتوان زد بچوگان ہوس

اردو کے دونوں مصرعے فارسی کے صرف ایک مصرع اول میں آ گئے ہیں، اور مصرع
ثانی میں جو تنبیہ لطیف بصورت توجیہ ہے اس کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ داغ نے
(یا جس کسی کا شعر ہو اس نے) حافظ کا یہ شعر ذہن میں محفوظ رکھکر کہا تھا۔ اس مقابلہ سے یہ بھی واضح
ہوتا ہے کہ ایک ہی تخیل اختلاف احوال کے لحاظ سے کس طرح مختلف ہئیت اختیار کر لیتا ہے۔
خیال ایک ہی ہے مگر اردو کا شعر بالکل عامیانہ ہے۔ حافظ نے مصرع ثانی کی گونہ پارسایانہ
تشویق و ترہیب سے علانیہ رندی پر پردہ ڈالنا چاہا ہے۔ دیکھئے کہ یہی خیال ایک صوفی
صافی کے دماغ میں پہنچکر کیا صورت اختیار کر لیتا ہے ؎

عشق از اول چرا خونی بود　　تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

اس شعر کی فلسفیت پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کس خوبی سے اصل حقیقت کو کھولدیا ہے۔
عشق کی یہ ساری خونریزی کھرے کھوٹے کے پرکھنے کیلئے ہیں، ورنہ اصلاً و واقعاً عشق خونی
نہیں ہے۔

غالب کا ایک نہایت ہی سرور افزا شعر ہے ؎

مجھ تک کب اسکی بزم میں آتا تھا دور جام — ساقی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں

نازک خیالی میں کوئی شک نہیں، مگر سوئے ظن نے ذرا کرکری کر دی ہے۔ پینے سے قبل ہی بدگمانی ہوئی اور معلوم ہوتا ہے کہ نہیں پی۔ خمخانۂ فارس کے میکش کے وہاں اس بدگمانی کی گنجائش نہیں۔ بلا وسواس پی لی، اور پینے کے بعد کچھ محسوس ہوا۔ اسوقت عالم بیخودی میں مستانہ وار فرماتے ہیں:-

در شرابم چیز دیگر ریختی، در ریختی — بادہ تنہا نیست این آمیختی آمیختی!

اس تکرار قافیہ نے رندانہ عربدہ جوئی کا کچھ عجب نقشہ کھینچ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تہدید مستانہ سے بطور تاوان کچھ اور وصول کیا چاہتے ہیں[1]

غالب کا یہ شعر بھی ان کے منتخب اشعار میں ہے، ؎

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے، باد پیمائی

غالب نے یہ خیال پیدا کیا ہے کہ ہوائے خوش بھی تاثیر میں شراب سے کم نہیں ہے۔ اسمیں "باد" اور "بادہ" کے الفاظ نے جان ڈالدی ہے۔ مگر غالب سے چھ سو برس قبل مولانا رومیؒ اس خیال کو ایک حکایت کے ضمن میں اس سے زیادہ موثر پیرایہ میں ظاہر کر گئے ہیں زیادہ موثر اسوجہ سے کہ غالب نے خاص انہیں دو لفظوں کا جوڑ ملانے کے لئے شعر وضع کیا ہے، اور مولاناؒ نے امر واقع کے طور پر لکھا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

بوئے خوش را عاشقانہ میکشید — جان او از باد، بادہ می چشید

---

[1] یہیں سے اختلاف سوال کے اثرات کی ایک نہایت تاباں مثال ملاحظہ فرمائیے۔ کعبؓ بن زہیر نے اپنے شہرہ آفاق قصیدۂ "بانت سعاد" (معروف بہ قصیدۂ بردہ شریف) میں اس آمیزش کا ذکر کیا ہے، مگر متانت کی یہ انتہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کسی عمل طبی میں آمیزش شراب کا کیمیائی وخواصی تجربہ کیا جارہا ہے:-

تجلو عوارض ذی ظلم اذا ابتسمت — کانہ منہلٌ بالراح معلول

شجت بذی شبم من ماء محنیۃ — صافٍ بابطح اضحی وھو مشمول

مطلب یہ کہ شراب میں پانی اس اندازسے ملا ہے کہ رقیق تر ہوگیا ہے مگر قوت بالکلیہ زائل نہیں ہوئی ہے، خود پانی کے حالات وخواص یہ ہیں کہ سرد ہی، پہاڑ کی موڑ سے لیا گیا ہے، صاف ہے، چوڑے چکلے نالے کا پانی ہے، سویرے ہی سویرے لیا گیا ہے، اسپر باد شمالی [illegible]

حریری نے بھی شراب کے متعلق ایک جگہ اسی قسم کی صنعت تجنیس سے کام لیا ہے۔ مگر اس نے راح (شراب) اور راح (کف دست) ایک ہی لفظ کو دو معنی میں استعمال کر کے اسے اور بھی کامل بنا دیا ہے:۔

نھانی الشیب عما فیہ افراحی — فکیف اجمع بین الراح والراح

حافظ نے بھی یاد کو بادہ سے ربط دیا ہے اور "راح" کو "روح" سے پیوست کیا ہے بلکہ "پیمان" و "پیمانہ" کا بھی جوڑ ملا دیا ہے:۔

بادہ در دہ چند ازیں باد غرور — خاک بر سر نفس بد فرجام را
بیا کہ قصر عمل سخت سست بنیاد است — بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است
بادۂ لعل لبش کز لب ما دور مباد — راح روح کہ پیمان دہ و پیمانہ کیست

علیٰ ہذا روزے کے متعلق غالب کا ایک قطعہ بطور لطیفہ مشہور ہے ؎

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

فارسی شاعر مدتوں پہلے کہہ گیا ہے۔

آمد رمضان، نہ صاف داریم نہ دُرد — وز چہرۂ من گرسنگی رنگ نبرد
در خانۂ ما زخوردنی چیزے نیست — لے روزہ برو ورنہ ترا خواہم خورد

کیا غالب نے اس رباعی سے "روزہ کھانے" کا مضمون لیا ہے؟ یہاں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا، کہ اگرچہ مطلب ایک ہی ہے، مگر فارسی کی شان بڑھی ہوئی ہے؟ غالب نے عذر تقصیر کیا ہے، اور فارسی شاعر نے اس کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ روزے کو پہلے ہی دربدر کیا۔

لیکن مذکورۂ بالا ترجیحات سے اردو اشعار کی تعریف مقصود نہیں ہے۔ بسا اوقات اُردو کے اشعار فارسی سے بڑھ بھی جاتے ہیں۔ حافظ کا شعر ہے:۔

سر ز مستی بر نگیرد تا بصبح روز حشر — ہر کہ چوں من در ازل یک جرعہ خورد از جام دوست

اس میں اصل خیال "کیف شراب" سے حشر تک ہوش میں نہ آنے کا ہے۔ حافظ نے

اس سرمستی کا آغاز ازل سے کیا، صبح حشر تک کے لئے بیدار ہو گئے۔ ریاض نے اسے دوسرے جانب ہٹا کر شام حشر تک پہنچا دیا، اور حق یہ ہے کہ ریاض کے تخیل کو فوقیت ہے:

پی لی تھی کچھ کہ چین سے گزرے شب لحد — دن ڈھل چکا ہے حشر کا اب تک خمار ہے

علیٰ ہذا حافظ کا شعر ہے:

حافظ شراب و شاہد و رندی نہ وضع تست — فی الجملہ میکنی و فرو میگذارست

ریاض نے اس تخیل (تضاد وضع ظاہری و شغل مخفی) کو اور پر لطف بنا دیا ہے:

مے ریاض آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سفید — ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاریاں

خیام کی رباعی مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت پاکیزہ رباعی ہے:

ہر سبزہ کہ برکنار جوے رستہ است — گویا ز لب فرشتہ خوے رستہ است
پا بر سر سبزہ ہا بخواری ننہی — کاں سبزہ زخاک لالہ روے رستہ است

مگر انصاف یہ ہے کہ غالب نے ایک شعر میں اس مطلب کو اس سے بہتر ادا کر دیا ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اب میں دو تین مثالیں فارسی ہی کی دیتا ہوں جس میں ایک ہی مضمون کو تقریباً ایک ہی سی شان کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ حافظ کا شعر ہے:

بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من — کوتاہ کرد قصۂ زہد دراز من

محمد شیریں مشہور بہ مغربی اس خیال کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

چشم اگر اینست و ابرو این و ناز و عشوہ این — الوداع اے زہد و تقویٰ الفراق اے عقل و دیں[1]

شعر ذیل ضرب المثل کی حد تک پہنچا ہوا ہے:

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

---

[1] اردو کے شاعر نے اس تعمیم میں تخصیص کر کے ایک عجیب منظر پیش نظر کر دیا ہے تا کہ درگفتن می آید۔

جب ہاتھ میں ساقی کے گلابی ہوگی — اور چشم سیہ مست شرابی ہوگی
تب عقل و خرد پہ کیا بلا آئیگی — اور ہوش کے سر پہ کیا خرابی ہوگی

اس کے جواب میں ایک دوسرا شعر بھی موجود ہے:

جمالِ شخص نہ چشم است و زلف و عارض و خال　　　ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداریست

معشوق کے تنہا سیر باغ کے جانے کی شکایت شیخ سعدیؒ اور مولانا رومیؒ دونوں کو ہی اور دونوں نے نہایت پر لطف طور پر اس کا اظہار کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ کے شعر کی لطافت بڑھی ہوئی ہے:

سرو سیمینا بصحرا میروی　　　نیک بے مہری کہ بے ما میروی　　　(سعدیؒ)

باز چوں گل سوے گلشن میروی　　　با تو ام گرچہ تو بے من میروی　　　(رومیؒ)

توارد معنوی کی ان چند مثالوں کے بعد اب مجرد اتحاد خیال کی دو ایک مثالیں اس اعتبار سے عرض کرتا ہوں کہ ایک ہی خیال ماحول کے اثر سے کس طرح مختلف قالب اختیار کر لیتا ہے:

"تعارف ذات" ایک بہت ہی عام خیال ہے کہ شاعر کسی نہج سے خود اپنا تعارف کرائے۔ فخریہ اشعار اور "در مدح خود میگوید" کی بنا یہی ہے اس قسم کے اشعار کی کمی نہیں ہے۔ مگر اردو میں حضرت میر تقی میر نور اللہ مرقدہٗ کا ایک شعر ہے، جو آپ اپنا نظیر ہے:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے　　　جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے[1]

شعر کی لطافت و نزاکت اور پھر حسرت و یاس کے شمول سے قلب پر ایک عجب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر با ایں ہمہ، شعر کے لفظ لفظ سے عجز و مسکینی، تذلل و عدم اعتماد نفس کا اظہار ہو رہا ہے۔ کسی موقع پر متنبی کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنا تعارف کرائے، اور اس نے بھی ایسے ہی متعدد شواہد سے اپنا تعارف کرایا ہے۔ مگر فرق ملاحظہ ہو:

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی　　　والضرب والطعن والقرطاس والقلم

---

[1] بھائی منظر اشہر نے بھی اس مضمون کا ایک شعر خوب نکالا ہے ؎

گل نہ جانے ہاتھ کانوں پر رکھے غنچہ مگر
باغباں واقف تو ہے مجھ سے مری آواز سے

(گھوڑے مجھے جانتے ہیں راتیں مجھے جانتی ہیں، بے آب و گیاہ میدان مجھے جانتے ہیں، فریق شمشیر وسناں مجھے جانتی ہے، اور کاغذ و قلم بھی۔) ترجمہ میں اصل کا لطف کسی طرح سے پیدا نہیں ہو سکتا پھر بھی امتیاز ظاہر و باہر ہے۔ یہاں گل ہے نہ بوٹا، گھوڑا ہے نہ میدان، تلوار ہے اور نیزہ، اور پھر کاغذ بھی ہے اور قلم بھی؛ یعنی شاعر صاحب القلم ہونے کے ساتھ ہی صاحب السیف بھی ہے۔

اس شعر کے نقل کرنے کے بعد اسکا واقعہ متعلقہ نہ بیان کرنا جان شاعری پر ستم کرنا ہے۔ سیف الدولہ نے ایک مرتبہ کسی دوسرے شاعر کو متنبی پر ترجیح دی۔ متنبی نے ایک عتابیہ قصیدہ لکھا اور لکھکر فردوسی کیطرح بھاگا نہیں، بلکہ سیف الدولہ کو سنا بھی دیا۔ اسی قصیدے میں یہ فخریہ شعر بھی ہے موت کیلئے حیلے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، یہی شعر متنبی کی جان لینے کا سبب ہوا۔ متنبی آخر آخر سیف الدولہ سے ناخوش ہو کر مصر کو چلا گیا، وہاں کافور اخشیدی کی مدح کرتا رہا۔ اس سے بھی موافقت نہ ہو سکی تو فارس میں عضد الدولہ کے پاس گیا۔ وہاں بھی نہ بنی تو کوفہ کو چلا۔ راستہ میں فاتک اسدی نے اُسے گھیر لیا؛ کیونکہ متنبی نے اسکے قبیلے کی ہجو کی تھی معمولی مقابلہ کے بعد متنبی نے بھاگنا چاہا، غلام نے کہا کہ کیا آپ نے یہ شعر نہیں کہا ہے: والخیل واللیل...... یہ سنتے ہی متنبی جوش میں آکر پلٹ پڑا اور لڑتے لڑتے جان دیدی۔ مشرق و مغرب کا تمام دفتر نظم اسکی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کر سکتا کہ کسی شاعر نے اپنے شعر پر جان دیدی ہو۔

افسانہ از افسانہ میخیزد۔ متنبی کے سوا کسی شاعر نے اپنے شعر کی آن قایم رکھنے کیلئے تو جان نہیں دی ہے، مگر عالم خیال میں وہ ہر ساعت، ہر لحظہ جان دیتے رہتے ہیں۔ اِس جان دینے کی صورتیں ایک دو نہیں سیکڑوں ہیں؛ از انجملہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ اپنے کو شمشیر ناز کے نذر کر دیں۔ اسکی بھی تشبیہیں اور تمثیلیں بیشمار ہیں، از انجملہ ایک یہ ہے کہ "تلوار کا بوسہ لیلینا" یہی تصور دو شاعروں کے ذہن میں آتا ہے، مگر دیکھئے کہ اپنی اپنی حالت کے اعتبار سے دونوں کس طرح اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اردو کا شاعر (داغ ؒ) کہتا ہے:۔

تمھاری تیغ کا منہ چڑھ کے لے لیا بوسہ — کبھی کسی سے نہ ہم دبکے بانکپن ہی سے ہے،

شعر کے "بانکپن" میں کوئی کلام نہیں، شاعر نے بہت ہمت دکھائی ہے، مگر آخر ہر پھر کے دائرہ کے اندر ہی

عربی کا شعر ہے (شاعر کا نام اسوقت یاد نہیں آتا) ؎

ذکرتک والرماح نواھل منی وبیض الھند تقطر من دمی

فوددت تقبیل السیوف لانھا لمعت کبارق ثغرک المتبسم

میں نے تجھے اسوقت یاد کیا جب نیزے میرے جسم میں پیوست ہو رہے تھے، اور ہندی تلواروں سے میرا خون ٹپک رہا تھا۔ میں نے جو اسی شوق سے تلواروں کا بوسہ لیا وہ اس وجہ سے تھا کہ اسکی چمک نے تیرے تبسم دنداں کی چمک کو یاد دلایا تھا۔

خدارا، ذرا آنکھ بند کرکے یہ تصور ذہن میں پیدا کیجئے کہ معرکہ کارزار گرم ہے، نیزے جسم میں پیوست ہو رہے ہیں، تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے، اور عاشق ہے کہ بڑھ بڑھکر تلواروں کا بوسہ لے رہا ہے؛ صرف اسوجہ سے کہ تلوار کی چمک کسی کے دانتوں کی چمک کو یاد دلاتی ہے۔

یہ دونوں مثالیں شورانگیز مثالیں ہیں۔ اب ایک پرسکون مثال بھی ملاحظہ ہو۔

شیخ کے خضاب پر بہتان اڑانا تو بہت عام ہے۔ سیکڑوں شعر موجود ہیں، مگر اہیں میں فلسفۂ خضاب، پر صائب کا ایک با تمکین شعر ہے!

خضاب پردۂ پیری نمی شود صائب بمکروحیلہ خزاں را بہار نتواں کرد

صائب تمثیل کے بادشاہ ہیں۔ انہوں نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے ایک بے نظیر مثال دی ہے، مگر ابوالحسن علی بن عباس (المتوفی ۲۸۳ھ) اس مفہوم کو نہایت منطقیانہ وفلسفیانہ طرز پر صائب سے سیکڑوں برس پہلے سمجھا گئے ہیں:۔

اذا دام للمرء الشباب ولخلقت محاسنہ ظن السواد خضابا

فکیف یظن الشیخ ان خضابہ یخال سوادا او یظن شبابا

جب شباب زیادہ دنوں رہتا ہے تو دیرینہ ڈاڑھی کی اصلی سیاہی خضاب معلوم ہونے لگتی ہے؛ پس "شیخ" (بڈھا) یہ کیونکر خیال کرسکتا ہے کہ اسکے خضاب کو کوئی اصلی سیاہی سمجھے گا یا اسپر شباب کا گمان ہوگا

اردو کا بھی ایک شعر تقریباً اسی مفہوم کا ذہن میں ہے، مگر وہ ان پاکیزہ اشعار کیساتھ نہیں لکھا جاسکتا۔

سن لینے میں البتہ کوئی جرم نہیں ہے۔

باقی ہے دل میں شیخ کے الفت شباب کی
کالا کریگا منہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

یہ چند مثالیں منفرد اشعار ہیں تو اردو معنوی کی پیش کیگئی ہیں۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی سے خیال کو مختلف شعرا نے پھیلا کر بیان کیا ہو؟ اسمیں اتحاد کلی نہیں پیدا ہو سکتا، صرف مضمون واحد ہوتا ہے۔ مگر اس سے شاعر کے خصوصیات اور باہمی وجوہ ترجیح بہت واضح طور پر نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔

شرف الدین شفروہ ساتویں صدی کے شعرا میں ہیں۔ ان کی ایک غزل "تاریخ گزیدہ" (حمد اللہ المستوفی) میں منقول ہے۔ شعرا کی ایلچی گری "صبا" کی پرانی خدمت ہے، اور یہ بھی اپنے ادائے فرض میں نہایت چست و مستعد ہے۔ مگر شعرا نے اس سے کام لینے میں بحری تاریرقی کے کوڈ کیطرح ہمیشہ اختصار و رمز کو مد نظر رکھا ہے۔ شفروہ نے اسکی پروا نہیں کی اور "صبا" کو "قاصد" نہیں بلکہ "مختار عام" بنا دیا ہے ملاحظہ ہو "مختار نامہ"

گر توانی اے صبا کن بگذرے بر کوی او
گر دلت خواہد برا ز من سلامے سوی او

آن زمان کانجا رسی آہستہ باش و دم مزن
تا نشورد خواب خوش بر نرگس جادوی او

حلقۂ زلفش مجنباں جز بانگشت ادب
ہاں وہاں تا ترکی مکن با طرۂ ہندوی او

نرم نرم آں رقعۂ مشکین برانداز از رخش
ور گمان بد نداری بوسہ زن بر روی او

نے غلط گفتم من ایں طاقت ندارم زینہار
گر رسول خاص باشی تیز منگر سوی او

گر دلم بینی در انجا گو حرامت باد وصل
من چنیں محروم تو پیوستہ ہم زانوی او[1]

شفروہ نے پھر بھی چھ شعروں تک بس کیا ہے۔ شیخ فخر الدین عراقی کا زمانہ بھی تقریباً وہی ہے۔ انہوں نے بھی اسی نوع کی ایک غزل لکھی ہے، اور "صبا" کو پورا پورا "کمیشن" دیدیا ہے:

اے باد "صبا" اگر توانی
برخیز "تنگ" مکن گرانی

[1] سیف اسفرنگی کا دل بھی انہیں چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ انہوں نے بھی "صبا" کے ذریعہ سے کچھ کہلایا ہے۔ مگر خود دل وہاں کس حال میں تھا اسکی نسبت شفروہ اور اسفرنگی کے خیالات ایک دوسرے کی ضد ہیں:-

اے باد صبا درا بکلامے برساں
وز من بنگار من پیامے برساں

در طرۂ او دلیست ما را زنہار
گر زندہ بیا پیش سلامے برساں

بگذر سحرے بکوئے جانان | دریاب حیات جاودانی
بارے تو نہ چو من مقید | از وے بچہ عذر باز مانی
خاک در او ببوس و ازبا ش | خدمت برساں چنانکہ دانی

اس کے بعد پورے بائیس (۲۲) شعروں کا "ہدایت نامہ" صبا کو عطا کیا ہے۔ بخوف طوالت اس کے نقل کرنے سے معذوری ہے۔ ان دونوں شعرا کے بعد آٹھویں صدی میں حافظ کا زمانہ آیا وہ کب پیام سلام سے باز رہنے والے تھے۔ انہوں نے بھی اسی "صبا" سے کام لیا ہے، مگر تین شعروں میں کل معاملہ ختم کر دیا ہے۔

اے صبا گر بگذری بر ساحل رود ارس | بوسہ زن بر خاک آں وادی و مشکیں کن نفس
منزل سلمیٰ کہ بادش ہر دم از ما صد سلام | پر صدائے سارباں بینی و آہنگ جرس
محمل جاناں ببوس آنگہ بزاری عرضہ دار | کز فراقت سوختم اے مہرباں فریاد رس

حافظ کے ان تین شعروں میں جیسی کچھ لطافت اور نزاکت اور جامعیت ہے ان سے لطف اندوز ہونا تو ذوق سلیم پر منحصر ہے، مگر جن ظاہری اسباب سے یہ خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں ان میں بعض یہ ہیں: (۱) شفروہ اور عراقی دونوں نے "صبا" کیلئے "توانی" کی شرط لگائی ہے، جس سے عزیمت کے بجائے تشکیک پیدا ہو جاتی ہے، حافظ نے اس امکان و عدم امکان کے تصور کو یکقلم اڑا دیا ہے۔

(۲) اول الذکر دونوں شاعروں نے "کوئے جاناں" کو مقام معلومہ قرار دے لیا ہے۔ حافظ نے یہاں بھی غیرت کو نہیں چھوڑا اور خاص اسی میں دشواری حائل کر دی ہے۔

(۳) دوسروں نے سلام کو صبا کے پہنچنے پر منحصر رکھا ہے، حافظ کو یہ گوارا نہیں سلام تو ہر آن و ہر ساعت پہنچتا رہتا ہے، البتہ کچھ پیغام خاص ہے، جسے صبا کے ذریعہ پہنچایا ہے۔ بہرحال میری رائے ناقص میں محاکمہ کیلئے متحد الاوزان والقوافی غزلوں کے بجائے متحد المعانی غزلیں زیادہ موزوں ہیں مگر یہ کام نسبتاً دقت طلب ہے۔

قصہ کو آخر تک کیوں نہ پہنچا دیا جائے؟ کوئی ایسا بھی خوش نصیب گزرا ہے کہ اس کا

پیغام لیکر صبا گئی ہے اور واپس آئی ہے اور حسن کا ظن یقین کے حد کو پہنچ گیا ہے کہ ضرور ادھر سے بھی کوئی جواب لائی ہے۔ اب ذرا اسوقت کی بیقراری کو ملاحظہ فرمائیے:

اے صبا، ہرانے کہ داری در سر یارے بگو — ورنہ گوئی باکسے، از عاشقاں بارے بگو
قصہ کن در گوش ما، گر دیگراں نامحرمند — با دلِ پرخونِ ما، پیغام دلدارے بگو (مولانا رومیؒ)

اس جملہ معترضہ کے بعد اس اتحاد خیال کی مثال میں ایک اور غزل پیش کرتا ہوں مگر ان دونوں غزلوں کی یکسانیت پر حاوی ہونے کیلئے پرواز خیال کو ذرا بلند کرنا پڑیگا۔ خدا کی ہستی کے دلایل میں سب سے قوی دلیل خود موجودات عالم ہیں۔ مگر مختلف دماغوں میں اس کا تصور مختلف حیثیت سے آتا ہے۔ ایک جاہل کے ذہن میں بھی کسی ایک وقت ہیبت افزا خیال پیدا ہو جاتا ہے، جسے قبول کرنے کیلئے صغریٰ کبریٰ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک فلسفی کے دماغ میں بھی یہ خیال زور کرتا ہے، مگر وہاں دلائل انی ولمی کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ شاعر پر بھی کسی وقت اس سے ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور وہ ہمہ تن حیرت بنکر ہر شئے میں اسی کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی کوئی کیفیت کسی وقت غالب کے دل میں پیدا ہوئی، اور مولانا رومیؒ پر بھی کسی وقت یہ وجد طاری ہوا، دونوں نے سوالیہ انداز میں اپنے جذبات دلی کا اظہار کیا ہے۔ اتحاد خیال کے اصول کو ذہن میں جما کر دونوں اشعار پر نظر کریں کہ کیونکر ایک ہی سے واردات دونوں کے قلب کو بیچین کئے دیتے ہیں، مگر اتنا ملحوظ رہے کہ

شعر غالب نتیجۂ ہستیست — شعر رومی زحیرت و مستیست

غالب نے سوالات خود اشیاء پر وارد کئے ہیں، مولاناؒ نے قدم آگے بڑھایا ہے۔ راز کو ذرا زیادہ کھول دیا ہے اور سوالات "شخص" پر عاید کئے ہیں؛ یعنی غالب کے یہاں "چیست" ہے، مولاناؒ کے یہاں "کیست"۔

غالب

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

مولانا رح

در چہرۂ دلبراں عیاں کیست؟ — در کسوتِ این و آں نہاں کیست؟
آنکس کہ بنورِ خود برافروخت — در خلوتِ جسم شمعِ جاں کیست؟
آنکس کہ بگردِ ماہِ رخسار — خطے بکشید از جہاں کیست؟
آنکس کہ زعکسِ عارضِ اوست — لطفِ گلِ حسنِ ارغواں کیست؟
گفتی کہ نہانم از نظرہا — ظاہر بظہورِ این و آں کیست؟
آں چہرۂ مہوشانِ دلکش — پیداست بہ بین کہ دلستاں کیست؟

مولانا کی غزل تیرہ شعروں کی ہے، اور سب شعر اسی انداز میں ہیں۔ غالب کی غزل گیارہ شعروں کی ہے، مگر اسمیں چھ شعر دوسرے انداز میں ہیں، اسلئے انہیں حذف کر دیا ہے، اور مولانا رح کی غزل سے چھ شعر جو زیادہ قریب المعانی تھے، لے لئے ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو ان غزلوں میں اتحادِ خیال کے قبول کرنے میں تامل ہو، اور سطحی طور پر نظر میں واقعی ایسا ہی معلوم ہوگا، مگر اصل یہ ہے کہ اتحادِ خیال کا بھی شجرۂ نسب ہے۔ خاندان کے کل ارکان شجرہ کی ایک ہی شاخ میں متحد نہیں ہو جاتے اسیطرح خیالات کا اتحاد بھی ایک ہی زینہ پر نہیں ہو جاتا، کہیں کہیں دو دو تین تین زینے طے کرنے پڑتے ہیں۔ معانی کا حال بھی الفاظ ہی کا ایسا ہے کہ بعض الفاظ کی اصل تک پہنچنے میں تین تین چار چار واسطے طے کرنا پڑتے ہیں۔[1] میری خود تو یہ کیفیت ہے کہ مجھے اشعار ذیل میں بھی "اتحادِ کامل" نظر آتا ہے:-

انکی نظروں کو کوئی کہتا نہیں — دل ہمارا مفت میں بدنام ہے

[1] اگرچہ بے محل ہے مگر میں اس کی مثال میں خود اپنی ایک واردات کا درج کر دینا چنداں ناموزوں نہیں سمجھتا، خیال ہے

(باقی صفحہ ۱۱۲)

پرسم زتو پرسیدن اگر عیب نباشد — عاشق چو نمی خواہی معشوق چرائی (خواجو)

ضروب الناس عشاق ضروبا — فاعذرہم اشفہم حبیبا (متنبی)

حاصل ان تینوں شعروں کا یہی ہے کہ عشق کے برانگیختہ ہونے کا باعث خود حسن ہے، ورنہ عشق کی بجائے خود کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اس سارے فلسفۂ حسن وعشق کو صاف لفظوں میں یوں کہدیا ہے :۔

ہیچ عاشق خود نباشد وصل جو — تا نہ معشوقش بود جویائے او (مولانا روم)

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۴)) کیونکہ یہ رسالہ پبلک کیلئے تو ہے نہیں، اس کے مخاطب تو صرف "برادران مدرسۃ العلوم" ہیں اور انہیں سے جو مجھے جانتے ہیں وہ مجھے ہمیشہ ہی سے کسی قدر بے تکا ہی سمجھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب میں شروع شروع میں دارالترجمہ میں آیا تھا تو میں نے بشپ (Bishop) کا ترجمہ "اسقف" کردیا، اور یہی ترجمہ چھپ گیا بعد میں اس پر اعتراض ہوا، اور معاملہ بورڈ میں پیش ہوا۔ میں نے یہ ترجمہ صرف اسوجہ سے کردیا تھا کہ عربی میں "اسقف" کا لفظ پڑھا تھا۔ اسے "بشپ" کا مرادف سمجھ لیا، خصوصیت کے ساتھ تحقیق نہیں کیا۔ بورڈ میں جب بحث چھڑی تو شہادت کیلئے دو گواہان عادل وتیسٹر اور بیجر کی طلبی ہوئی بیجر نے تو صرف اتنی ہی شہادت دی کہ عربی میں "بشپ" کے لئے "اسقف" استعمال ہوتا ہے۔ مگر ویبسٹر نے اپنے بیان سے سب کو حیرت میں ڈال دیا کہ "بشپ" اور "اسقف" ایک ہی لفظ کے دو تلفظ ہیں :۔ انگریزی Bishop از اینگلو سیکسن Biscop از یونانی Episcopos بمعنی بالا اور Skopeo بمعنی نگریستن" "اسقف" معرب Episkopos۔ پس بشپ کے معنی ہوئے از "بالانگرندہ" یعنی نگرانی کرنے والا :)

اب ذرا خیال کو اور آگے بڑھائیے۔ یونانی لفظ Episcopos کا صحیح ترجمہ عربی میں "اشراف" ہے اور "مشرف" کا عہدہ حکومت ہائے اسلامی میں ہمیشہ سے قائم رہا ہے۔ اور تمام کتابوں میں مذکور ہے۔ سعدی نے بھی نظم کیا ہے:۔

چو مشرف دو دست از امانت بداشت — بباید بر و ناظرے بر گماشت
ورا نیز در ساخت پا خاطرش — ز مشرف عمل برکن و ناظرش

اگر Episcopos کا بالکل لفظی ترجمہ انگریزی میں کیا جائے تو Overseer (اورسیر) ہے اور یہ عہدہ اب عام طور پر تعمیرات سے مخصوص ہے۔ الفاظ کی بھی خفیہ تاریخ اور ان کا باطنی مفہوم ہے، جس کی وجہ سے ہر لفظ کا ترجمہ کردینا ممکن نہیں ہوتا؛ ورنہ "اسقف" کے بجائے عربی میں "مشرف" اور انگریزی میں " اورسیر" ہونا چاہئے تھا۔

حاصل کلام یہ کہ اس توارد معنوی کا میدان بہت وسیع ہے، رواج قدیم تو یہ ہی کہ شعرا کا مقابلہ "قافیہ بندی" کے لحاظ سے ہو یعنی کسی خاص قافیہ کو مختلف شعرا نے جسطرح باندھا ہے اسی کے لحاظ سے شعر کا درجہ قرار دیا جائے۔ اس میں اصل امر قافیہ ہوتا ہے، خیال اس کے تابع ہوتا ہے، یعنی میدان مسابقت شدید حد بندیوں سے گھرا ہوتا ہے۔ لیکن فی زماننا کہ قافیہ پیمائی کیطرف زیادہ التفات نہیں رہا ہے؛ بلکہ بعض جدت پسند طبائع نے ردیف و قافیہ کو سرے سے اڑا دیا ہے، مقابلہ اگر دلچسپ ہو سکتا ہے تو اتحادِ خیال کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ میری اس نامربوط تحریر کا مقصود یہی ہے، کہ میں اپنے ان بھائیوں کو جو شعر و شاعری کا ذوق رکھتے ہیں، اسطرف توجہ دلاؤں کہ اگر وہ متحدالخیال اشعار کو نوٹ کرتے رہیں اور گاہ بگاہ انہیں اپنے رسالہ (اولڈ بوائے) میں شائع کرتے رہیں تو کچھ دنوں بعد طبیہ کانفرنس کے مجربات صدری کی طرح ایک دلچسپ مجموعہ اس قسم کے اشعار کا مرتب ہو جائے گا جو مسئلہ ارتقائے تخیل میں شاعرانہ و فلسفیانہ دونوں طرح پر کارآمد ثابت ہوگا۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔ لاشئ محروم الفراغ

کلامِ ضامنؔ

از جناب مولوی سیّد محمد ضامن صاحب ضامنؔ کنتوری

(۱)

گرمیٔ نازِ حسن سے سوز نفس کہاں نہیں — شعلہ فروش بجلیاں دشمنِ خس کہاں نہیں
اک ہمیں لے کے آئے تھے ہمتِ بے نیازِ شوق — راہ نورد جستجو مورد مگس کہاں نہیں
میکدہ ہو کہ خانقاہ بادۂ عشق چھپ کے پی — رہزنِ عیشِ بے خلش بیمِ عسس کہاں نہیں
عالمِ مادی میں ہے موجِ صدا کو مدّ و جزر — قافلہ گرمِ کوچ ہے بانگ جرس کہاں نہیں
دل میں تپاں ہے آرزو سینے میں دل ہے بیقرار — تن میں ہے دردمند روح قید قفس کہاں نہیں
بزمِ وجود میں ہے حرکت کا نام زیست — زخمۂ خور امید و بیم تار نفس کہاں نہیں

ضامنِ عافیت طلب عرصۂ زندگی ہے یہ
دل کو سکوں کہیں نہیں شورِ ہوس کہاں نہیں

(۲)

شوقِ دل کا ہے تقاضا ترا جلوہ دیکھوں — آنکھ کہتی ہے کہ خیرہ ہے نظر کیا دیکھوں
کیوں کروں دید کی خواہش نہیں جب طاقت دید — کچھ بصیرت ہے تو قدرت کا تماشا دیکھوں
خوابِ غفلت سے کھلے آنکھ تو ہنگامِ سحر — چشمۂ شرق سے اک نور ابلتا دیکھوں
ڈوبتے تاروں کے ہر نقطے سے لوں درسِ فنا — صفحۂ ماہ میں عبرت کا صحیفا دیکھوں
دے وہ توفیق سعادت تو کروں سجدۂ شکر — اک نئی روح کو قالب میں جھلکتا دیکھوں
لالہ و گل کے کٹوروں میں پیوں بادۂ شوق — چمنِ دہر میں میخانے کا نقشا دیکھوں

آنکھ میں چھائے جو مستیٔ مے نابِ شعور
طور کے جلوے کو رہینِ خم و مینا دیکھوں

الفتِ صیقلِ آئینۂ فطرت سمجھوں
لب جو سروِ سہی کو جو اکڑتا دیکھوں

شاخساروں سے سنوں نغمۂ داودی کو
مرغزاروں میں رُخِ خضر تمنا دیکھوں

گوشے گوشے میں نظر آئے جہانِ اُمید
چپے چپے میں حقیقت کا خزانا دیکھوں

پتے پتے میں پڑھوں حسنِ ازل کی تفسیر
ریشے ریشے میں نہاں مہن آرا دیکھوں

ذرے ذرے سے ہویدا ہو جمالِ خورشید
قطرے قطرے میں نہاں قلزم و دریا دیکھوں

ڈوب کر بحرِ فنا سے جو نکالوں سرِ عجز
یم ہستی مجرد کا کنارا دیکھوں

آج تو ہیں گرو شوق دل و جاں ضامنؔ
کل کے دن مجھ کو دکھاتا ہے وہ کیا کیا دیکھوں

(۳)

غیر گداز دل نہیں بادہ بہ جامِ آرزو
سوختہ جانیوں سے ہے رونقِ شامِ آرزو

ہے یہ کمالِ زندگی، ہے یہ مآلِ زندگی
خاک بہ فرقِ مدعا، زہر بہ کامِ آرزو

لذتِ عشرتِ جہاں مجھسے جو پوچھیے، تو ہے
بوئے کباب سوختہ گردِ مشامِ آرزو

موج سراب دشت ہے جلوہ بے ثباتِ عیش
حسرتِ برق تاب ہے تیغ نیامِ آرزو

نعرۂ بے اُصول ہے شکوہ جورِ آسماں
خونِ شفق نواز تھا بادہ جامِ آرزو

بوالہوس فضول، اور ترک ہوس محال ہے
پختۂ بے نیازِ تعلق کیسے ہو خامِ آرزو

شاخ غزال دشت پر جیسے براتِ عاشقاں
ہے سرِ شاخسار ہم یوں ہی مقامِ آرزو

ضامنِ آبرو فروش کر چکے آرزو میں نام
کچھ بھی حیا ہے گر نہ لو اب کبھی نامِ آرزو

---- (۰) ----

حاتم طائی

از جناب مولوی مسعود علی صاحب بی اے

ہندوستان کے مسلمان عرب کے اکثر نامور سرداروں کو بھول گئے، مگر شعرائے عجم کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے حاتم کا نام بھولنے نہیں دیا۔ اور اس کی سخاوت اور فیاضی کی اس قدر حکایتیں سنائیں کہ ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر اس کا نام ہے۔ یہ قبیلۂ بنی طے کا مشہور سردار اور شاعر تھا۔ باپ کا نام عبداللہ بن سعید بن حشرج، اور ماں کا نام عتبۃ بنت عفیف کہا جاتا ہے۔ حاتم کا باپ ایسے وقت میں مرگیا کہ حاتم بچہ تھا، اور اس کا ولی اس کا دادا سعد بن حشرج قرار پایا۔ اس کی ماں عتبۃ خوشحال اور فارغ البال عورت تھی، مگر حاتم کی ماں تھی۔ جو کچھ اس کے پاس آتا تھا اس کو بیدریغ مہمانی اور داد و دہش میں صرف کردیتی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کے بھائیوں نے اس کی تمام جائداد اس کے تصرف سے نکال لی۔ اس سے عتبۃ پر تکالیف گزرنے لگی چند روز کے بعد بھائیوں نے یہ خیال کرکے کہ جو تکلیف اس کو پہنچی ہے، اس سے اسکی اصلاح ہوگئی ہوگی، اونٹوں کا ایک مختصر سا گلہ اس کے پاس بھیجدیا۔ اسی زمانہ میں قبیلہ ہوازن کی ایک عورت جو ہر سال اس کے پاس امداد کے لئے آیا کرتی تھی، وارد ہوئی۔ اس نے حسب معمول اس سے افلاس کا اظہار کیا، اور اس دریادل عورت نے اونٹوں کا وہ گلہ کا گلہ اس کے حوالے کردیا، اور یہ اشعار پڑھے ؎

لعمری لقد ما عضنی الجوع عضۃ　　　فالیت أن لا أصنع الدھر جائعاً

شرح:- عض، کاٹا۔ الیت، میں نے قسم کھائی۔ الدھر، تمام عمر۔ جائع، بھوکا

معنی:- مجھ کو اپنی جان کی قسم جب سے میں نے بھوک کی تکلیف اٹھائی ہے، میں نے قسم کھائی ہے کہ میں کسی بھوکے کے سوال کو کبھی رد نہیں کرونگی۔

فقولا لهذا اللائمی الیوم اعفنی　　فان انت لم تفعل فعض الاصابعا

شرح:۔ اصبع جمع اصابع انگلیاں، عض الاصابع، افسوس کرنا، ندامت اٹھانا۔

معنی:۔ (اے میرے دونوں ساتھیو) میرے ملامت کرنے والے سے کہو کہ آج مجھے معاف رکھ، اور اگر تو ایسا نہیں کرتا، تو جا اپنی انگلیاں چبا۔

فماذا عساکم ان تقولوا لاختکم　　سوی عذلکم اوعذل من کان مانعا

شرح:۔ عسی شاید۔ عذل ملامت۔

معنی:۔ تم اپنی بہن سے شاید سوائے اپنی ملامت اور اُن لوگوں کی ملامت کے جو مانع خیر ہیں، کچھ اور نہ کہہ سکو۔

وماذا ترون الیوم الاطبیعتہ　　فکیف تبرکی یا ابن ام الطبائعا

معنی:۔ جو تم آج دیکھ رہے ہو، وہ سوائے فطرت کے اور کیا ہے! پس اے میرے ماں جائے بھائیو! میں اپنی فطرت کس طرح چھوڑ دوں؟۔

جو بچے ایسی ماؤں کی گودوں میں پرورش پائیں، اور فطرت نے بھی اُن کے ساتھ بخل نہ کیا ہو، وہ سوائے حاتم کے اور کیا ہو سکتے ہیں؟۔ کہا جاتا ہے کہ حاتم کی بچپن سے یہ عادت تھی کہ جو کچھ اُس کو کھانے کو دیا جاتا تھا، وہ تنہا نہیں کھاتا تھا، اور جو کچھ اس کو مل جاتا تھا وہ بیدریغ لوگوں کو دیدیتا تھا۔ اِس کے دادا نے جب یہ حال دیکھا تو اُس کو حکم دیا کہ وہ اونٹوں کے ساتھ جا کر چراگاہ میں رہا کرے، اور اس کے لئے ضروری سامان مہیا کردیا۔

حاتم وہاں بھی اپنی عادت کے مطابق ہمیشہ مہمانوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ مگر وہ گزرگاہ عام نہ تھی، اِس لئے مہمانوں کے ملنے میں دقت ہوتی تھی۔ ایک دن اسی تلاش میں نکلا۔ اتفاقاً اُس کو تین مسافر مل گئے، اور خود انہوں نے حاتم سے مہمانی کا سوال کیا۔ اس زمانے کے عربوں میں یہ کوئی معیوب امر نہ تھا؛ کیونکہ مہمان نوازی کو اپنی افزایش عزت کا سبب سمجھتے تھے، اس لئے مسافر بلا تامل یہ سوال کرتے تھے، کہ تم کو مہمان کی ضرورت ہے؟ حاتم کو اس

سوال پر تعجب ہوا۔ اس نے کہا کہ تم اونٹ دیکھتے ہو، اور پھر ایسا سوال کرتے ہو! یہ تین شخص عبید بن ابرص اور بشر بن ابی حازم اور النابغہ تھے؛ جو اپنے زمانے کے مشاہیر شعرا میں شمار ہوتے تھے، اور نعمان (منذر ثالث) بادشاہ حیرہ کے دربار کو جا رہے تھے۔ حاتم نے ان کے لئے تین اونٹ ذبح کئے۔ عبید نے کہا کہ ہم تو صرف تھوڑے سے دودھ کے طالب تھے، اور اگر ہم کو کھانا کھلانا ہی ضرور تھا تو ایک اونٹ کا بچہ کافی تھا۔ حاتم نے کہا کہ میں اس کو خود جانتا تھا، مگر میں نے تمہاری وضع قطع سے معلوم کیا کہ تم مختلف حصۂ ملک کے رہنے والے ہو، اس لئے میں نے چاہا کہ تم میں سے ہر شخص یہ قصہ اپنی قوم میں جا کر بیان کرے۔ ان لوگوں نے حاتم کی مدح میں اشعار کہے ان اشعار کو سن کر حاتم ایسا بیخود ہو گیا کہ اس نے جتنے اونٹ تھے سب ان لوگوں میں تقسیم کر دیئے اور قسم کھائی کہ اگر وہ اس ہدیہ کو قبول نہ کریں گے تو وہ تمام جانوروں کو بیکار کر دے گا۔ مجبوراً انکو منظور کرنا پڑا۔ ہر شخص کے حصے میں نوّے نوّے اونٹ آئے۔

جب اس واقعہ کی خبر حاتم کے ولی سعد کو پہنچی تو اس کے حواس جاتے رہے۔ گھبرایا ہوا حاتم کے پاس آیا، اور پوچھا کہ اونٹ کہاں ہیں؟۔ حاتم نے جواب دیا کہ دادا جان! میں نے ان اونٹوں کے ذریعے سے آپ کی گردن میں نیک نامی کا ایک ایسا طوق پہنا دیا ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ سعد نے یہ جواب سن کر قسم کھائی کہ وہ اس کے ساتھ کبھی نہیں رہیگا، اور اپنا باقیماندہ سامان لیکر، اور حاتم کو وہیں چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔

اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے حاتم کہتا ہے ؎

وانی لعف الفقر مشترك الغنی وتارك شكل لا یوافقه شكلی

شرح: عف رکا۔ شکل عادت، طبیعت، حدیث میں آیا ہے: فسالت ابی عن شکل النبی

معنی: میں یقیناً تنگ حالی میں خوددار، اور خوشحالی میں سب کا شریک ہوں۔ اور ایسی عادت کا چھوڑ دینے والا ہوں جو میری عادت سے مختلف ہے۔

واجعل مالی دون عرضی جنته لنفسی واستغنی بما کان من فضلی

شرح:- عرض، عزت، آبرو. جنہ، ڈھال. فضل، جمع، مال، پس انداز

معنی:- میں مال کو اپنی عزت کی حفاظت کے ڈھال بنا لیتا ہوں، اور مال کو جمع کرنے سے بے پروا ہو جاتا ہوں۔

وماضرنی ان سار سعد باھلہ   وافردنی فی الدار لیس معی اھلی

معنی:- اگر سعد مجھ کو گھر میں اکیلا چھوڑ گیا تو مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، میرے ساتھ بال بچے نہیں ہیں۔

سیکفی ابتناء المجد سعد بن حشرج   واحمل عنکم کل ما ضاع من نقل

معنی:- بزرگی قائم کرنے کے لئے سعد بن حشرج کافی ہے، اور جو مال ضایع ہو گیا اُس کا تاوان دینے کے لئے میں موجود ہوں۔

ولی مع بذل المال فی المجد صولتہ   اذا الحرب ابدت من نواجزھا العصل

شرح:- صولتہ، دستگاہ، قوت، نواجذ، جمع ناجذ، کچلیاں، پھاڑنے والے دانت. عصل، کجی۔

عرب لڑائی کو درندہ جانور سے استعارہ کرتے ہیں، اس لئے اُن کے محاورہ میں "حرب ابدت نواجذھا" کے یہ معنی ہیں کہ لڑائی نے اپنے دانت دکھائے؛ یعنی لڑائی شروع ہو گئی۔

اونٹ کے سامنے کے دانت عمر کے ساتھ ٹیڑھے ہوتے جاتے ہیں، اس لئے شاعر کہتا ہے کہ جب لڑائی میں امتداد زمانہ کی وجہ سے اشتداد ہو جاتا ہے۔

معنی:- مجھ میں سخاوت کے ساتھ شجاعت بھی ہے۔ جب لڑائی اپنے دانتوں کی کجی نمودار کرتی ہے؛ یعنی جب وہ شدید ہو جاتی ہے۔

ماویہ بنت عفزر حیرہ کی ایک مشہور حسین وجمیل اور صاحب مقدرت عورت تھی۔ اُس نے چاہا کہ حاتم سے تعلق پیدا کرے، مگر حاتم اس پر راضی نہ ہوا۔ اس خوف سے کہ مبادا زیادہ اصرار ہو، وہ راتوں رات حیرہ سے چل کھڑا ہوا۔ اس کے متعلق اُس نے ایک قصیدہ کہا ہے،

جس کے بعض اشعار یہ ہیں !

حننت الی الاجبال اجبال طے ‏ ‏ وحننت قلوص ان رأت سوط احمرا

شرح:۔ حسن، آرزو مند ہوا، نالہ کیا. قلوص، جوان اونٹنی.

معنی:۔ میں پہاڑوں اور خصوصاً طے کے پہاڑوں کا آرزو مند ہوا، اور میری جوان اونٹنی نے لال کوڑا دیکھکر نالہ کیا۔

وانی المزج للمطی علے الوجا ‏ ‏ وما انا من خلانک ابنتہ عفزرا

شرح:۔ لمزج، بڑھانیوالا. مطی، سواری، وجا، جانور کے پیروں کا زخمی ہونا. خلان، دوست۔

معنی:۔ میں باوجود سواری کے جانور کے تھک جانے کے اس کو آگے بڑھا رہا ہوں، اور اے عفزر کی بیٹی میں تیرا دوست نہیں ہوں.

فنادی الی جارا تھا ان حاتما ‏ ‏ ارا ہ لعمری بعد ناقد تغیرا

معنی:۔ وہ اپنی پڑوسنوں سے یہ کہتی ہے کہ میری جان کی قسم میں حاتم کو بدلا ہوا پاتی ہوں.

تغیرت انی غیرات لریبہ ‏ ‏ ولا قائل یوما لذی العرف منکرا

شرح:۔ ریبہ، شک، تہمت اور حوادث زمانہ. عرف، جوانمردی، سخاوت، اچھائی۔

معنی:۔ میں یقیناً بدل گیا ہوں بغیر کسی بُرائی کے، اور میں نے کبھی کسی اچھے آدمی کو بُرا نہیں کہا ہے.

فلا تسألبنی واسائی ای فارس ‏ ‏ اذالخیل جالت فی قنا قد تکسرا

شرح:۔ فارس، سوار، بہادر. خیل گھوڑے. جال، گیا یا آیا. قنا، نیزہ.

معنی:۔ (میرے متعلق) مجھ سے نہ پوچھ بلکہ جس سوار سے چاہے پوچھ لے. جس وقت گھوڑے ایسے معرکے میں در آئیں جہاں نیزے کثرتِ ضرب وطعن سے ٹوٹے ہوئے ہوں۔

وانی لوھاب قطوعی و نا قتی اذا ما انتشیت والکمیت المصدرا

شرح :۔ قطوع ، اونٹنیاں جو جلد دودھ دینا چھوڑ دیتی ہیں۔ مصدرا ، قوی سینہ والا یا گھوڑ دوڑ میں آگے نکل جانیوالا۔

معنی :۔ میں عمدہ اور قوی اونٹنیاں اور تیز رَو کمیت کا بڑا بخشنے والا ہوں، جب میں نشہ میں آجاتا ہوں۔

اخو الحرب ان عضت بہ الحرب عضہا وان شمرت عن ساقہا الحرب شمر

شرح :۔ اخو الحرب ، لڑائی کا بھائی یعنی جنگجو۔ عض ، کاٹا۔ شمر، دامن الٹا کے چلا، یعنی بچکر۔

معنی :۔ اگر لڑائی سر پر آپڑتی ہے تو میں جنگجو ہوجاتا ہوں، اور اگر وہ بچ کر نکل جاتی ہے تو میں بھی اُس سے اجتناب کرتا ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ اُس وقت تو حاتم ماویہ سے بچکر نکل آیا! مگر پھر اُس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر وہ ماویہ کے ساتھ نکاح کرلے تو اچھا ہے۔ اس خیال سے وہ پھر حیرہ گیا، اور اُس کا خواستگار ہوا۔ اُس زمانہ میں اُس کی خواستگاری کے لئے نابغہ اور ایک دوسرا نبیتی شخص بھی حیرہ میں وارد تھا۔ ماویہ نے تینوں کو بلاکر یہ فیصلہ کیا کہ تم لوگ اپنی اپنی قیامگاہ پہ جاکر قصیدے کہو اور اس میں اپنے نمایاں کاموں اور اپنے مناصب کا ذکر کرو۔ تم میں جو سب سے زیادہ کریم اور شاعر ثابت ہوگا اُس کے ساتھ میں نکاح کرونگی۔ اِن تینوں شخصوں نے اپنی اپنی قیامگاہ پر آکر اپنے اظہار شان اور سخاوت کے لئے اونٹ ذبح کئے۔ اور بڑے پیمانہ پر لوگوں کو کھانا کھلانے کا انتظام کیا۔ ماویہ بھیس بدلکر ان میں سے ہر ایک کی قیامگاہ پر گئی، اور اُن کی دعوتوں میں شریک ہوئی۔ بجز حاتم کے کسی شخص نے اُس کی پوری طرح خاطرداری اور تواضع نہیں کی۔ دوسرے دن یہ تینوں اپنی اپنی نظمیں لے کر پہنچے، ماویہ نے پہلے اُن کے قصیدے سُنے، بعدہٗ ان کو کھانا کھلایا۔ کھانے میں یہ التزام کیا تھا کہ اونٹ کا جو حصہ جس کے یہاں سے اُس کو دیا گیا تھا وہی حصہ اُس نے اُن کے سامنے رکھوادیا۔ یہی نبیتی اور نابغہ کے شرمندہ کردینے کے لئے کافی تھا۔

ماویہ نے جو فیصلہ سنایا وہ یہ تھا کہ حاتم تم دونوں سے زیادہ کریم اور بہتر شاعر ہے. یہ دونوں تو رخصت ہوئے، اور حاتم سے یہ چاہا گیا کہ وہ اپنی موجودہ بیوی کو طلاق دیدے. حاتم نے اس سے قطعاً انکار کیا. ماویہ بغیر اس شرط کی تکمیل کے نکاح پر راضی نہ ہوئی. غرض کہ نکاح کا معاملہ تو درہم برہم ہو گیا، مگر ماویہ نے حاتم کو زادِ راہ دے کر بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا. گھر پہنچ کر حاتم کو پھر ماویہ کی یاد ستانے لگی. اس اثنا میں اتفاق سے اس کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا. حاتم نے پھر اس کی خواستگاری کی اور ماویہ کے ساتھ اس کا نکاح ہو گیا۔

حاتم نے مقابلۂ متذکرہ بالا میں جو قصیدہ پڑھا تھا وہ اس کے کلام کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے. اس کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں؛ جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ بدوی عرب کے خیالات سخاوت وغیرہ کی نسبت کیا تھے؛

اماوی قد طال التجنب والهجر ‌ ‌ ‌ ‌ وقد عذرتني في طلابكم العذر

شرح:- آ، حرفِ سوال ومخاطبہ ہے. ماوی، ماویہ ہے. عرب عام طور سے شعر میں نام کا آخر حرف ساقط کر دینا جائز سمجھتے ہیں؛ مثلاً بجائے مالک کے صرف مال کہتے ہیں. تجنب، علحدگی، فراق. طلاب، طلب۔

معنی:- اے ماویہ! فراق اور ہجر نے طول کھینچا، اور تمھاری طلب میں اکثر موانع پیش آتے رہے.

اماوی ان المال غاد ورائح ‌ ‌ ‌ ‌ ويبقى من المال الاحاديث والذكر

معنی:- اے ماویہ! مال آنے جانے والی چیز ہے، اور مال کا صرف تذکرہ رہجاتا ہے.

اماوی انی لا اقول لسائل ‌ ‌ ‌ ‌ اذا جاء يوما حل في مالنا النذر

معنی:- اے ماویہ! اگر میرے پاس کبھی کوئی سائل آجاتا ہے تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا مال فلاں کام کی نذر کی ایفا کے لئے محفوظ ہے، اور میں اس کو نہیں دے سکتا.

اماوی إما مانع فمبين ‌ ‌ ‌ ‌ واما عطاء لا ينهنهه الزجر

شرح :- ، روکنا ، جھڑکنا.

معنی :- اے ماویہ ! (میں) یا تو صاف جواب دیدیتا ہوں ، یا (سائل کو) اس طرح دیتا ہوں کہ اس میں جھڑکی نہیں ہوتی.

اماوی ما یغنی الثراء عن الفتی اذا حشرجت یوما وضاق بها الصدر

شرح :- الثرا ، ثروت ، دولت ، حشرجته ، گلے میں جان کا پھنسنا.

معنی :- اے ماویہ ! دولتِ انسان کو اس وقت سے نہیں بچا سکتی ، جبکہ اس کی جان گلے میں اٹکی ہو ، اور اس کی وجہ سے وہ تنگ دل ہو.

فانی لاالو بمالی صنیعۃ فاوله زاد وآخره ذخر

شرح :- الو ، تقصیر کی ، صنیعۃ ، کام.

معنی :- میں اپنے مال سے ایسا کام کرنا نہیں چھوڑتا ، جس کا اوّل توشۂ دنیا اور آخر توشۂ آخرت ہو.

فما زادنا بغیا علی ذی قرابته غنانا ولا ازری باحسابنا الفقر

معنی :- ہماری دولت مندی نے ہم کو اہلِ قرابت سے سرکش نہیں کردیا ، اور نہ ہمارا فقر ہماری عزت کو بگاڑ سکا.

بعینی عن جارات قومی غفلة وفی السمع منی عن حدیثهم وقر

معنی :- میں اپنی قوم کی پڑوسنوں کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا ، اور پڑوسنوں کی بُرائی سننے سے میرے کان بہرے ہیں۔

وقد علم الاقوام لو ان حاتما اراد ثراء المال کان له وفر

معنی :- لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر حاتم مال جمع کرنا چاہتا تو بہت مال جمع کرلیتا.

حاتم کی سخاوت کے بیسیوں قصّے ہیں ، جن کی گنجائش اس جگہ نہیں نکل سکتی ۔ ماویہ کے بطن سے حاتم کا ایک لڑکا عدی اور ایک لڑکی سفانہ زیادہ تر مشہور ہیں ، کیونکہ ان دونوں نے حضرت رسولِ خدا کا زمانہ پایا ، اور دونوں مشرف باسلام ہوئے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت

علی کرم اللہ وجہہ نے ایک مجمع میں فرمایا کہ " اکثر لوگ کارِ خیر سے پہلوتہی کرتے ہیں، مجھکو اُن لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جن کے پاس اُن کا کوئی بھائی ایک حاجت لیکر آتا ہے، اور وہ اِس کو رفع کرسکتے ہیں، اور نہیں کرتے۔ اگر ہم جنت دوزخ اور عذاب ثواب سے قطع نظر بھی کرلیں تب بھی ہم کو مکارمِ اخلاق کا خیال ہونا چاہیے، کیونکہ وہ نجات کا راستہ ہے۔"
اِس کو سُن کر مجمع میں سے ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا، اور اُس نے عرض کیا کہ اے امیرالمومنین اگر اجازت ہو تو میں اِس بارہ میں جو کچھ میں نے حضرت رسول اللہ سے سُنا ہے وہ عرض کروں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے کیا بہتر ہے، ضرور سناؤ۔ اُس شخص نے کہا کہ جب قبیلۂ طے کے لوگ گرفتار ہوکر آئے تو اُن میں ایک لڑکی نہایت حسین وجمیل تھی۔ میں اُس کو دیکھ کر فریفتہ ہوگیا، اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ جب غنیمت تقسیم ہونے لگے گی تو میں حضرت سے عرض کرکے اس کو اپنے حصہ میں لے لوں گا۔ میں یہ خیال کرہی رہا تھا کہ اُس لڑکی نے حضرت رسولُ اللہ کو مخاطب کرکے نہایت فصیح وبلیغ الفاظ میں عرض کیا کہ " اے محمد! میں ایک یتیم لڑکی ہوں۔ اگر آپ کو یہ مناسب معلوم ہو تو مجھے چھوڑ دیں، کیونکہ میں ایک سردارِ قوم کی لڑکی ہوں۔ میرا باپ حاجتمندوں کی حاجت روائی، اپنی قوم کی حمایت، مہمانوں کی خاطرداری غمزدوں کی غمگساری کرتا تھا، اور اِس نے کبھی کسی کا سوال رد نہیں کیا؛ یعنی میں حاتم کی بیٹی ہوں۔" حضرت رسولِ خدا نے ارشاد فرمایا کہ " اے لڑکی! یہ مومن کے اوصاف ہیں، اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لئے ضرور طلبِ مغفرت کرتے۔" اور اپنے اصحاب کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ " اِس کو چھوڑ دو، کیونکہ اس کا باپ مکارمِ اخلاق کو پسند کرتا تھا، اور اللہ بھی اس کو پسند کرتا ہے۔" اِس حکایت کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بھی بوستاں میں نقل کیا ہے۔

عدی حاتم کا لڑکا بھی مسلمان ہوگیا تھا۔ اور ایک عرصہ تک حضرت رسالت پناہ کی صحبت میں رہا۔

ابن اعرابی لکھتے ہیں کہ حاتم کا شمار عرب کے شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ بڑا سخی تھا۔ اس کا کلام اس کی سخاوت کے مشابہ اور اس کا فعل اس کے قول کا موئید ہوتا تھا اور جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا اُس میں کامیاب ہوتا تھا۔

ضعیفہ

از جناب مولوی شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی

اک ضعیفہ راستے میں سو رہی ہے خاک پر
مُردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غمناک پر
اور کس موسم میں؟ جب طاعون ہے پھیلا ہوا
ذرّہ ذرّہ ہے وبا کے خوف سے سمٹا ہوا
رات آدھی آچکی ہے، بام و در خاموش ہیں
اہلِ دولت بسترِ راحت سے ہم آغوش ہیں

گوشہ گوشہ شہر کا اک مرکزِ آفات ہے
کانپتی ہے روح، اُف کیسی بھیانک رات ہے!

آہ اے بیکس ضعیفہ! غم کی تڑپائی ہوئی
وائے اے مظلوم! اے دنیا کی ٹھکرائی ہوئی
تو کہاں کی رہنے والی ہے، ترا کیا نام ہے؟
سچ بتا تو آہ کس آغاز کا انجام ہے؟
تیرے بچے، تیرے گردوں کے ستارے کیا ہوئے؟
اے ضعیفہ! تیری پیری کے سہارے کیا ہوئے؟
آہ! ارمانوں کی کیسی پائمالی ہو گئی
ٹھوکریں کھانے کو تیری گود خالی ہو گئی
تیرا وارث سو رہا ہے کس جگہ اوڑھے کفن؟
دفن ہے کس قبر میں تیرا عروسی بانکپن!
حرزِ جاں ہوگا کبھی شوہر کو نظارہ ترا
آج فرشِ خاک ہے افسوس! گہوارہ ترا
رہگزر میں تو پڑی ہے آہ! کس انداز سے
تجھ کو پالا ہوگا تیری ماں نے کس کس ناز سے
یاس کی تاثیر کیوں چہرہ پہ دُونی ہو گئی
مائکا ویراں ہوا، سسرال سُونی ہو گئی

ہند میں انسانیت کا درد بھی باقی نہیں!
ملک میں کیا تیرے اب اک دھی باقی نہیں؟

تیری ہستی اک سزا ہے ملک و ملت کیلئے
تو ہے اک دھبہ جبینِ اہلِ دولت کے لئے
تو ہے اک تذلیل ادیان و ملل کے واسطے
طوق ہے لعنت کا اربابِ دوَل کے واسطے

"سخت حیراں ہوں کہ تجھ کو دیکھ کر زار و نزار کیوں زمیں میں گڑ نہیں جاتے حیا سے مالدار
پڑ نہیں جاتے الہی! سینۂ دولت میں داغ
بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ

اپنی تابِ زر سے اے دولت پناہو! ہوشیار اپنے تاجوں کی چمک سے بادشاہو! ہوشیار
خوابِ سفاکی سے اے غفلت شعارو! چونک اٹھو اے ہلاکت آفریں سرمایہ دارو! چونک اٹھو
ظالمو! تیار ہو جاؤ سزا کے واسطے قوم کا افلاس اٹھا ہے بد دعا کے واسطے
گوہر و یاقوت سے شعلے بھڑک اٹھنے کو ہیں سُرخ دیناروں میں انگارے دہک اٹھنے کو ہیں
فرشِ گل والو! زمیں پر لوگ محوِ خواب ہیں خرمنوں کے پاسبانو! بجلیاں بیتاب ہیں
جلد اٹھو امداد کی شمعیں جلانے کے لئے
قہرِ حق بیچین ہے جنبش میں آنے کے لئے

لطیفہ مسٹر سید عسکری حسن اور مسٹر سید یوسف حسن تعلیم کی غرض سے ولایت جانے لگے، تو اس خیال سے کہ ہندوستانی نقطۂ نظر سے وہاں انسان کو ترک لذات کرنا پڑتا ہے، اول الذکر نے گھر کے باورچیخانہ میں آنا جانا شروع کیا، اور تھوڑے دنوں میں وہاں کے سارے بھید بھاؤ سے واقف ہو گئے۔ ولایت پہنچے تو ایک باورچن رکھی، اور اُسے بھی اپنے ڈھب کا بنالیا۔ ہندی دوستوں کو بھی اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے فرمائش شروع کردی۔ عسکری کو کمال دکھانے کا موقع اچھا تھا انھوں نے فرمائشوں کو قبول کرلیا۔ آنے اور کھانے والوں کے سب نام تو یاد نہیں، سنتے ہیں کہ اس موقع پر ان دو بھائیوں کے سوا مسٹر احمد کمال، مسٹر نظام الدین، مسٹر وحید الدین حیدر، مسٹر حمید حسین اور شاید مسٹر ہارون خاں شروانی موجود تھے۔ میزبان نے تمام ہانڈیوں میں مال مسالہ ڈال کر چولھے پر چڑھادیا۔ باورچن نے یہ خیال کرکے کہ سالن میں مرچیں نہیں ڈالی ہونگی مٹھی بھر ڈالدیں اور خود ہاتھ دھونے باہر چلی گئی۔ مکاندارنی بڑی بی نے بھی اس لحاظ سے کہ کالا لوگ مرچیں بہت کھاتا ہے، خود بھی اپنی بہت سی مہربانیوں میں ایک کا اضافہ فرمادیا۔ اب سالن سہ آتشہ ہوچکا تھا مگر کھانیوالے پلیٹ صاف کرکے اُٹھے

خوابِ پریشاں

از جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب بی۔ اے

کل آتشکدۂ شاہ پور کا مُغ، اردبیل کے پہاڑوں سے اُتر کر عالمِ رویا میں میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ" اے پُرانی جنس کے پرکھنے والے، تجھ کو کچھ خبر ہے، کہ اقلیم ہند کا وہ فلسفی کیا ہوا، جس کو ربّ الشمس ابولوس کے مندر سے، یونان کی دیبیوں نے اس بھارت ورش میں بھیجا تھا، کہ تزکیہ نفس و ریاضت علمیہ میں مصروف ہو، حتی کہ اپنے کالبد خاکی کو مومیائی میں تبدیل کر کے، مصر قدیمہ کے کسی تنگ و تاریک تہ خانے میں بطور یادگار محفوظ کر جائے۔

اب سُن کہ ایک رات، پچھلے پہرے، جبکہ آتشکدہ اردبیل سے، شعلہ زردشت، ہر دشت وجبل میں دور دور تک دیا پیدا تھا، میں تجلی خالق کا مظہر بنکر، اہرمن کے طبقۂ ظلمت میں، نور کے ذرے اڑاتا لبنان کے پہاڑوں کی طرف چلا، اور جب ان کی ایک شاداب وادی سے گذرا تو دیکھا کہ صبح کاذب کی ہلکی ہلکی روشنی میں، بیت اللحم کے ایک نجّار اور ایلیا کے چند لکڑہارے، لبنان کے اشجار کہن سال کو، جن کی ٹھنڈی چھاؤں میں، دایناد یبی کے آہوانِ سیہ چشم، ہری ہری دوب چرا کرتے تھے، تیشہ و تبر سے کاٹتے ہیں۔

اتنے میں آفتاب کہ خالق لیل ونہار ہے، افقِ مشرق سے بلند ہوکر، کوہسار پر چمکا، اور میں نے دیکھا، کہ قریب ہی درختوں کے جھرمٹ میں، یونان کا مشہور حکیم اور صناع ارشمیدس نامی، کہ جزیرہ صقلیہ میں دفن تھا، اپنی لحد چھوڑ کر ہاتھ میں برم اور شاقول لئے، فکر مند کھڑا ہے اور حکیم اقلیدس رود نیل کا مشہور مسّاح مسطر د پرکار لئے، ارشمیدس سے کچھ باتیں کرتا ہے۔
چشم بصیرت حیرت زدہ تھی، کہ ایلیا کے لکڑہارے، لبنان میں کیوں درختوں کو گراتے ہیں، اور بیت اللحم کے نجار کیوں شہتیر و تختے تیار کرتے ہیں۔ اقلیدس وارشمیدس صنعت میں مصروف ہیں

اور میں حیران ہوں کہ وہ کون سے اعمال ریاضیہ ہیں، جو اس وقت، اِن اساتذۂ سلف سے اجرا پاتے ہیں۔ اِس تجسس سے عہدہ برآ ہوا تھا، کہ درختوں کی اوٹ سے، ایک تیر کے فاصلے پر، ارضِ عمون سے، بیر سبع کے چرواہے، کہ حبرا کی وادی میں، اسحاق کے چرواہوں سے، تکرار کر چکے تھے، شاعر اومیرس کے مینڈھے کو، کہ سنہری اُون رکھتا تھا لئے آتے ہیں اور سُن! کہ بیت اللحم کے نجار نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیا، اور ایلیا کے لکڑہاروں نے، بیر سبع کے چرواہوں کو، دیکھ کر نعرے بلند کئے، اور ان کے نعرے، لبنان کی گھاٹیوں میں گونج اُٹھے اور بیر سبع کے چرواہے ایلیا والوں کے پاس پہنچے۔

اور اب درختوں کے جھرمٹ میں، ارشمیدس، صقلیہ کے مدفون نے جیبِ کفن سے مقراض نکالی، اور اقلیدس نے میش اومیرس کی پشت سے اُون کاٹی، اور جب اندوختہ کافی ہوا، تو سب نے مل کر ایک رسی بٹی، اور اتنے میں شامیوں نے ایک تختہ تیار کیا، کہ "ہمشکل اسطرلاب تھا، مگر فعل اُس کا عملِ اسطرلاب سے فرق رکھتا تھا" یہ کام ختم ہوئے ہی تھے، کہ مشرق کے بندرگاہوں سے، کلدانی ملاحوں کا ایک گروہ آیا، اور سب نے تختہ اُٹھا کر سر پر رکھا، اور ساحلِ شام کی طرف چلے، جبکہ صقلیہ کا ارشمیدس، مصر قدیمہ کا اقلیدس، بیت اللحم کے نجار، اور ایلیا کے لکڑہارے، اومیرس کا مینڈھا، اور بیر سبع کے چرواہے پیچھے پیچھے ہو لئے اور بہت سی منزلیں طے کرکے، یہ صیدون میں پہنچے کہ لبِ بحر واقع تھا۔ یہاں کلدانیوں کا جہاز تھا کہ ارغوصہ کے لئے مال بھر چکا تھا۔ اِس جہاز پر یہ سب مع سامان کے سوار ہوئے۔

شبِ تار نے ارض و سما پر ظلمت شایع کی تھی؛ "برج عقرب سنبلہ سے حدِ شرق میں آئیں دقیقے خارج ہوا تھا، اور زحل کا اقتران عطارد سے مرتبۂ کمال کو نہ پہنچا تھا، کہ ناخدا نے لنگر اُٹھایا۔ ارشمیدس، جو خشکی کے سفر سے پہلے ہی خستہ ہو چکا تھا، سو گیا۔ اقلیدس فکرِ مساحت میں اختر شمار ہوا۔ بیت اللحم کے نجار کی آنکھ بھی لگ گئی۔ اومیرس کا مینڈھا، اومیرس کے کلام پہ جگالی کرتا ہے تاریک موجوں پر چمکتے تاروں کا عکس ہے۔ بحر یونان سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے ہیں، اور کشتی مگسِ نیم جاں کی طرح سیاہی میں پڑی، اپنے خفیف پروں کی حرکت سے

شناورِ ظلمت ہے،

اے شخص! تو حیرت کریگا کہ میں اُس منظرِ عجیبہ کا جو پیش آنیوالا تھا کس عنوان تماشائی ہُوا بُسن کہ وادیٔ لبنان سے، جب یہ قافلہ ساحلِ شام پر پہنچا تو زمین پر تاریکی تھی اور فلک اربابِ ضیا کی جلوہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میں، کہ پرستندۂ نور ہوں "برجِ جدی" میں پہنچا اور ایک نجم کی شعاع پر سوار ہو کر جہاز کے ساتھ ساتھ ارغوصہ کو چلدیا۔

صبح کا ستارہ کہ نقیبِ آفتاب ہے طلوع ہو کر افق پر قدرے مرتفع ہوا تھا کہ "شعلۂ اعظم" کی ضیا نے مشرق سے اُٹھ کر، اس کے نورِ مستعار کا خاتمہ کر دیا۔ اور کلدانی جہاز، یونان کے پانی میں ارغوصہ کے سامنے لنگر انداز ہوا، اور ارغوصہ کے شہر والوں نے جوق جوق اُس کا تماشا کیا۔

اے نشیمن رویا کے عزلت گزیں مطلع ہو کہ دوسرے ہی دن رودِ نیل کے دہانے سے چلا ہوا ایک سفینہ ارغوصہ میں پہنچا، اس سفینہ میں وہ قافلہ تھا جو سرزمینِ ہند سے چلکر عمان و عرب و احمر کے سمندروں کو طے کرکے خشک و تر راستوں اور بیابانوں سے مصرِ قدیم کے شہر ثیبس میں آیا تھا اور یہاں سے رودِ نیل کے ذریعہ ساحلِ بحر پر پہنچکر ارغوصہ کو اُس نے جہاز لیا تھا، اسی سفینہ میں مشرق کا وہ حکیم، فلسفۂ باطل کا متوالا "شایق اسطرلاب"۔ "مصنف ارمغان" ہے جس کو ربّ الشمس کی دیبیوں نے، اقلیمِ ہند میں اس غرض سے بھیجا تھا کہ اساتذہ یونان کے علوم و فنون کی ترویج میں جاں بحق سپرد کرے، اور بعد الموت اس کے اجزائے باقیہ کی مومیائی تیار ہو کر مصر کے کسی ظلمت کدے میں بطور یادگار رکھی جائے، مگر اب ان ہی دیبیوں نے اُس پر طرح طرح کے الزام عاید کرکے بعوض پاداش اس کو بیت الحکمت اثینہ میں طلب کرالیا ہے۔

یونانِ قدیمہ کا دار الحکومت ایک فرسنگ پر ہے اور حصار اثینہ کی بلند عمارتیں نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ بُت خانہ ابولوس کے سامنے جس کو زمانہ نے، شرفِ قدامت، اور عناصر نے خلعتِ بوسیدگی دیا ہے، یونانِ قدیمہ کے ہر زمانہ، اور عہد کے باکمال اپنی اپنی قبروں سے

اکٹھا ہوئے ہیں، عوام الناس بھی ہیں، لیکن حکما کا طبقہ علیحدہ ہے۔ باہمی سرگوشیاں ہو رہی ہیں، تھالیس حکیم اپنے یونس اناکساغورس کے افکار حکمیہ پر معترض ہے، دیوجانس کہ ایانونیہ کا باشندہ ہے۔ ہرقلاطیس سے مجادلہ کرتا ہے کہ نار اور صرف نار، وہ ذات ہے جس میں صفات باری پوشیدہ ہیں، پھر عدد جوہر بالذات کیسے ہو؟ سقراط برہنہ سر کمبل کی کفنی گلے میں، ننگے پاؤں ایکطرف کھڑا ہے۔ جوانان اتھینہ علم و حسن کے بتکدے میں نذریں چڑھانیوالے، استاد کے گرد حلقہ کئے ہیں، مگر حکیم کی روح سے سب حواس باختہ ہیں۔ فلاطون بھی موجود ہے، مگر ارسطو کی طرف نگاہ غضب رکھتا ہے۔ ارسطو بھی استاد سے دل میں شرمندہ ہے، اور دفع الوقتی کے لئے بر قلس سے اسکندر مقدونی کا ذکر چھیڑتا ہے۔ بطلیموس اور جالینوس ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑے ہیں، مگر ہر دل پر تقشہ ہے، کہ اتنے میں ارشمیدس کو دیکھتے ہی اکثر اہل کمال تعظیم کو بڑھے۔ سرگوشیاں بند ہوئیں، اور سب کے بشرے سے انتظار کی بے چینی ظاہر ہونے لگی، کہ دور سے ایک غبار نظر آیا۔ دیکھا تو شہر کے دروازوں سے ایک گروہ آتا ہے جس میں سب کے آگے اسپارٹہ کے سپاہی زرہ بکتر لگائے، خود پہنے، مغفر نیچے کئے، ہاتھوں میں برچھے تولے، ایک عجیب الخلقت ذی حیات" کو حراست میں لاتے ہیں اور پیچھے پیچھے بیت اللحم کے نجار ہیں، کہ تیشہ و تبر دوش پر ہے، اور کلدانی ملاحوں کے ساتھ ایلیا کے لکڑہارے ہیں کہ کندھوں پر تختہ اٹھائے ہیں اور ان کے پیچھے بیرسبع کے چرواہے ہیں کہ اومیرس شاعر کے مینڈھے کو، رسی میں باندھے لاتے ہیں۔ یہ کل گروہ اس شان سے بت خانہ اپولوس کے سامنے پہنچا۔

بیت اللحم کے نجار نے، کلدانیوں کی مدد سے، شہتیر نصب کر کے تختہ کھڑا کیا، اور بیرسبع کے چرواہوں نے، اومیرس کی روح سے اجازت لیکر شہتیر میں رسی باندھی؛ ایلیا کے کاریگروں نے تختہ کے ایک طرف سیڑھی لگائی؛

یہ "جر ثقیل" ختم نہوا تھا کہ بت خانے کے سامنے ویرانوں میں، یونان کے سب باکمال اپنے اپنے پوستین پہنکر، پتھروں پر ہو بیٹھے، اور فوراً ایک مجلس شوریٰ بہ اختیارات عدالت قائم کی؛ متقدمین کی خودداری نے اُن کو معذور رکھا، اس لئے ارسطاطالیس حکیم صدر انجمن قرار پایا!

برقلس نے کہ بزمیہ محاسن کے ساتھ رزمیہ اوصاف بھی رکھتا تھا، "فیلسوف ہندی" کو حراست سے علیحدہ کر کے مجلس کے سامنے پیش کیا۔ صدر انجمن اور حاضرین کے متوجہ ہوتے ہی ارسطوقوس حکیم اپنے پتھر پر سے اٹھا اور بابیرس کا قرطاس جیب سے نکال کر اُن تمام الزامات متعلق بہ تخریب علوم قدیمہ کو پڑھکر سنایا، جن کی پاداش کے لئے یہ حکیم ہندی آج اساتذہ یونان کے دربار میں حاضر لایا گیا تھا۔ اے واہمہ کے بے جان پتلے اگر تو اُن الزاموں کا علم سامعہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے تو ذرا حکیم ارسطوقوس کی تقریر سُن۔

ارسطوقوس۔ اے اراکین مجلس شوری! اور اے اکابر داعیان دولت فلسفہ! آج میں علما وفصحاد اغریقی اور ان کے مخترع علوم وفنون کی جانب سے وکیل ہوکر، اس مجلس عدالت میں وہ شکایات پیش کرتا ہوں، جنہوں نے ہماری ہزارہا برس کی نیندیں اُچاٹ کردی ہیں، ہمارے علوم وفنون کے ساتھ جن کو ہم نے مثل اپنی اولاد کے اس دنیا میں چھوڑا تھا، یہ حکیم باوجود خاص ہدایات کے، نہایت غفلت اور ناقدردانی سے پیش آیا، حتیٰ کہ صبر وتحمل ہم سے رخصت ہوا، اور اس کے تدارک کے لئے، ہم سب، کو آج یک لخت اپنی اپنی لحد سے اُٹھنا پڑا۔ وہ حکما اس مجلس میں موجود ہیں، جن کو خاص طور پر اس حکیم ہندی سے شکایات ہیں۔ اولاً حکمائے اقلیدس ارشمیدس بطلیموس وجالینوس ہیں، جو علوم ہندسہ، ہیئت، طبیعیات وطب کے حامی وشفیع بنکر اس مجلس سے دادرسی کے خواستگار ہیں۔ ثانیاً فلسفیان متقدمین سے ثالیس حکیم مع انا ثیمانوس، سرقلطیس انا سیفورس سائل ہیں، کہ الہیات۔ فلسفہ۔ منطق۔ اور ادب پر جس طریقہ سے اس ہندی حکیم نے دست تطاول دراز کیا ہے، اُس کی مکافات ہو۔ ثالثاً ارسطاطالیس صدر انجمن خود مستغیث ہوکر اپنے افکار طبعزاد مثلاً ریطوریقا۔ بوطیقا اور رفاطیموریاس کی طرف سے فریادی ہے۔ رابعاً حکیم فیثاغورس فضائے عالم کا بین کار، آسمانوں کا سرنگیا فن موسیقی کی بے قدری کا شاکی ہے کہ نغمہ افلاک سے یہ حکیم کبھی متاثر نہ ہوا، بلکہ عمداً اس سے متنفر رہا۔ اور اومیرس صبح آفرینش کا شاعر کمال فن شعر کی طرف سے فغاں برلب ہے کہ اس فلسفی سے اسلوب کلام کی کبھی داد نہ ملی۔ آخر میں خطۂ یونان کے کاملین فن بت تراشی حاضر ہیں، جن کی صنعتوں میں بتوں کے حسن ظاہر کے ساتھ

ان کا حسنِ باطن بھی مجروح نظر آتا ہے، اُن کو شکایت ہے کہ اس حکیم نے اپنی شکل اور ترکیبِ اعضا میں عمداً اس کثرت سے ذمائم پیدا کر لئے ہیں کہ ہماری چشمِ حسن بیں میں وہ ایک خار بن گیا ہے بالخصوص اس کی ریش مخروطی کو ملاحظہ کیجیے، کہ زنخداں سے خارج ہوتے ہی ایک بدنما زاویہ اختیار کر کے دہن کے محاذات میں ایک ایسا قوس معکوس پیدا کرتی ہے جو قطعاً قواعدِ حسن کا منافی ہے، نیز حواس خمسہ کے لئے جو اعضاء متناسب کا پورا پورا لحاظ کر کے، اس کے کاسہ سر میں نصب کئے گئے تھے، اُن کو بھی کثرتِ استعمالِ ادویۂ خود ساختہ سے بے کار و مضمحل و بدنما کر لیا، اور آئینِ خود آرائی کا مطلق پابند نہ رہا۔

پس میں ارسطو توس حکیم جملہ اربابِ حکمت کی طرف سے جن میں متقدمین و متوسطین و متاخرین سب ہی شامل ہیں، اس دربارِ عالی وقار میں، کہ محلِ عدالت ہے مستدعی ہوں، کہ اس مخربِ علوم و فنونِ قدیمہ کا، اس مرتبہ اور عزت کے شایاں جس کا مستحق ہمارا ایک حریفِ مقابل ہوسکتا ہے کوئی تدارک فوراً کیا جائے اور چونکہ اس کے جرائم علیہ کی نسبت، بت خانہ ولقائی کی کاہنہ نے ثبوت سے پہلے ہی سزا تجویز کر کے اہلِ حکمت کے قلوب کو روشن کر رکھا ہے اس لئے تصریح الزامات بغرضِ ثبوت غیر ضروری ہے۔ محض حکمِ سزا کافی ہے اور تجویزِ سزا میں ایسے حکمائے یونان اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ہند کا یہ مصنوعی فلسفی، بہزار آفات بری و بحری و مصائب ارضی و سماوی گرفتار ہو کر اس دربارِ عالم میں جہاں قلم و حکمت کے رؤسا، عظام رونقِ بزمِ عدل ہیں حاضر کیا گیا ہے؛ تاکہ اپنی ہستی ناپائدار کی صفاتِ متنوعہ و شیونِ مختلفہ میں جو جو شدائد اس سے عمل میں آئے ہیں اور سوفسطایانِ ننگ نوش کی صحبت سے متاثر ہو کر علم و حکمت کے شیشۂ ناب میں زندقہ اور الحاد کی افیون جس جس طریقہ سے اس نے گھولی ہے اس کی سزا کو وہ پہنچے، اور آخر الامر اس کے جسد خاکی پر جس کا وہ مالک ہو عذاب حادث کیا جائے۔"

ارسطو توس اس قدر تقریر کر کے بیٹھ گیا، کسی حکیم پر اس کی جادو بیانی کا مطلق اثر نہ ہوا، لیکن مشورہ کے لئے اپولوس کے بت خانے میں سب کے سب چلے گئے اور مشورہ کے بعد باہر آکر اپنے اپنے پتھروں پر ہو بیٹھے مجمع عوام میں، جب کسی قدر خاموشی ہوئی تو صدرِ انجمن ارسطا طالیس اپنے اونچے پتھر سے

اٹھا اور بولا !

ارسطوقوس اور اے حکمتِ یونان کے دو او پرستر حکیمو ! اِس مقدمہ میں متقدمین و متاخرین دونوں نے باہمی مشورہ کرکے، بذریعۂ اناثیغورس حکیم اپنے فیصلے سے مجھے آگاہ کیا ہے، اور میں مجبور ہوں کہ اس ہندی حکیم کے حق میں وہ تجویز سناؤں، باطن میں جس کا علم پہلے سے موجود ہے لیکن ارسطوقوس نے خاتمۂ تقریر پر حکمائے یونان کی طرف سے استدعا کی ہے کہ مجرم کے کالبدِ خاکی پر، جس کا وہ مالک ہو عذاب حادث کیا جائے۔ اس کو ہم منظور کرتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کی روح پر بھی ایک جوہرِ پاک اس ہستی کا ہے اور جس کی ماہیت پر ہم قادر نہیں ہیں، ایسا ہی کوئی عمل ہو۔ پس حکمِ آخر یہ ہے کہ اس حکیم مجرم کو جس کو ارسطوقوس نے بعض موقعوں پر ہندی فیلسوف بھی کہا ہے، اُس تختہ کے ذریعہ سے جس کو ایلیا والوں نے، اور بیت اللحم کے نجار نے جبل لبنان کے اشجار سے تیار کیا ہے، اور بہ سبیل اُس رسن کے جس کو بیر سبع کے چرواہوں نے میش اومیرس کی سنہری اُون سے بٹا ہے، طبقۂ فنا میں معلق کردیا جائے، اور اسی طرح معلق رہے؛ تا آنکہ اس کا جسم روح سے پاک ہو، اور آخر میں میں ارسطاطالیس جملہ صدر نشینانِ بزمِ حکمت کی حضور میں بعوض اُس حقِ خدمت کے جو صدرِ انجمن ہونے کی وجہ سے مجھکو ملنے والا ہے، ملتمس ہوں کہ اس حکیم ہندی کی روح کو، جب وہ قیدِ عناصر سے آزاد ہو، حکیم افلاطون اپنے مخترع عالمِ امثال میں لے جائے تاکہ کچھ زمانے کے لئے اس کو سکون اور ہم کو چین ہو اور وہ جلد کسی قالب ہیب کو اختیار نہ کرسکے۔ اور نیز اساتذہ متقدمین سے، درخواست ہے کہ عناصر اربعہ سے جو عنصر اس حکیم مجرم کا علت العلل ہو، اُس میں اِس حکیم کے اجزائے فانی جذب کرلئے جائیں؛

ارسطاطالیس کا فیصلہ منظور ہُوا۔ اثینہ کے تماشائیوں کا ہجوم اور زیادہ ہوگیا، اور دو تین کلبی جلادی کے لئے خُمِ حکمت سر پر رکھے، کتے کی رسّی کمر میں باندھے آیا، اور تختہ کی طرف گیا؛ او اے عالمِ رویا کے تماشائی سمجھ لے کہ پھر وہ ہی ہوا، جس کو ربّ الشمس کی دیویوں نے چاہا تھا، او سرزمین ہند کا فلسفی طبقۂ فنا میں معلق کردیا گیا، اور حکیم افلاطون اس کی روح کو عالمِ امثال میں لے گیا۔ لیکن عناصر نے اس کے کل اجزائے فانی کو قبول نہ کیا اور حکیم کی مومیائی نعش کے

ایک بت خانہ میں دنیا کی یادگار رہی۔

اور پھر سب دیسی بدیسی اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ ارشمیدس صقلیہ پہنچکر اپنی لحد مستطیل میں جا سویا۔ اقلیدس ساحل نیل پر روپوش ہوا۔ یونان والے اپنے اپنے ویرانوں میں جا چھپے۔ کلدانی اپنا جہاز اثینہ سے لیکر شام کے بندرگاہوں میں آئے۔ پھر معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ بیت اللحم کا نجار بیت اللحم کو، اور ایلیا کے لکڑ ہارے ایلیا کو گئے۔ ادہیرس کا مینڈھا جرجان کے پہاڑوں میں چھوٹ گیا۔ بیرسبع کے چرواہے جرار کی وادی میں گلے چرانے لگے۔ اور میں آتشکدہ شاپور کا نبع اردبیل کے پہاڑوں کو واپس آیا۔ پس جو کچھ تو نے سنا اس پر حیرت کر اور اس خواب پریشاں سے بیدار ہو۔ (۱۸۹۴ء)

———(✤)———

نوائے ترمذی

از جناب مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی

ہزار ہو بادیہ نوردی، نہ ہوگا راز آشکار اپنا
جنوں کے لطف و کرم ہیں ایسے، رہیگا وہ پردہ دار اپنا

چنے ہیں گلچیں نے پھول ایسے، چمن میں اب خاک اڑ رہی ہے
خدا نہ دکھلائے یوں کسی کو، جہاں میں لٹتے دیار اپنا

عبث ہے شکوہ تو اپنے تجھکو، گلہ ہے تیرا فلک سے بیجا
کیا ہے ہاتھوں سے دفن تو نے، جہاں میں سارا وقار اپنا

میں کس مپرسی کے دور میں ہوں، مثالِ ذراتِ خاکِ پامال ہوں
کبھی تو چمکیگا مہر بن کر، جہاں میں یہ انکسار اپنا

بسیط دریا ہے، دور ساحل، بپا ہے موجوں کا ایک طوفاں
شکستہ کشتی ہے، رات اندھیری، نہ کوئی یاور نہ یار اپنا

ہے پتہ پتہ میں رنگ اسکا، عیاں گلوں میں اسی کا جلوہ
چمن میں چھن چھن کے حسنِ فطرت، دکھا رہا ہے نکھار اپنا

برہنہ پائی میں لطف باقی، نہ سینہ چاکی میں کچھ مزہ ہے
نکل اب اس دشت سے جنوں پھر، بنا نیا خارزار اپنا

مئے کہن پھر پلا دے ساقی! دکھا دے پھر جلوۂ مئے اصفی
پرانی تانوں کو چھیڑ مطرب، کہ پھر نہ ٹوٹے خمار اپنا

نہ شیفتہ ہوں صنم کدہ کا، نہ ہوں پرستارِ خاکِ کعبہ
ملی ازل میں تھی مے اچھوتی، جدا ہے سب سے شعار اپنا

جسد ہیں بے روح اس جہاں میں، ہنر سے عاری ہیں ترمذی ہم
نہ بو ہے باغِ سلف کی باقی، نہ ہے گلوں میں شمار اپنا

یادِ ایّام

از مسٹر سید غلام پنجتن بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

قیس میں مجنونیت ہو یا نہو، لیلیٰ نے اس کو دنیا کا رکھا ہو یا نہ رکھا ہو، نجد اُس کی مجنونیت کا جولانگاہ رہا ہو یا نہ رہا ہو، مگر دنیائے عشق میں مجنوں کی دیوانگی اور لیلیٰ کے ناقہ نے ایک نہ مٹنے والی صورت اختیار کرلی ہے۔ لیلیٰ کی شہرت نجد سے نکلکر چاردانگ عالم میں پھیل گئی اور مقام و زمانہ سے آزاد ہو کر قیس کی امیدوں کی دنیا کے مرادف ہو گئی۔ دنیا والوں کو ماننا ہی پڑا کہ قیس دیوانہ لیلیٰ ہے، اور نجد کا ہر بگولہ اسکی آنکھوں میں ایک محمل نظر آتا ہے، محمل بھی کیسا جسمیں اُس کی امیدوں کی دنیا پنہاں ہے۔ قیس و لیلیٰ کے انفرادی جذبات کچھ ایسے پروان چڑھے کہ حجاز کے رہنے والے جہاں جہاں گئے مجنونیت کے جذبات نے اُن کا ساتھ نہ چھوڑا، اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں اُنھوں نے اپنا ایک نجد جدا بنایا، اور اُس نجد میں ایک لیلیٰ تلاش کرلی؛ چنانچہ پیارے منظر! ہم سید احمد خانیوں کا نجد علیگڈھ ہوا، اور جو قومیت سرسیّد وہاں پیدا کرنا چاہتے تھے وہ ہماری لیلیٰ ہو کر رہ گئی، پھر کیونکر ممکن تھا کہ نجدیوں کو نجد کی یاد تازہ کرنے والی آواز بیقرار نہ کردے۔ ہماری گھٹی میں یہ مجنونیت اور علیگڈھ سے عشق نہ ہوتا تو تمھارے جواب میں یہ شعر کافی تھا ؎

کعبہ میں آگئے صنم، بُتکدہ بن گیا حرم قبلہ ہی جب نہیں رہا، رُخ ہو کدھر نماز کا

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب کاشی میں اولڈ بوائے نے جنم لیا تو علیگڈھ سے پیدایش کے وقت اذاں دینے کی رسم ادا کی گئی۔ اور پہلی آواز جس نے بقول سیّد جالب اس نو زائیدہ پیر بالغ کا خیر مقدم کیا وہ انھیں عمارتوں میں گونجی، جہاں گوش حقیقت نیوش کو آج سرسیّد کی یہ آواز سُنائی دیتی ہوگی کہ .... کیا کرنا تھا اور تم نے کیا کیا؟

حالانکہ یہ پرچہ علیگڑھ کے کھنڈرے شوکت کا بچہ تھا؛ جس کو دنیا آج مولانا شوکت کے نام سے
یاد کرتی ہے، لیکن کون سے ہاتھ تھے جو خوشی خوشی اس کو آغوش میں لینے کے لئے نہ پھیلے ہوں،
ہم خود اس زمانہ میں طالب علم تھے، اور آپ بیتی نہیں بلکہ کالج بیتی کہتے ہیں کہ ہفتہ میں ایک
اور مہینہ میں ایک دن ایسا ہوتا تھا جب ہمارے اور ہمارے ساتھیوں کے کان بیتابی کے ساتھ پوسٹمین
کے نعل دار جوتے کی آہٹ پہ لگے رہتے تھے۔ پہلا دن تو کامریڈ کی آمد کا ہوتا تھا، اور دوسرا دن
اولڈ بوائے کی آمد کا جس کے زیب سرورق ہماری لیسلی کا محل (اسٹریچی ہال) ہوتا تھا، ہم کو تو شوکت
(یعنی توبہ مولانا شوکت) اس بچے کی نرس بنا کر لے گئے تھے۔ تمہیں خوب یاد ہوگا کہ اولڈ بوائے کے
نکلنے میں ذرا دیر ہوئی کہ تمہارے دفتر میں اشتیاق سے بھری ہوئی تحریریں موصول ہونے لگیں،
کس محبت سے علیگڑھ والے، چاہے لندن میں ہوں یا برلن میں، نئی دنیا میں ہوں یا [illegible]
دنیا میں، اس کو شروع سے آخر تک پڑھتے تھے، اور اپنے یا اپنے کسی عزیز دوست کی زندگی
کے افسانے پڑھ کر اپنے بچپن کے زمانے اور طالب علمی کے دور یاد کیا کرتے تھے۔ اس زمانہ کی ایک جھلک
دیکھ کر چند لمحوں کے لئے تو دل میں یہ آرزو ضرور پیدا ہو جاتی تھی کہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل جائیں
وہ صحبتیں اب خواب ہو گئیں! وہ زمانہ بھی کیا تھا جب ہمارے سینے محبت سے معمور اور کدورت سے
خالی تھے۔ ہماری لڑائیاں عارضی ہوتی تھیں، اور ملاپ کی بنیاد مستحکم تھی۔ ہمارے قضیئے کالج کی چار
دیواری میں محصور! غیر تو غیر کسی دوست کی شکایت اپنے تک لیجانا بھی ہم گناہ سمجھتے تھے۔ طلبہ طلبہ
تھے، اور استاد استاد۔ ادھر سے شفقت اور ادھر سے سعادت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہماری شرارتیں طفلانہ
ہوتی تھیں، اور پھبتیاں مخلصانہ! یہ وہ علیگڑھ لائف تھی جو ہم نے بچپن میں دیکھی، اور جب کالج
میں آئے تو اس کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس زندگی کی یاد تازہ کرنا اور قدیم روایات کا قائم رکھنا،
اور موجودہ طلبہ کو قدیم طلبہ سے ملانا، اولڈ بوائے کا مقصد اولیں تھا اور یہی مقصد اب بھی قائم رہنا چاہیے
دنیا میں کچھ بھی ہوتا رہے، جہاں تک آپ کے رسالہ کا تعلق ہے سب ہی پیر نابالغ اور پرانے گولنداز نئے رہیں
بجوبات ہو پرانی زندگی کی یاد تازہ کرنیوالی، بوڑھوں کو بچہ بنانیوالی ہو۔ یہ البتہ ہونا چاہیے کہ اگر ہمارے بعد سے
کرکٹ نکلجائے تو کم سے کم تمام پروفیسر نہیں تو صرف پولیٹیکل اکانمی کے پڑھانیوالے دنیا بھر میں ہم سے بڑھ جائیں اور....

اُولڈ بُوائز

۱۔ اپنی قدیم درسگاہ کی محبت جو نواب نذیر جنگ بہادر کے قلب میں ہمیشہ موجزن رہتی ہے اسی کا تقاضا تھا کہ اولڈ بوائے کے احیاء و اجراء کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیکر ہر قسم کی معاونت کے لئے اس امید پر تیار ہو گئے کہ دوسرے برادران کالج و یونیورسٹی بھی علیٰ قدر مراتب اپنی توجہ اور بروقت امداد سے کام لیتے رہیں گے۔ پچھلے دو دوروں کی ابتدا کی بہ نسبت دور ثالث کے آغاز میں اولڈ بوائز بفضلہ زیادہ گرمجوشی سے کام کر رہے ہیں، اور مدیر رسالہ کی قلمی و رقمی مدد پہنچانے کے لئے الحمد للہ حتی السع ساعی ہیں۔ نواب صاحب کے دوستوں کے لئے یہ اطلاع مسرت خیز ہو گی کہ اعلیحضرت حضور پُرنور نے شہزادگان بلند اقبال کا اتالیق مقرر فرما کر اپنے ایک وفاکیش رکنِ حکومت کو سرفرازی کا موقع عطا فرمایا ہے۔

۲۔ رسالہ کے اجرا کی تجویز بروئے عمل آئی تو سب سے زیادہ دشوار کام اُولڈ بوائز کی ایک ملولانی فہرست کا تھا۔ یہ کام اگرچہ اب بھی جاری ہے، لیکن جن اولڈ بوائز نے ہمیں ابتدا میں مدد دی اُن میں ہم مسٹر محمد عثمان، اور مسٹر مہدی حسن زبیری کے ناموں کو سب سے آگے پاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی مسٹر رشید احمد کا نام آتا ہے۔ مسٹر سید محمد اعظم، اور مسٹر سجاد مرزا نے جو فہرستیں عنایت فرمائی ہیں اُن سے ہماری منزل آسان ہو گئی یہی حال مسٹر نظیر حسین فاروقی، مسٹر محمد احمد مسٹر عبد الرزاق اور مسٹر سید محمد تقی کا ہے۔ اول الذکر تو دورہ کی حالت میں بھی اُولڈ بوائے کو نہ بھولے۔ دوسرے مقامی اولڈ بوائز میں مسٹر امجد علی اور مسٹر ابوالحسن بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ہمارے لئے مفصلات کے برادران میں سے مسٹر عارف الدین (نلگنڈہ) مسٹر حسن احمد (سنگاریڈی) مسٹر عبد الغنی (ہنگولی) مسٹر محمد بہادر (بمبئی) مسٹر افتخار علیخاں (ترپاپیٹھ) مسٹر رشید احمد (اودگیر) مسٹر حامد علیخاں (چھپلی) مسٹر محمد جعفر مسٹر اکبر عالم (گلبرگہ) مسٹر حافظ علی (بیدر) مسٹر نواب احمد (منبر) اور مسٹر محمد مکرم (بیڑ) کے نام لینا ضروری ہیں۔

مسٹر خواجہ یوسف الدین (میدک) نے قلمی معاونت کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر، مسٹر سید محمد مہدی اور مسٹر اظہر حسن نے اجرائی رسالہ سے متعلق ہماری جس قدر مدد فرمائی ہے ہمارا دل اُن کی شکر گزاری سے لبریز ہے۔ آخر الذکر نے جو کچھ کیا اپنے کالج کی محبت سے تھا، اور اوّل الذکر دو صاحبان کی توجہ کو ہم تو یہی جانتے ہیں کہ یہ ان کی ذاتی بلند خیالی ہے۔ آخر میں ہم اپنے برادر محترم میجر سعید محمد خاں کے منت پذیر ہیں، کہ اس سعی میں حسب وعدہ ہمارے شریکِ حال ہو گئے، اور نہ صرف رجسٹر خریداران سابق مہیا فرما کر ہمیں ممنون فرمایا بلکہ اس کام میں ہر قسم کی مدد کرنے کی بھی امید دلائی ہے۔

۳۔ اولڈ بوائے کی ایک غرض جہاں فرزندانِ کالج کو اُن کی مادرِ علمی سے قریب تر کرنا ہے، وہیں ایک دوسری غرض یہ بھی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے حالات سے کماحقہٗ آگاہ رہ کر، باہمی معاونت کے موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ اس غرض کی تکمیل کی خاطر ہماری رائے یہ ہے کہ قدیم ڈائرکٹری سے جدا ایک ایسی ڈائرکٹری تیار کیجائے جس سے کسی شخص کی زندگی پر تھوڑی بہت روشنی پڑ سکے۔ ہمارے اس خیال کی تائید میں مسٹر قاسم حسن (ہنگولی) اور مسٹر شمس الحسن (فتح آباد) نے صدا بلند کی ہے۔ اپنی پیدائش سے لیکر اس وقت تک کے حالات اگر اولڈ بوائز ہمارے پاس روانہ فرمادیں گے تو ہم کوشش کرینگے کہ اُن کو کتابی صورت میں شایع کردیا جائے۔ رفتہ رفتہ آئندہ اشاعتوں میں حالات کا اضافہ ہوتا رہیگا۔

۴۔ اولڈ بوائز کے عنوان کے تحت اولڈ بوائز اور اُن کے متعلقین سے متعلق جس قدر خبریں ہمیں وصول ہوتی رہیں گی ہم اُن کو درج رسالہ کرتے رہیں گے۔ انسان کی زندگی کے واقعات اگر بروقت کسی جگہ قلمبند ہوتے رہیں تو وقت پر بڑا کام دیجاتے ہیں۔ پس ہم اپنے بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی خبر بھی مدیر رسالہ کے پاس روانہ فرمادیا کریں۔

۵۔ ماہ گزشتہ میں ہز اکسلنسی لارڈ ارون وائسرائے ہند اپنے سفر میسور و جنوبی ہند سے واپس جانے لگے تو راہ میں اجنتا ملاحظہ فرمانیکا قصد بھی ظاہر فرمایا۔ لاٹ صاحب موصوف کی پذیرائی کی غرض سے سرکار آصفیہ کے جو عہدہ دار مقرر کئے گئے تھے اُن میں سے ایک نواب ضیا نواز جنگ بہادر

اول تعلقدار اورنگ آبادی تھے۔ اس موقع پر انتظام کی خوبی کے لئے وہ ضرور قابل مبارکباد ہیں۔ منجملہ دوسرے حضرات کے جو اس موقع پر موجود تھے مسٹر جمیل احمد (انجینئر) بھی ہیں، جنہوں نے انتظامی حالات میں کالج کے خصوصیات کو اب تک قائم رکھا ہے۔

۶۔ مسٹر الطاف حسین (اٹاوہ) کے احباب کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ انھوں نے دمہ جیسے تکلیف دہ مرض سے صحت حاصل کرلی ہے۔ بغرض معالجہ اٹاوہ سے حیدرآباد آکر انھوں نے کیپٹن واکھرے سے رجوع کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تھوڑی سی توجہ سے ہمارے ایک بھائی کو اس موذی بیماری سے نجات مل گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مدیر رسالہ اور مسٹر غلام پنجتن کے لئے بھی ایک مدت ہوئی جب کامیاب کوشش کی تھی۔

۷۔ مسٹر سید محمد ضامن کنتوری جو ہمیشہ اپنے کلام سے احباب کے مشام جاں کو معطر فرماتے رہتے ہیں، پچپن سال کے قریب آنے پر ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ کو ایک بار اور بیٹے کے باپ بنے ہیں۔ اُن کے بہت سے نزدیک و دور کے احباب اُن کو مبارکباد کے پیام اور مٹھائی کے تقاضے بھیجیں گے، اور ہمیں امید ہے کہ وہ اپنی شیریں کلامی سے اُن تقاضوں کی ضرور پذیرائی فرمائیں گے۔ بچہ کا نام علی ضامن ہے۔

۸۔ سنتے ہیں کہ اس مرتبہ دوسرے برادران اسلام کے ساتھ بہت سے اولڈ بوائز بھی حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ طیبہ کو تشریف لے گئے تھے، اخبارات میں جو نام ہماری نظر سے گزرے ہیں، مسٹر شیخ عبدالرؤف، نواب مختار جنگ بہادر، اور خانصاحب محمد غنی کا شمار بھی انہیں میں سے ہے۔ اللہ میاں کو ڈھونڈھنے کی غرض سے عربستان کے سفر کے لئے مولوی مجیب احمد تمنائی اور مسٹر ہارون خاں شروانی بھی تیار ہو گئے تھے خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہ بھائی اپنے کام کو پورا کرکے بخیر خوبی واپس آگئے ہیں۔ یہ دونوں حضرات صاحب قلم ہیں۔ اگر اپنی سرگزشت روانہ کرنیکی تکلیف گوارا فرمائیں گے تو ہم شکریہ کے ساتھ درج رسالہ کردیں گے۔ تبرکات کے لئے ہمارا تقاضہ پھر بھی باقی رہیگا۔ مہربانی فرماکر مسٹر لطف احمد تفصیل کے ساتھ ہمیں بتائیں کہ مناہج اصلاح ساز کی تلاش میں ہمارے حاجیوں پر کیا گزری۔

۹۔ اپنی عمارات کے لحاظ سے ہند شمالی میں آکبر آباد کو ممتاز درجہ حاصل ہے، اور ہم آگرہ کو اس وجہ سے بھی پسند کرتے ہیں کہ وہاں کے شرفا نے ورزش اور اپنی صحت قائم رکھنے کے بہت سے مشاغل کو اب تک جاری رکھا ہے، آگرہ کی عمارتوں میں حال ہی میں ایک مناسب اضافہ شہر کی کوتوالی کی تعمیر سے ہو گیا ہے۔ عہد حاضرہ کی یہ عمارت اگرچہ شاہان مغلیہ جیسی عالیشان تعمیر تو نہیں، لیکن ہمارے لئے اس سبب سے قابل یادگار ہے کہ خان صاحب امتیاز محمد خاں کے عہد کوتوالی میں تیار ہوئی ہے۔ باوجودیکہ خان صاحب اپنے ہاتھ کی کئی انگلیاں شہید کرا چکے ہیں مگر افغانیت اب بھی باقی ہے، اور سوپھولا پر کاسٹیک کا استعمال تو اس وقت بھی جاری تھا جب خون میں زہر سپتال میں پڑے تھے۔ نینی تال میں آن سے ملکر وہاں کے تمام اولڈ بوائز کو بڑی مسرت حاصل ہوئی، اور مدت کے بعد ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہم اپنے کالج کی چار دیواری میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسٹر حیدری، مسٹر شمس الدین اور مسٹر ساجد علیخاں (بھولیا والے) گواہی دیں!

۱۰۔ نواب سر موسیٰ خاں صاحب کے بہت سے احباب کو یہ معلوم کرکے ملال ہوگا کہ انکی والدہ صاحبہ نے حیدرآباد میں وفات پائی۔ خدا مرحومہ کو جوار رحمت عطا فرمائے۔ اور پس ماندوں کو صبر دے۔ اس غم میں ہم اپنے بھائی کے شریک ہیں۔

۱۱۔ مولوی محمد عبد الرزاق حیدرآباد سیولین نے حال ہی میں اپنی بچی کی چھٹی سالگرہ کی تقریب میں بزم مشاعرہ ترتیب دی تھی۔ اس موقعہ پر حیدرآباد کے تقریباً تمام خوش فکر شعرا جمع تھے۔ برادران کالج بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں سے حضرت جوش، حضرت اختر، جناب اصغر اور خود صاحب مشاعرہ نے اپنے کلام سے حاضرین کو لطف اندوز فرمایا۔ سامعین میں مسٹر لیاقت اللہ مسٹر مختار علیخاں، مسٹر رشید احمد، اور مسٹر عبد الستار قابل ذکر ہیں، کہ پیٹ بھر کر کلام سنا، اور سیر ہو کر کھانا کھایا! مگر بتیس شیر ایسی ہضم کرنے والا ان میں سے ایک نہ تھا۔ اس موقعہ پر جو کلام پڑھا گیا ہم آئندہ کبھی درج کریں گے، بشرطیکہ مل گیا۔

۱۲۔ مسٹر سید غلام پنجتن کو گزشتہ مہینہ میں خدا نے دو خوشیاں دیں! ایک تو یہ کہ پانچویں اولاد کے باپ بنے، اور دوسرے یہ کہ اُن کے چھوٹے بھائی مسٹر سرور حسن ہندوستان کی تعلیم سے

خوشی میں آغا حیدر صاحب اولڈ بوائے کے صفحات پر اپنی روشنائی کے چند قطرے ٹپکا دیے گئے۔

۱۸۔ مولانا شوکت علی صاحب کے فرزند ثانی مسٹر شاہد علی نے ایک مدت کی علالت کے بعد ۸ ار ستمبر کو دہلی میں وفات پائی۔ اس موقعہ پر مرحوم کے والد ماجد کے سوا اور بہت سے عزیزان وطن دہلی میں موجود تھے، مگر ان کے چچا مولانا محمد علی صاحب شملہ میں تشریف رکھتے تھے، اور بڑے بھائی نے ذریعۂ تار ہدایت فرمائی تھی کہ اتحادی کانفرنس کے خاتمہ تک وہ واپس نہ آئیں۔ ہمیں اس غم میں اپنے برادران سے دلی ہمدردی ہے، اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند کریم مرحوم شاہد کو جوار صالحین عطا فرمائے۔

۱۹۔ اولڈ بوائز ڈائرکٹری کے لئے اولڈ بوائز نے مہربانی فرماکر مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب تحریر فرمادے تو اس کام میں آسانی ہوگی (۱) نام مع ولدیت وسکونت مقام و تاریخ پیدایش، (۲) تعلیم کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی؟ علیگڈھ میں کس جماعت میں داخل ہو کر کہاں تک تعلیم پائی؟ تعلیمی زمانہ کے خصوصیات و امتیازات (اگر کچھ ہوں) (۳) علیگڈھ میں تفریحی مشاغل کیا تھے، اور ان میں کیسا نام پیدا کیا؟ (۴) علیگڈھ میں عملی طور پر کن کن کاموں میں شرکت کا موقعہ ملا مع اسکے نتیجہ کے، (۵) علیگڈھ سے باہر جاکر کس قسم کی زندگی کو اختیار کیا؟ اور اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی! (۶) ملک میں یا بیرون ملک کوئی اہم سفر کیا ہو تو اس کا ذکر (۷) ملک کی علمی، ادبی، یا شعری خدمت انجام دی ہو تو اس کا تذکرہ، (۸) شادی کب اور کہاں ہوئی۔ اولاد کی تعداد فرزندوں کے نام۔

مطبوعہ عماد پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن

فارغ ہو کر عازم انگلستان ہوئے۔ مسٹر چغتین اگر رسالہ کے "یاد ایام" کے لئے تیار ہو کر نکلیں، تو انکی جانب سے اِن مواقع کی بڑی دعوت ہو گی۔

۱۳۔ مسٹر عنایت اللہ کی ادبی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں ہے، اور اولڈ بوائز میں سے تو بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو اُن کے علمی مشاغل سے واقفیت نہ رکھتے ہوں۔ ان سب کے لئے یہ امر موجب امتنان ہے کہ حضور پر نور نے نظامت دار الترجمہ جامعۂ عثمانیہ کے لئے مزید ایک سال کی توسیع منظور فرمائی ہے۔ برادر محترم ہماری مبارکباد قبول فرمادیں۔ اور اولڈ بوائے کے لئے جس مضمون کا وعدہ کیا ہے جلد روانہ فرمادیں۔

۱۴۔ سلام دین (معاف فرمائیے آنریبل جسٹس سلام الدین) اور لارڈ حیات کے بہت سے کھلنڈرے دوستوں کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ حال ہی میں جو تغیرات حکومت بھوپال میں رونما ہوئے ہیں، اُن میں ہمارے ان دونوں بھائیوں نے ترقی کا حصہ پایا ہے؛ یعنی مسٹر سلام نواب مولوی لیاقت علی صاحب کی جگہ ریاست کی عدالت عالیہ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے ہیں اور مسٹر حیات (یعنی مولانا محمد علی کی سکرٹری مسٹر حسن محمد حیات) اس ریاست کے جوڈیشل سکرٹیری۔ دونوں کو ہم اس وقت مبارکباد دیں گے جب وہ بھوندو کو پکڑ کر اولڈ بوائے کے لئے ایک اچھا سا مضمون لکھا منگائیں۔

۱۵۔ برادر محترم خواجہ غلام السبطین صاحب نے ہم سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ مرحوم خواجہ غلام الثقلین کی سیرت سے متعلق ایک طویل مضمون ہمیں اولڈ بوائے کے لئے مرحمت فرمائیں گے۔ کیا اچھا ہو کہ اب وعدہ پورا کیا جائے؛ ہم اس تقاضہ میں عزیزی سیدین کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

۱۶۔ ہم پریس کو جا رہے تھے کہ ہمیں لفٹنٹ آغا علی حسن کے یہاں فرزند نرینہ تولد ہونیکی اطلاع وصول ہوئی۔ خدا بچہ کی عمر دراز کرے۔ بچّے کے دادا بھی حال ہی میں سب لفٹنٹ سے لفٹنٹ ہو چکے ہیں۔

۱۷۔ مسٹر آغا حیدر حسن خدا خدا کر کے کوتوالی سے تعلیمات میں منتقل ہوئے تھے۔ انکا پہلا تقرر جاگیردار کالج میں ہوا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب مرحوم کے بجائے نظام کالج کی اُردو پروفیسری کے لئے ہمارے آغا کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اِس

فہرست کتاب منظر الکرام

مدار المہامان

صدر اعظمان

مشیر خاص

معین المہامان

صدر المہامان

قیمت خاص — کلدار
قیمت عام —

سید منظر علی
۳۰۱۲ سلطان پورہ حیدرآباد دکن

صدر الصدور

۱	نواب صدر یار جنگ بہادر	۱۷		٭	

چیف کمانڈر

۱	کرنل نواب سر افسر الملک بہادر	۸۱		٭	

معتمدین

۱	نواب احمد نواز جنگ بہادر	۸۷	۹	نواب فصیح جنگ مرحوم	۱۰۱
۲	نواب اختر یار جنگ بہادر	۸۸	۱۰	مولوی میر کاظم علی صاحب	۱۰۳
۳	نواب اکبر یار جنگ بہادر	۸۹	۱۱	نواب کرامت جنگ بہادر	۱۰۶
۴	رائے بیجناتھ صاحب	۹۲	۱۲	دیوان بہادر کرشنما چاری صاحب	۱۰۸
۵	نواب ذوالقدر جنگ بہادر	۹۴	۱۳	نواب مہدی یار جنگ بہادر	۱۰۹
۶	نواب صمد یار جنگ بہادر	۹۶	۱۴	نواب نذیر جنگ بہادر	۱۱۱
۷	نواب علی نواز جنگ بہادر	۹۷	۱۵	نواب سید نصیر حسین خیال	۱۱۴
۸	نواب فخر یار جنگ بہادر	۹۹	۱۶	مولوی آغا محمد علی صاحب	۱۱۸ الف

ارکان عدالت العالیہ

۱	نواب جبار یار جنگ بہادر	۱۱۹	۶	پنڈت کیشوراؤ صاحب	۱۲۶
۲	نواب جیون یار جنگ بہادر	۱۲۰	۷	نواب مرزا یار جنگ بہادر	۱۲۸
۳	نواب سراج یار جنگ بہادر	۱۲۲	۸	نواب ناظر یار جنگ بہادر	۱۳۰
۴	نواب ضیا یار جنگ بہادر	۱۲۴	۹	نواب ہاشم یار جنگ بہادر	۱۳۲
۵	نواب فاروق یار جنگ بہادر	۱۲۶		٭	

نظماء

۱	راجہ اندر کرن بہادر	۱۳۵	۳	ڈاکٹر سید حامد علی صاحب	۱۳۸
۲	مولوی خواجہ انور حسن صاحب	۱۳۶	۴	مولوی سید خورشید علی صاحب	۱۴۰

صوبہ داران

تعلقداران

فضلا و شعرا

اہل فن

یہ سرورق!

بالکل عارضی ہے

اور

قدیم روش کے خلاف کوئی بدعت نہیں مجبوری یہ ہے کہ ڈائی جناب
مولانا شوکت علی صاحب کے پاس اُن کے مستقر پر ہے، اور
اُن کو تھوڑے عرصے سے ناگزیر ذاتی حالات کے مدنظر مستقر سے دور
رہنا پڑا ہے جیسے ہی مولانا کو اطمینان سے ایک جگہ بیٹھنا نصیب ہوا
وہ ڈائی مکمل کر دیں گے اور پھر سرورق اپنی اصلی حالت پر
[illegible] جلد سے [illegible] ہو جائیگا۔

[illegible]

اولڈ بوائے
علی گڈھ

اولڈ بوائے

جلد ۱ — نمبر ۲

فہرست مضامین بابت ماہ نومبر ۱۹۲۷ء

علیگڈھ اولڈ بوائز کا ادبی، تاریخی، تعلیمی اور تفریحی ماہ نامہ

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۴۰-۱۲-۲ سلطان پورہ حیدرآباد دکن سے شایع کیا

قیمت سالانہ ... قیمت ششماہی ...

مکرمی! السلام علیکم

کل الطاف نامہ ملا۔ اس سے پہلے منظر الکرام نظر نواز ہوا تھا۔ رسید لکھنے کا ارادہ کر لیا تھا، دوسرے مشاغل کی وجہ سے ذہن سے اتر گیا۔ شرمندہ ہوں اور عذر خواہ۔ رسالہ بہت اچھا ہو گیا۔ رسالہ کیوں کہوں، کتاب کیوں نہ کہوں۔ کام حوصلہ شکن تھا آپ کا استقلال کام کر گیا۔ ایک یادگار چیز ہاتھ آگئی۔ جن لوگوں کا ذکر ہے اُن کو دہرا ممنون ہونا چاہیئے، آپکی محنت کا، محبت کا۔ محنت سے احوال فراہم کئے محبت سے ذکر کر کے نام نیک کا سامان بہم پہنچایا۔ میرا دلی شکریہ بہت بہت قبول فرمائیے۔

قیمت معلوم ہو تو کچھ جلدیں کتاب خانوں کیلئے خرید لی جائیں۔

امید منزل۔ ۵ر نومبر ۱۹۲۶ء نیاز مند .... صدر یار جنگ

خدمت مکرمی مولوی سید منظر علی صاحب مدظلہ

جس وقت ہمارا اکتوبر نمبر طباعت کی منزلیں طے کر رہا تھا ہمیں برادر عزیز مولوی ہارون خاں صاحب شیروانی
ایم۔ اے (آکسن) کی تحریر مورخہ ۱۲ ستمبر وصول ہوئی۔ موقع ہوتا تو ہم اس کو گذشتہ نمبر ہی میں شائع کر دیتے۔
مگر اب تاخیر کے لئے عذر خواہ ہو کر باعتبار اہمیت اداریہ کا سرنامہ قرار دیتے ہیں۔ ہم اہلِ ایشیا "بزرگداشت"
میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ پھر بھی ہمیں اپنے بزرگوں خصوصاً اُن لوگوں کے لئے ابھی بہت
کچھ کرنا باقی ہے جو ساری عمر ہماری تعلیم و تہذیب کے لئے کوشاں رہ کر اب زیر خاک آرام کر رہے ہیں۔
سرسید کی دلی تمنا ایک جھونپڑے کو محل بنانے اور ایک چھوٹے سے مدرسہ کو یونیورسٹی تک پہنچانے کی
ساری عمر رہی۔ اُن کی یادگار میں محبانِ تعلیم نے سعی کی اور ہماری یونیورسٹی بحالت موجودہ جیسی
کچھ ہے قائم ہو گئی۔ سرسید کے رفقاء کار کے لئے ہم نے کیا کیا؟ اسکا جواب راقم الحروف کے پاس کچھ
نہیں ہے اور نہ اس سلسلہ سے ہمیں اس وقت کوئی شخصی واسطہ ہے۔ البتہ متمدن دنیا کی ریس اگر ہمیں منظور ہے
تو ہمیں اپنے بزرگوں کی یاد بھی ایسی ہی تازہ رکھنی چاہئے جیسی کہ اُن کی شان کے شایاں ہو۔ مسٹر شیروانی
کی تحریک معقولیت کو لئے ہوئے ہے اور اس قابل ہے کہ ہم سب ملکر اس پر غور کریں اور آخر میں
کسی نتیجہ پر پہنچکر اس کو عملی جامہ پہنائیں اس باب میں ہم اپنے ناظرین سے بطور خاص درخواست کرتے ہیں
کہ اپنی اپنی رائے سے ہمیں اطلاع بخشیں۔

اولڈ بوائے

بخدمت جناب مدیر رسالہ "اولڈ بوائے" حیدرآباد دکن

جناب من!

دو سال پیشتر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا جشن پنجاہ سالہ دامن مستقبل میں پنہاں تھا' آج وہ ایک واقعہ ماضیہ ہوگیا ہے' اور اس کے کیفیات و نتائج آشکار ہوگئے ہیں۔ بعض ناگزیر اسباب کی وجہ سے میں حیدرآباد سے جا نہ سکا' اور اس میں شرکت کی امنگ گویا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ لیکن گو میں خود اس مبارک جلسہ کی صحبتوں اور چیدہ چیدہ مشاغل سے بہرہ اندوز و محظوظ نہ ہوسکا' تاہم چونکہ علیگڈھ میری مادر علمی ہونے کے ساتھ ساتھ ضلع پیدائش بھی ہے' اس لئے میں نے اس جشن کی کارروائیوں کی روئداد کو نہایت درجہ غور و فکر سے مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کیفیات کے مطالعہ' اور ان احباب کی زبان سے' جو اس میں شریک ہوئے تھے' وہاں کے حالات سننے سے میرے دل پر یہ اثر ہوا' کہ اس جشن کا پیش نامہ (پروگرام) بہت کچھ چہل پہل' بہت سی دعوتوں اور عصرانوں' اور متعدد استقبالی و صدارتی تقریروں سے مملو تھا! لیکن ساتھ ہی ایک بات جو قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے' یہ تھی کہ باوجود اس مصروفیت (یا یوں کہئے کہ بوجہ اس مصروفیت) کے اس مادر علمی کے پنجاہ سالہ جشن کے مبارک موقعہ پر کوئی حقیقی علمی کام انجام کو نہیں پہنچایا گیا۔ اس کی کیفیت بعینہ اس دوستانہ دعوت سی ہوئی' جس میں لطف صحبت بھی ہو' اور انواع و اقسام کے کھانے پینے کی چیزیں بھی موجود ہوں' لیکن جس کی یاد مرور ایام سے رفتہ رفتہ محو ہوتی جاتی ہو' اور لطف صحبت اور لذت طعام دونوں کم و بیش بے نتیجہ ثابت ہوئی ہوں۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس جشن میں ایک عظیم الشان تعلیمی ادارے کی پچاسویں سالگرہ منانے کے سلسلہ میں کچھ ایسے اسباب فراہم کئے جاتے جن کا کوئی مستقل علمی نتیجہ نکل سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۰۸ء میں کرائسٹ کالج کیمبرج نے اپنے مائہ ناز فرزند جان ملٹن کی سہ صد سالہ سالگرہ منائی ہے تو ارباب کلیہ نے چاردانگ عالم سے اپنے جلیل القدر شاعر و نثار کی تصاویر یہ تحریرات' خطوط' تصنیفات کی ابتدائی اشاعتیں' غرض ہر قسم کی موجودہ یادگاروں کا ذخیرہ جمع کیا تھا' اور اس نایاب مجموعہ کی زیارت کی غرض سے اکناف عالم کے قدرداں کیمبرج آئے تھے۔ اسی طرح جو لوگ جرمانی علوم و فنون کی ترقی سے باخبر ہیں' وہ یہ جانتے ہیں کہ جب کسی معروف جرمانی عالم کی

خدمت علمی کی پچاسویں یا ساٹھویں سالگرہ منائی جاتی ہے تو اس کی مخصوص شاخ علمی کے جتنے بھی ماہر یا مبصر ہوتے ہیں، وہ اس علم کی کسی نہ کسی صنف پر محققانہ مضامین لکھتے ہیں، اور اس مجموعہ کو اس عالم کے نام نامی پر معنون کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح حال میں جامعہ کلکتہ کے بانی دیو میم آشوتوش مکرجی کی یادگار کی طور پر ایک علمی کتاب شائع کی گئی ہے جس میں بڑے متبحر بنگالیوں اور غیر بنگالیوں نے ان شاخہائے علمی پر مضامین لکھے ہیں، جو صاحب عنوان کو مرغوب تھے ۔

ہم ہندوستانیوں میں عموماً اور مسلمان ہندوستانیوں میں خصوصاً یہ بڑی کمزوری ہے کہ اپنے اسلاف کی یادگاریں برقرار رکھنے میں بعض مرتبہ بہت کچھ کوتاہی برتتے ہیں، جس کے باعث نہ صرف ہماری خودداری کے احساس میں کمی رہ جاتی ہے، بلکہ باوجود اپنی درخشاں تاریخ، اور اپنے اسلاف کے چمکیلے کارناموں کے، ہم نہ تو اغیار کو مغلوب کر سکتے ہیں، اور نہ خود کماحقہٗ سبق لے سکتے ہیں ۔

سرسید علیہ الرحمہ کو اس دنیا سے گئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا، لیکن ہم میں کتنے ایسے ہوں گے جو ان کی زندگی کے حالات سے واقف ہوں، یا جنہوں نے ان کی تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کی ہو! اگر علیگڈھ کے ارباب جامعہ اس مقصد کو پیش نظر رکھکر سرسید علیہ الرحمہ اور ان کے جلیل القدر ہم نشینوں کی (جنہوں نے اس مدرستہ العلوم کی داغ بیل ڈالی تھی) یادگاروں کی ایک بڑی نمائش منعقد کرتے، اور اشتہار دے کر، ذاتی ترغیب کے ذریعہ سے، اور قیمتاً، ابتدائی مدرسہ کے نقشے، بانیوں کی تحریریں، ہمعصر اخبارات کے اقتباسات، اور ہمعصر تصاویر، نوشتے، خطوط وغیرہ فراہم کرتے، تو یقیناً اس مادر علمی کی فلاح کے لئے مناسب ہوتا ۔

بہر طور پنجاہ سالہ جشن تو گزر چکا، اب غالباً سات آٹھ سال کے بعد تحریک علیگڈھ کی ساٹھویں سالگرہ منائی جائے گی ۔ ہم جانتے ہیں کہ علیگڈھ نے مختلف شاخہائے علمی کے دلدادہ، اور مختلف عملی میدانوں کے مرد پیدا کئے ہیں ۔ تاریخ و معاشیات، طبیعیات و کیمیا، منطق و فلسفہ، ریاضی و ہندسہ، سیاسیات و حکومت، زمینداری و وزارت، مضمون نویسی و ادارت، رہبری و تقلید، آزادی و غلامی، غرض شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہوگا، جس میں انہوں نے اپنے ہم چشموں کا کم سے کم مساوی رتبہ حاصل نہ کر لیا ہو ۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ ابھی سے ایک ایسی علمی مجلس ترتیب دیجائے جو چند موضوعات پر مستقل تخصصی مضامین لکھوانے کا انتظام کرے، اور ان مضامین کو ایک جلد یا متعدد جلدوں میں یکجا کر کے آئندہ جشن کے موقعہ پر شائع کر دیا جائے، ابھی

ہمارے سامنے سات آٹھ سال کا زمانہ ہے اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ہماری سعی کیوں بارآور نہ ہو۔ یہ مضامین ایک مادرِ علمی کے جشن کی ایک علمی یادگار بن سکتے ہیں۔ یہ دنیا کے سامنے اس امر کا ثبوت ہوگا کہ علیگڈھ والے محض کھیل تماشے کے ہی شائق نہیں، بلکہ ان میں مفید علمی مذاق بھی موجود ہے۔

اِسسال دسمبر کے آخری ہفتہ میں کانگرس ......، اور مسلم تعلیمی کانفرنس جیسی جلیل القدر تنظیمیں اپنے سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد کریں گی، جس کے باعث یہ امید ہے کہ ہر خیال کے اولڈ بوائز اس شہر میں جمع ہوں گے۔ ان قومی جلسوں کے سلسلہ میں ایک مجلس شوریٰ ان معلموں اور ادیبوں کی منعقد ہونی چاہیئے؛ جن کا کبھی نہ کبھی علیگڈھ سے تعلیمی تعلق رہا ہے۔ اگر اس طرف ذرا بھی التفات کی گئی تو یقین ہے کہ بہت سے مراحل طے ہوجائیں گے، اور سنہ ۱۹۲۸ء کی ابتدا سے علمی کام شروع ہوسکے گا۔ اس مجلس کا کام یہ ہوگا کہ وہ اربابِ علم کی ایک مختصر سی پنچایت مقرر کرے؛ جو موضوعات اور مضامین کے حجم کا تصفیہ کرکے ایک ایک موضوع ایک ایک عالم کے تفویض کردے۔ اس مرکزی جماعت کا ایک معتمد بھی مقرر ہونا چاہیئے؛ جو مجموعۂ مضامین کی ترتیب کا ذمہ دار اور (اس جماعت کی ماتحتی میں) رسالہ یا رسائل کا مدیر بھی ہو۔ بہرحال یہ فروعی امور ہیں اور بروقت حسبِ ضرورت طے ہوسکتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ چونکہ یہ کام مسلم یونیورسٹی کے حقیقی کارناموں کی اشاعت پر مشتمل ہوگا؛ اور اس میں بالخصوص اس کی فلاح و بہبود مضمر ہوگی، اس لئے موجودہ اربابِ علیگڈھ کی پشت پناہی کے بغیر اس میں حقیقی روح نہیں پڑسکتی۔ میں ہر ایک اولڈ بوائے سے، جس کے دل میں اپنی مادرِ علمی کا درد ہے، استدعا کرتا ہوں کہ براہِ کرم طرزِ کار کی بابت اپنی رائے عالی سے مطلع فرمائیں؛ تاکہ اگر اس کام کی اہمیت کا احساس ہو تو اس کی داغ بیل جلد از جلد ڈال دی جائے۔ فقط

از جامعۂ عثمانیہ
حیدرآباد دکن

ہارون خان شروانی

سنسکرت ادب

داستانِ اُردو کے حال، اور محترمی نواب خیال کی اس بے مثل تصنیف سے دنیائے ادب بخوبی واقف ہے۔ اس داستان کا ایک ضروری باب "اُردو کا دوسرا دور" (یا اُردو دکن میں) ہم نے اپنے رسالہ لسان الملک میں فخر کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کے بعد علیگڈھ کے مشہور رسالہ سُہیل میں اس کے دو باب "عہدِ زریاد آریا" شائع ہوئے ان میں اُن دو قوموں کے ہند میں قیام، اور اُن کی معاشرت و تہذیب (سویلیزیشن) اور اُن کے ادب کا تفصیلی طور پر ذکر کر کے سنسکرت کے عروج و زوال کا نقشہ کھینچا گیا؛ اور اس ملک کی اصلی زبانوں، یعنی بھاشا، خصوصاً برج بھاشا کا دلچسپ قصہ سنایا گیا تھا، جو آگے چل کر اُردو بنی۔ آریوں کے ذکرِ خیر میں اُن کے علوم و فنون، اور اُن کے لاجواب ادب کا بیان اس داستان میں دیدنی ہے۔ مہابھارت و رامائن کا خلاصہ جس اسلوب سے پیش کیا گیا، حق یہ ہے کہ حضرت خیال کے سوا کسی دوسرے قلم سے اس کی تصویر اتر نا مشکل ہے۔ ان دو مثنویوں کے ذکر کے بعد سنسکرت کی اور مشہور تصنیفوں، اور اس زبان کے ڈراموں کا ذکر بھی ضرور تھا۔ سُہیل میں اس کمی کو محسوس کر کے ہم نے اپنے مخدوم سے اس کا سوال کیا۔ انہوں نے بکمال مہربانی، اس مضمون کا وہ حصہ ہمیں مرحمت فرمایا ہے، جسے اس بیان کا تتمہ کہا جا سکتا ہے۔ ہم اس کو نہایت مسرت کے ساتھ اولڈ بوائے میں درج کر کے اس کے شائقین سے ملتمس ہیں کہ وہ ہمارے ادیب الملک کی سحر نگاری پر لطف نظر کریں، اور شکنتلا کے سے ناٹک کے خلاصہ کو پڑھ کر ہماری زبان کے اس کالبد اس کے ادب و انشا پر سر دھنیں!............ اولڈ بوائے

مہابھارت اور رامائن کی سی تصنیفوں کے بعد ممکن نہ تھا کہ ملک و قوم کی حالت تو بدلتی اور اُن میں اہلِ قلم پیدا نہ ہو جاتے۔ یہ اُن لاجواب مثنویوں ہی کا اثر تھا کہ آخر یہاں قسم قسم کی نظمیں شروع ہوئیں۔ سنسکرت اور اُس کے وقت کی بھاشا جو طبقۂ اوسط کی زبان تھی، دونوں میں ادیب و شاعر اپنی طبیعت کا زور دکھاتے، اور خاص و عام کو بھانے لگے۔ ناٹک (ڈراما) بھی اُسی دَور کے باغِ ادب کا وہ میوہ ہے جو اب بھی تازہ ہے۔ گو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ دراصل کس زمین پر اس کا قلم لگایا گیا، مگر ویدوں میں اِس پھل کا ذکر موجود، اور نٹ کا جا بجا مذکور ہے۔ یہ گویئے اور اُن کے ناٹک یہاں بہت عام اور مرغوب تھے۔ امیروں کی محفلوں اور راجاؤں کے درباروں تک بھی ان کی رسائی تھی، اس وجہ سے ملک میں اس (ناٹک) کی آواز بہت بلند رہی۔

اسی سنسکرت دور میں کالیداس پیدا ہوئے۔ یہ بکرماجیت کے مشہور نورتن کے وہ جوہر ہیں، جس کی چھوٹ آج تک پڑتی، اور نظر کو خیرہ کرتی ہے۔ اُن کی رتوسنہارا (بارہ ماسا) اور میگھدوتا (قاصدِ ابر) کی سی سوہنی نظمیں، اِس زمین پر برس پڑیں، اور زبان اور گلوں کے رستہ سے ملک پر چھا گئیں۔ پھر رگھوونشا تصنیف کی۔ اس میں رگھو (رامچندرجی کے مورث) کے بنس (خاندان) کا مفصل حال لکھا۔ لیکن جس خاص چیز نے ہمارے اس ملکی شاعر کو الہامی منوا دیا، وہ اُن کا لاجواب ڈراما شکنتلا ہے۔

یہ قصہ ایک راجہ کے رنواس (محل) سے شروع ہوتا، اور ایک غریب کی جھونپڑی میں ختم ہوتا ہے۔ دشنتو کمار اتفاقاً ایک جنگل میں جا نکلتے ہیں، اور وہاں سکنتلا نام ایک پریزاد برہمنی پر عاشق ہو کر اُس سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ کچھ دن وہاں رہنے کے بعد انھیں اپنا راج یاد آتا ہے، اور سکنتلا کو اپنی نشانی کا چھلا دے کر اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ اُدھر کمار گھر پہنچ کر جنگل کا قصہ اور اپنی سکنتلا کو بھول جاتے ہیں، اِدھر اس غریب کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے، جسے وہ بڑے دکھوں سے پالتی، اور دشنتو کی یاد میں دن گزارتی ہے۔ بہت دن بیت گئے۔ جنگل بڑھا، کٹا چھٹا، صاف ہوا، اور پھر بھرا۔ آس پاس کھیت لہلہائے، مرجھائے، اور پھر اٹھائے اور لگائے گئے۔ گاؤں کا تالاب بھرا، سوکھا، پانی پڑا، اور پھر

ہاتھی ڈوب ہوگیا۔ اس کے کنارے کنول پھوٹے، نکلے، اور پھولے۔ بھونرے بھن بھن کرتے اڑے، دوڑے، منڈلائے، چکراتے، چکر کاٹتے اس کے پھول پر مدہوش بیہوش گرے، اور وہیں ڈھیر ہوگئے۔ **سکنتلا** قدرت کے یہ تماشے دیکھتیں، اور کنول اور بھونرے کی کوشش اور وفا پر سر دھنتیں، اور اپنے **وشنتو** کی یاد میں ڈوب جاتیں۔ بچہ پلا، بڑھا، کھیلنے لگا، اور اب ہشیار ہوگیا۔ یہ سب ہوا، مگر کمار اب بھی نہیں لوٹے!

یہ بہت اکتائیں تو خاوند کو ڈھونڈنے نکلیں۔ بخت کی خوبی، ستارے کی گردش، لو وقت پر نشانی کا چھلا بھی گم ہوگیا! روئیں کہ اب کیا لے کر اور کس منہ سے کمار تک جائیں۔ مگر ہمت نہیں ہاریں۔ دل کڑا کر کے لڑکے کا ہاتھ پکڑ چل نکلیں، اور کسی طرح راجہ کے دربار تک پہنچیں۔ **وشنتو** نے نہیں پہچانا۔ لڑکا پیش کیا گیا، اسے بھی غیر جانا۔ بہت کچھ یاد دلایا گیا تو ذرا چیتے، مگر اپنا چھلا مانگا۔ وہ کہاں! **سکنتلا** بھرے دربار میں جھوٹی بنیں۔ نکلیں، لیکن صبر کیا، اور اسی شہر میں رہنے لگیں۔ کچھ دن بعد **وشنتو** جی چونکے۔ غریبوں کی یاد آئی، بلاہٹ ہوئی۔ دن پھر چکے تھے، لیجئے وہ نشانی بھی مل گئی! **سکنتلا** ہنستی کھیلتی دربار کو چلیں، پہنچیں، راجہ کے سامنے آئیں۔ کشش ہوئی، پہچانا۔ مگر **وشنتو** پھر راجہ ہیں۔ سنبھلے رہے اور اپنی نشانی کا سوال کیا۔ اب **سکنتلا** نے مسکرا کر وہ چھلا پیش کر دیا۔ راجہ بے چین ہو کر گدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جوش میں انکا ہاتھ پکڑ کر بغل میں بٹھا لیا۔ لڑکا سامنے آیا۔ دیکھا اور محبت کی نظر نے اسے گود تک پہنچا دیا۔ پیار کیا، **بھرت** نام رکھا۔ بچھڑے ملے، اور پھر ہنسی خوشی رہنے لگے! یہ وہی **بھرت** ہیں جو بڑھ کر **بھرت جی** کہلائے، اور **چندربنسیوں** کے پرکھ[1] اور اس بنس کے بانی مانے گئے۔

یہ نادر ڈراما بھی اس وقت کے پنڈتوں کی زبان یعنی **سنسکرت** میں ہے، مگر چونکہ اس کی سبھا میں راجہ پرجا، عالم جاہل، اور خاص و عام سب آتے، اور **یونانی** گائنیں تک ناچتی اور ایکٹ کرتی ہیں، اس وجہ سے اس کے خاص ایکٹروں کی زبان تو **دیوبانی** ہے، مگر اوروں کی بولی وہی **پراکرت** ہے، جو اس وقت کے بزار کا رائج سکہ اور پرجا کے گھروں کا کھرا مال تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ **کالیداس** کے سے جوہری کو بھی

---

[1] پرکھہ۔ بزرگ، مورث۔

یہاں کے اصلی و ملکی سنگریزوں کو اپنے ذخیرہ میں جگہ دئے بغیر چارا اور چھٹکارا نہ تھا! یہ نظمیں اور یہ تصنیفیں گھر گھر پھیلیں، اور خواص پر عوام کی بولی، اور عوام پر خواص کی زبان کا اثر پڑتا اور بڑھتا چلا۔

مرچھ چھکاٹی (رتھہ کھلونا) کا سا ناٹک بھی اُسی زمانہ کی یادگار، اور قصوروار کو پکڑنے اور بے قصور وار کو چھوڑنے کا جائز و فطری قانون سکھا کر، انسان کو منصف بناتا اور خدا کو یاد دلاتا ہے۔

پھر **نل دمن** (نل ومنا) کی سی مثنوی لکھی گئی۔ اس میں ایک جواری راجہ (نل) کی مدہوشی، اور اندھے جوے کی پُردرد داستان، اُن کی بے پناہ ہار .... راجہ نل سلطنت ہی ہارا .... اور اُن کی رانی دمنتا کی وفا و ہشیاری کی حکایت سنا کر بڑے سبق دئے گئے ہیں۔ یہ وہی دلچسپ و مفید نظم ہے جسے **فیضی** کے سے علامہ نے اکبر کی فرمایش پر فارسی کا جامہ پہنایا، اور ہم سے روشناس کرایا، اور اس کی اسی مثنوی (نل دمن) نے شہزادوں اور امیروں کا جُوا چھُڑایا۔

پنچ تنترا بھی اُسی مبارک دور کی ایک نئی، مزیدار، مسلسل اور قصہ در قصہ حکایت ہے۔ یہ جانوروں کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔ مگر کیسے جانور اور کیسا ہوش رُبا قصہ! یہ اُن طلسمی بے زبانوں کی وہ جادو بھری کہانی ہے، جو اُن کی زبانی آدم ذات (زاد) کو سنائی جاتی، اور باتوں باتوں میں اُسے انسان بناتی ہے! یہ قصہ نہ صرف اس ملک میں عام ہوا، بلکہ اس کا چرچا دور دور پھیلا۔ **پہلوی** میں بھی وہ حیوان گویا ہوئے اور **کلیلہ و دمنہ** کی زبان سے وہ **عرب** میں بھی ناطق سمجھے گئے۔ پھر نئے **فارس** اور نئی فارسی کے آسمان شہرت پر وہ **ملا حسین واعظ** کے قلم سے **انوار سہیلی** بن کر چمکا، اور بعد کو اکبر کے سے ہوشمند کے اشارہ پر ہندی فارسی کا خلعت اور **عیار دانش** کا لقب پاکر ہماری محفل کو بھی خرد افزا بناتے اور سرفراز کرتے لگا

"خیال"

شرح دیوان غالب پر ایک نظر

اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے علی سبیل الاعتذار اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تنقید سے
میرا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ کسی سے معارضہ کیا جائے۔ میرے کلام کے سننے اور پڑھنے والے اور میرے جاننے والے
جانتے ہیں کہ میں مرزا غالب مرحوم کو اپنا ہادی و وسیل سمجھتا ہوں اور انکی پیروی کرنا اپنا فخر جانتا ہوں اسیطرح
علامہ طباطبائی مدظلہ کو بھی میں اپنا بزرگ اور بمنزلہ استاد سمجھتا ہوں۔ بریںہم جس طرح کتم شہادت ایک گناہ عظیم
ہے اسی طرح میرے عقیدے میں خادم ادب ہونے کا دعویٰ کر کے کسی ادبی مسئلہ کے متعلق دیدہ و دانستہ
کسی غلط فہمی کو ظاہر نہ کرنا بھی ایک ناقابل معافی گناہ ہے۔

کلام غالب کے متعلق آج کل عجب طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ اگر ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ
فرمودۂ غالب سراسر الہام و وحی ہے تو دوسری جانب سے غالب کے بہترین اشعار کی نسبت بھی مہمل و
بے معنے ہونے کی صدا سنائی دیتی ہے۔ یقیناً ہر صاحب ذوق سلیم ان دونوں نفیروں کو بانگ بے ہنگام
سمجھتا ہے۔ غالب کے بہترین کلام کو بہترین ماننے میں کلام کرنا میرے نزدیک مذہب شاعری میں کفر ہے
لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مرزا کے دیوان میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو اُن کی ابتدائی عمر
کی دقت پسندی کی وجہ سے محل اعتراض قرار پاتے ہیں۔ ہرچند غالب کے شارحین نے طرح طرح سے
ان اشعار کا مطلب سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن جیسی چاہیے کامیابی نہیں ہوئی۔

اس وقت تک جتنی شرحیں میری نظر سے گزری ہیں اُن میں علامہ طباطبائی سے بہتر کسی کی
شرح نہیں ہے۔ علاوہ اُن افادات علمیہ و ادبیہ کے جو خاص مولانا کا حصہ ہیں، تفہیم مطالب میں بھی

جو پایہ اس شرح کا ہے دوسری کا نہیں ہو سکتا۔ بایں ہمہ مجھے بعض بعض اشعار کے متعلق مولانا کی رائے سے اختلاف ہے اور میں طبعاً مجبور ہوں کہ جو میرا خیال ہے اس کو محض ادبی خدمت کی حیثیت سے معرض اظہار میں لاؤں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اپنے اس ارادے کو قوۃ سے فعل میں لانے کی وجہ سے میں مولانا مدظلہ اور مرزا مرحوم دونوں کے ہوا خواہوں کو اپنا مخالف بنالونگا لیکن فریق ثالث کے لئے میری یہ سعی (مشکور یا نا مشکور) صحیح فیصلے کے لئے کوئی راہ ضرور نکال دے گی۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

ضامن کنتوری

النظر

(۱)

نقش فریادی ہے کسکی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

"کاغذی پیراہن" شارح علامہ تسلیم کرتے ہیں کہ کاغذی پیراہن فریادی سے کنایہ فارسی میں بھی ہے اور اردو میں بھی میر ممنون اور مومن خاں کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اب مصنف نے جو کسی خط میں لکھا ہے کہ ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے الخ اسکی اصلیت کے لئے مولانا تاریخی ثبوت کے تلاش میں جا پڑے لیکن یہ مورخ کا کام ہے ہمارا فرض نہیں ہے فارسی میں اس محاورے کے استعمال کی دو نظیریں مجھے بھی یاد ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

"از دست محرقاں بہ فریاد — پیراہن کاغذی سپئے داد
(ابوالحسن فرید آبادی شارح خاقانی)

"ایں نامہ نیست پیرہن کاغذی ماست — پر خوں ز دست ہجر بہ جاناں کہ می برد
(امیر خسروؒ)

اب شعر کے مطلب پر آئیے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "اس شعر میں جب تک کوئی ایسا لفظ نہو جس سے فنا فی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو اسے بامعنی نہیں کہہ سکتے"۔ ہے یہ کہ ان - حالی کی جانب مصنف کی تحریر نے شارح کا خیال رجوع کیا ہے جو یہ ہے۔ "بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے؛ یعنی ہستی اگرچہ مثل ہستی تصویر تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج وملال وآزار ہے"۔ یہ قول شارح اس تحریر سے مرزا کی غرض یہ پائی جاتی ہے کہ "نقش تصویر فریادی ہے ہستی بے اعتبار و بے توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی پیراہن ہونے کا"۔ اعتراض یہ ہے کہ "ہستی کے بدلے جو عدم گنجایش کی وجہ سے شعر میں نہ آسکتا تھا شوخی تحریر کہا گیا اور اس سے کوئی قرینہ ہستی کے حذف پر پیدا نہیں ہوا اور شعر المعنی فی بطن الشاعر کا مصداق ہو کر رہ گیا"۔

میں یہ کہونگا کہ نقش اور ہستی کو جدا جدا کیوں فرض کیجئے جس سے یہ معنی پیدا ہوں کہ "نقش فریادی ہے ہستی بے اعتبار و بے توقیر کا"۔ کیونکہ نقش جب منصۂ ظہور میں آچکا تو وہ خود ایک ہستی ہے اور جب مراد مصنف یا بقول مصنف ہستی بے اعتبار ہے اسلئے کہ ہر ہستی ممکن بے اعتبار ہے؛ یا بہ الفاظ دیگر یوں کہئے کہ منصۂ ظہور یا معرض تحریر میں آتے ہی یہ ہستی یا نقش اپنے عبد سے جدا ہوگیا اور جدا ہونے کے ساتھ ہی بے اعتبار بھی ہوگیا اور اسی فاقد اعتبار جدائی نے اسکو مائل بہ فریاد کیا اور فریادی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اسکا پیرہن کاغذی ہے۔

غالب قیاس یہ ہے کہ مرزا غالب نے اس خیال کو مثنوی مولانا روم کے مطلع اور شعر مابعد سے لیا ہے جو یہ ہیں:-

"بشنو از نے چوں حکایت میکند — وز جدائی ہا شکایت میکند"

"کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند"

پیرایۂ بیان بدیع اور نقش، تصویر، پیکر، کاغذ، پیراہن وغیرہ متناسب الفاظ ہیں جنکا اجتماع خالی از لطف نہیں ہے۔

(۲)

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ

مبارک باد اسد غمخوار جاناں دردمند آیا

شارح علامہ 'غمخوار' سے پہلے عشق مراد لیکر پھر فرماتے ہیں کہ "یہ بھی احتمال ہے کہ غمخوار سے ناصح مراد ہے اور مبارک باد تشنیع کی راہ سے ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ ناصح آئے گا تو جراحت اور داغ جگر کا تحفہ نہیں لائے گا' ہاں جراحت اور داغ جگر پر چھڑکنے کیلئے سودۂ الماس یا نمک لائے گا۔ اس لئے شعر زیر بحث میں آنے والا یعنے (غمخوار جاناں دردمند) عشق ہی ہو سکتا ہے اگرچہ الفاظ میں اسکو ظاہر نہیں کیا گیا۔ دوسرے احتمال کی اس میں مطلق گنجائش نہیں ہے۔

(۳)

تھا خواب میں خیال کو تجھسے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

شارح مدظلہ فرماتے ہیں 'مصنف نے گویا اس شعر کو یوں کہا ہے (زمانۂ عیش نہ تھا بلکہ خواب میں الخ)" میں کہتا ہوں کہ یہ تاویل بعید ہے کہ مصنف نے خواب سے زمانۂ عیش گذشتہ مراد لیا ہو' علی الخصوص جب 'تجھسے' کی ضمیر مخاطب بھی اس خیال کی نفی کر رہی ہے۔ ہم کیوں نہ کہیں کہ قائل نے شب کو خواب دیکھا اور حالت خواب میں معشوق سے مصروف اختلاط رہا لیکن "جب آنکھ کھل گئی الخ"۔ اور یہی روداد بروقت ملاقات وہ اپنے معشوق سے اس شعر میں بیان کر رہا ہے۔ یہ سامنے کا مضمون مبنی بر واقعہ ہے جس کے لئے کسی تاویل کی ضرورت نہیں

(۴)

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

اس شعر کی شرح میں بھی شارح نے 'رفت' و 'بود' کا فاعل زمانۂ عیش کو فرض کر کے معانی کو دور ڈالدیا ہے۔ شاعر کا مقصود ذہنی تو محض 'دل' معلوم ہوتا ہے جو کبھی تھا اور پھر جاتا رہا۔ غم دل کے الفاظ یہی معنے دیرہے ہیں اور بس۔ ہاں کہنے کو کہہ سکتے ہیں کہ جب دل گیا تو اسکے ساتھ لطف زندگی بھی گیا گویا دل کی یاد عین عیش گزشتہ کی یاد ہے۔ مگر یہ معنی معنی زاید ہوں گے شعر میں معنی زاید کا ہونا اس کے حسن میں اضافہ کرتا ہے بشرطیکہ اصل عبارت معنی زاید کی محتاج نہ ہو۔ یہی صورت اس شعر میں ہے اور اسی کا نام بلاغت ہے۔

۵

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

مولانا فرماتے ہیں،۔ "ننگ وجود ہونے کو برہنگی سے تعبیر کیا ہے" پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ۔ "فقط لفظ کا نشا یہ مصنف کے ذہن کو ادھر لے گیا" اور مزہ یہ ہے کہ شعر میں معنی بھی ایسے پہنا دئے جو الفاظ سے نہیں نکلتے۔ مانا کہ مصنف کا منشا یہی ہے کہ "زندگی بھر میرے عیوب کا جو داغ کسی لباس میں نہ ڈھپ سکا تھا اس کو کفن نے ڈھانپا" لیکن برائے خدا یہ تو فرمائیے کہ برہنگی کے معنے ننگ وجود ہونے کے کیونکر ہوئے۔ کیا ننگا ہونا اور ننگ وجود ہونا ہم معنی ہیں؟ اگر یہ کہئے کہ قایل دیوانگی کی حالت میں ننگا پھرا کرتا تھا اس لئے اسکو ننگ وجود کہا' تو پھر ہر لباس میں ننگ وجود ہونا یعنے چہ؟ اور اگر یہ کہئے کہ انسان چونکہ ننگا پیدا ہوتا ہے اسلئے ننگ وجود ہے' اور 'میں' سے مراد نوع قایل یعنے انسان ہے تو یہ فطرۃ الٰہی پر اعتراض ہوگا۔ یا اگر مصنف کی مراد برہنگی سے تجرد روح اور لباس سے جسم ہے تو داغ عیوب کی اضافت روح کے ساتھ بےمحل ہوگی بلکہ بے معنی۔

اصل یہ ہے کہ برہنگی کا لفظ اس شعر میں صحیح محمل نہیں رکھتا اس لئے اس نے پورے شعر کو لباس معنی سے عاری کر دیا ہے۔ اسی مطلب کو غالب نے ایک جگہ اور بھی نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دیکھکر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے　　کر گئی وابستہ تن میری عُریانی مجھے

اسکی نسبت ہم برمحل اظہار رائے کریں گے۔

۶

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ مصنف کا یہ کہنا کہ میں عدم سے بھی باہر ہوں اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ میں نہ موجود ہوں نہ معدوم ہوں اور نقیضین مجھ سے مرتفع ہیں۔ شاید ایسے ہی اشعار پر دلی میں لوگ

کہا کرتے تھے کہ غالب بے معنی شعر کہا کرتے ہیں" مولانا شاید یہ کہکر خود اعتراض کی ذمہ داری سے بری ہو گئے خیر جو ہو جانے دیجئے۔ اب آپ اس شعر کے ماخذ کو ملاحظہ فرمائیے۔ مرزا بیدل فرماتے ہیں:۔

جز بہ گمنامی نشاں امن نتواں یافتن　　ورنہ از پرواز ما تا بال عنقا آتش است

ظاہر ہے کہ غالب نے اپنے شعر کا مضمون یہیں سے لیا ہے اور مرزا بیدل کے مقام گمنامی کو عدم سے بھی پرے ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ اسی تصرف کی وجہ سے اعتراض وارد ہوا اور حق یہ ہے کہ اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

شمع

اس قدر بیتاب کیوں ہے کیا بھری ہیں بجلیاں　　یا کسی عاشق کی ساری تجھ میں ہیں بے چینیاں

رات بھر سوز الم میں کس لئے تو جلتی رہی　　موت پر پروانہ کی تو ہاتھ کیوں ملتی رہی

تیری ہستی سے ہی بیشک رونق بزم حسین　　حسن انکا ماند تھا گر تو نہ ہوتی ہمنشیں

زندگی موہوم تیری صبح تک جسکی بہار　　ڈھیر کچھ پروانوں کا ہے اور کچھ گرد و غبار

پھر کسی غنچہ دہن گلرو نے چٹکی لی اگر　　بنکے شمع انجمن بس ہو گئی تو جلوہ گر

زندگی کا تجھ کو جلنے ہی میں ملتا ہے مزا　　ہے سبق آموز دنیا کے لئے جینا ترا

مونس خلوت ہے تو ہی راحت عشاق ہے　　لذت سوزش میں پروانہ بھی کیسا طاق ہے

شمع و پروانہ کی الفت کا کوئی پوچھے جو راز
کچھ نہیں ہے بھید اسمیں ہے فقط ناز و نیاز

"بسمل"

لیکن میکانیکل انجنیروں کے بارے میں یہ بات صادق نہیں آ سا میں موجود ہونے چاہئیں اور
حیدرآباد دکن میں میکانیکل انجنیرنگ درسگاہ کی عدم موجودگی خاص طور پر کرے اور اگر فی ہل اوسط قیمت
وسیع علم و ترقی کے اعلیٰ مدارج کو اس وقت تک طے نہیں کرسکتی جب تک اتنے قائم کئے جائیں اور ہر جا نیس
موجود نہ ہوں جو ایک کثیر جماعت کے لئے میکانیکل اور سائنٹیفک تعلیم روپیہ ہوگی۔ اگر خدائے کارسازنہ
اس زمانہ میں ہندوستان میں عموماً اور حیدرآباد میں خصوصاً میکانیکل کار کا مالک ہوجائے تو رقم خریدی
اشخاص کی معمولی کاریگروں سے لیکر ماہرفن انجنیروں تک کی سخت ضرو موں میں سے ایک شخص کے پاس
اس ضرورت کا شدید ترین احساس ان افراد کو ہوتا ہے جن کو آئندہ رہی ہے کہ حیرت ہوتی ہے)
کے مہیا کرنے میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نقشہ نویسوں کا ملن ۱۰۰۰ روپیہ فی مکان علی الترتیب
صنعت میں وسعت۔ ہندوستان درحقیقت زرعی ملک ں کی نوعیت اور مکانیت کی
فروغ حاصل نہیں۔ آجکل کی دنیا میں اچھی فصل کی پیداوار میں انجنیر اور مکانوں میں اگر ایک ایک
ہیں۔ زراعت، سائنس اور انجنیرنگ جس قدر ایک دوسرے کے قریب آ اشیاء اب روپیہ کی رقم صرف
ان میں میل ہوگا، اسی قدر زیادہ اضافہ پیداوار میں رونما ہوگا، اور نئی آدم با۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے
ترقی ہوگی۔ یہ امر باعث طمانیت ہے کہ اب کسانوں کی آنکھیں کھلتی جارہی ہے ہوا ہیں۔
آلات زراعت کو بتدریج ترک کرکے نئے آلات سے فائدہ اٹھارہے ہیں۔ طلب زیادہ ہوتی ہے وہ زیادہ کی
(Efficiency) کی اہمیت کی حقیقت بھی روز بروز کھلتی جا کے ہر شخص کی طلب کم ہے کم کی
آب پاشی، حفظان صحت، اور تدابیر رفع قحط کے بڑے بڑے مسئلوں رہی ہے اسی طرح ہندوستان
کو بہت کچھ دخل ہے۔ ہندوستان کی معدنی دولت سے اگر کافی فائدہ اٹھایا جا کی معیار تک پہنچایا اسکے
وسیع شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ مستقبل کی عظیم الشان امکانی ضرورتوں کو نظر انداز کر اب دیکھنا ہے۔ اسکے لئے
کا خیال رکھا جائے تو تعلیمی مرکزوں کا وجود ازبس ضروری ہے اور میکانیکل انجی
تعداد لازمی۔

ہندوستان کے کارخانہ داروں کو سب سے اہم لاینحل سوال جو درپیش ہے کہ کس

نتائج پیدا کرتے ہیں تو اس قسم کے بل کم از کم دس لاکھ کی تعداد میں بازاروں میں موجود ہونے چاہئیں۔ اور اگر ان کی قیمت بالفرض ۱۰ روپیہ سے ۶۰ روپیہ تک کی وسعت میں انحصار کرے۔ اور اگر فی بل اوسط قیمت ۳۰ روپیہ شمار ہو تو کل قیمت ۲ کروڑ روپیہ حاصل ہوگی۔ اگر بیکلوں کے کارخانے قائم کئے جائیں اور ہر پچیس شخصوں میں سے ایک شخص سیکل خریدلے تو لین دین کی مقدار ایک ارب روپیہ ہوگی۔ اگر خدائے کارساز کارسازی کی ہدایت دے اور اگر سو میں سے ایک شخص بھی ایک سستی موٹر کار کا مالک ہو جائے تو رقم خریدی کسی طرح بارہ ارب سے کم نہیں ہوسکتی۔ (امریکہ میں فی الحال ہر آٹھ شخصوں میں سے ایک شخص کے پاس موٹر ہے اور اس پر بھی حالت یہ ہے کہ کارسازی کی شرح اس سرعت سے بڑھ رہی ہے کہ حیرت ہوتی ہے)

...... ۲ ہوا دار دو کمروں والے مکانوں کی تعمیر میں بحساب ۵۰۰ روپیہ اور ۱۰۰۰ روپیہ فی مکان علی الترتیب دس ارب اور بیس ارب روپیہ کا خرچ مضمر ہے۔ ان اعداد و شمار میں مکانوں کی نوعیت اور مکانیت کی وسعت کے اضافے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جائیگا۔ ہندوستان کے نصف مکانوں میں اگر ایک ایک برقی پنکھا اور چند برقی گولے لگائے جائیں تو ان کے نصب کرنے میں ہی تقریباً ۱۲ ارب روپیہ کی رقم صرف ہوگی۔ قوت برقی کا خرچ تو جدا گانہ ہے۔ اسی طرح کی بیشمار مثالیں دیجاسکتی ہیں۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ صنعت کا میدان کس قدر وسیع اور عظیم الشان ہے۔ موجودہ ضرورتیں تو ان کے سوا ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں (مثلاً امریکہ) ہر اوسط (معمولی) شخص کی طلب زیادہ ہوتی ہے وہ زیادہ کی کوشش کرتا ہے اور عام طور پر زیادہ ہی حاصل کرتا ہے۔ ہندوستان میں برعکس اس کے ہر شخص کی طلب کم ہے کم کی کوشش کرتا ہے اور کم ہی حاصل کرتا ہے۔ لیکن ارتقار کا عمل جس طرح امریکہ میں جاری ہے اسی طرح ہندوستان میں بھی۔ ہندوستان کی خانہ داری کی زندگی کا جو عام معیار ہے اس کو یوروپی یا امریکی معیار تک پہنچانا یا اسکے قریب لیجانا فی الحال موجودہ سست رفتار ترقی کے پیش نظر جھونپڑیوں میں محلوں کے خواب دیکھنا ہے۔ اسکے لئے سخت سے سخت محنت اور کاوش درکار ہے اور جب تک ہماری ذہنیت

جو کچھ ہے وہی بہت ہے
اس سے زیادہ کیا چاہیے

پر عمل کریگی اس وقت تک ترقی کا امکان بعید از قیاس ہے۔ لیکن اس دنیا میں ترقی فطری اور ضروری ہے اور اسکے لئے ہمیں سرگرم ہو جانا چاہیئے۔ ہندوستان میں یہ بہت ممکن ہے کہ آئندہ بھی زراعت کو صنعت پر فوقیت حاصل رہے لیکن مادی فلاح و ترقی سائنٹفک اور صنعتی جد و جہد کے ذریعہ ازبس ضروری ہے۔ اس وسیع میدان میں قدم بڑھانے کے لئے سب سے پہلے ہر قسم کے پیشہ و حرفہ کے تعلیم یافتہ اشخاص کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ صنعت انجنیرنگ میں کاریگر، سوپروائزر، نقشہ نویس، منتظم اور ارگنائزر مطلوب ہیں۔

موجودہ طلب بمقابلہ اس کے بہت زیادہ ہے۔ اور ہندوستان کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے فنی طلباء اور اعلیٰ درجہ کے کاریگر پیدا کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ضرورت اور شدید ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ عوام میں صنعت کا شوق عام کیا جائے اور لوگ خانگی مہمات کا بیڑا اٹھائیں۔

نظریہ اور عمل۔ دنیا کے تمام حصوں میں خالص نظری علم رکھنے والے انجنیروں کی مانگ بہت محدود ہے اس قسم کے انجنیر کالجوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اور ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو کر ناکام رہتے ہیں تو قسم قسم کی شکایتیں مختلف طریقوں سے پیش کیا کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ تعلیم میں کوئی نقص ہے بلکہ صرف یہ کہ تعلیم کی تکمیل نہیں ہوئی۔ ان لوگوں کا مقصد اکثر و بیشتر ڈگری یا گریڈ حاصل کرنا ہوتا ہے حالانکہ ضرورت اسکی ہے کہ اپنی اپنی شخصیت قائم کیجائے، اختراعی استعداد کی نشو و نما ہو، کاروباری قابلیتوں کو ترقی دیجائے اور قوائے ترقی میں اسراع پیدا کیا جائے۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ انجنیرنگ میں استعداد کو کم از کم اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی نظری قابلیت کو حاصل ہے۔ کامیاب انجنیر کا دونوں میں مہارت تامہ و تجربہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ کوئی منصف مزاج شخص کسی جامعہ کی ڈگری کی اہمیت گھٹانے کی جرارت نہیں کرسکتا کہ اس سے تحصیل علم کا معیار تعبیر ہوتا ہے لیکن اعلیٰ کاروبار میں صرف اس قسم کی ڈگری سے ہی کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عملی قابلیتوں کا وجود بھی لازمی ہے۔

انجنیرنگ کالجوں اور درسگاہوں میں اکثر و بیشتر نظری تعلیم پر ہی زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اسی پر خاص توجہ کیجاتی ہے۔ وقت کا صرف تھوڑا سا حصہ نقشہ کشی اور دار التجربہ میں صرف ہوتا ہے اور جو طالب علم کہ تجارتی کارخانہ میں عملی کام سیکھتے ہیں ان کی تعلیم و ترقی میں کافی دلچسپی نہیں لیجاتی۔ چند ہی ایسی درسگاہیں

جن سے چھوٹے چھوٹے کارخانے ملحق ہیں لیکن ان کارخانوں کو تجارتی اصول پر چلانے کی کوشش نہیں کیجاتی اور نہ ان کو بڑے پیمانہ پر ترقی دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اگر کسی ہندوستانی طالب علم کو انگلستان میں ہر طرح سے مکمل تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے تو اس سے بڑھکر اور کیا خوش قسمتی ہوسکتی ہے لیکن نوجوان طلبا، کی ایک کثیر تعداد اس طرح کی تعلیم سے مستفید نہیں ہوسکتی۔

نظریہ اور عمل کے اتصال کی اہمیت پر زیادہ زور بھی نہیں دیا جاسکتا۔ ہم آئے دن یہ سنتے ہیں کہ ایک چیز تو نظری حیثیت سے ہر طرح مکمل ہے لیکن عملی حیثیت سے کسی کام کی نہیں۔ لیکن جب اسکی وجہ کی چھان بین کیجاتی ہے تو اکثر یہ بات منکشف ہوجاتی ہے کہ نظری حیثیت سے بھی وہ چیز مکمل نہیں کیونکہ عام طور پر نظری علم رکھنے والے اپنے مفروضات کی بنیاد خیالی شرطوں پر قائم کرتے ہیں جو بہت ممکن ہے کہ حقیقی طور پر موجود نہ ہوں۔ علماء نظریہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اکثر نظرانداز کردیتے ہیں جو عملاً بہت اہم ہوتی ہیں۔ اسی طرح عملی کام کرنے والے بھی نظری باتوں میں لغزشیں کرکے نقصان اٹھاتے ہیں۔ بلاشبہ جس نے نظری اور عملی تعلیم دونوں کی تکمیل کی ہے وہی کامیاب انجنیر بن سکتا ہے۔ اسکی پوری اہمیت روز بہ روز اس شخص پر کھلتی جاتی ہے جو کسی صنعت یا حرفہ میں ترقی کے منازل طے کررہا ہے۔ تجارتی کارخانوں میں میکانیکل انجنیروں اور ماہر فن کاریگروں سے مشورہ کرکے ایک طریق عمل اختیار کیا جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ کسی چوک یا غلطی سے کوئی بات رہگئی تو اس غلطی کا نتیجہ کثیر نقصان کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ کثیر نقصان خالی از فائدہ بھی نہیں۔ اس سے ایسا سبق ملجاتا ہے کہ دوبارہ اس قسم کی غلطی ممکن نہیں۔ ہر کارخانہ میں نمونوں اور نقشوں میں انتہائی صحت کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ اس راز سے نوجوان طالب علم ابتداً بہت کم آگاہ ہوتا ہے۔

اگر درسگاہ یا کالج اور کارخانے جدا جدا مقامات پر قائم ہوں تو طالب علم کو مشکل سے اپنے نظریوں کی تطبیق کا موقع ملتا ہے جس کی انجنیرنگ میں اس قدر ضرورت ہے۔ معمولی ڈبریوں سے لیکر برقالوں (Electric generators) تک مختلف اشیاء کے نمونوں کے نقشے کھینچنا اور بات ہے اور ان کو عملی طور پر ڈھالنا اور بات۔ جب تک نقشے یا نمونے حقیقی صورت میں نہ بنائے جائیں انکی

کوئی قدر و قیمت نہیں۔ عام طور پر طالب علم اس سے بھی ناواقف ہوتا ہے کہ آیا اس کے نقشے یا نمونے کار آمد بھی ہوسکتے ہیں یا نہیں کیونکہ اس کو اس کی جانچ کا موقع ہی نصیب نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے اگر اس کو یہ معلوم ہو کہ جس چیز کا وہ نمونہ یا نقشہ کھینچ رہا ہے اسکو عملی طور پر بنایا بھی جائے گا تو نقشوں کا برا یا بھلا ہونا فوراً ظاہر ہو جائے گا۔ دارالتجربہ میں اس کا امکان ہے کہ کسی چیز کے غلط تجزیہ پر نظر نہ پڑے لیکن جب اس کو سانچہ میں امتحان کی خاطر ڈالا جائے گا تو غلطی ظاہر ہو جائیگی۔ اگرچہ یہ غلطی بعد از خرابی بسیار و نقصان زر بے شمار کے مصداق ہو۔ اس قسم کی مثالیں بکثرت ملسکتی ہیں جہاں کافی خسارہ اٹھانے کے بعد غلطی کا اظہار ہوا۔ اس طرح اس معرکتہ الآرا مسئلہ میں اب کسی قسم کا شبہ نہیں معلوم ہوتا کہ تعلیم انجنیرنگ کی بہترین صورت یہ ہے کہ طالب علم نظری و عملی تعلیم ساتھ ساتھ جاری رکھے اور اسکو کافی سوچ بچار کا موقع دیا جائے اور پھر موجودہ فائدہ رساں تجارتی طریقوں سے اپنا کام جاری کرے۔ کاریگر کی دوربین نظر ہی ان تمام بے شمار چھوٹی بڑی چیزوں سے آشنا رہتی ہے جن کو نقشہ نویس، ڈرافٹسمن، تخمینہ نگار اور دوسرے کارکن نظرانداز کر دیتے ہیں۔

ایک اور بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ بہتیرے کالجوں میں کاروبار کے خالص تجارتی پہلو پر اہمیت نہیں دیجاتی سوائے ان خاص خاص جماعتوں کے جو اس مقصد کیلئے جاری کی گئی ہیں فقط

(ترجمہ) محمد نذیر الدین

ننّا سا مریض

ایک جاپانی اسپتال میں

۱

...... جھٹپٹے کے وقت ایک آخری مریض لایا گیا ۔ یہ کوئی تین چار سال لڑکا ہے جسے نرسوں اور سرجنوں نے میٹھی میٹھی باتیں بنا کر نہایت خندہ پیشانی سے ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ لڑکا اس خیر مقدم پر خاموش ہے ۔........

یہ ڈرا ڈرا اور روٹھا ہوا ہے، روٹھنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے آج کی رات اسپتال کیوں لایا گیا کیونکہ چند نادانوں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ تھیٹر چل رہے ہیں۔ جس سے سارے راستہ یہ باغ باغ رہا ۔ یہاں تک کہ اپنے ہاتھ کا دکھ بھول گیا ۔ مگر اسپتال تو تھیٹر نہیں! یہاں قدم قدم پر ڈاکٹر ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر جو لوگوں کو دکھ دیتے ہیں ۔.........

بیچارے نے کپڑے اتروا کر چپ چاپ معائنہ بھی کرا دیا ۔ مگر جب یہ کہا گیا کہ بجلی سے جگمگاتی ایک نیچی سی میز پر بھی لیٹ جاؤ تو اس نے نہایت پرزور لہجہ میں "ایا"[1] کہدیا ۔........

بزرگوں سے یہ بات اسے ورثہ میں ملی تھی اور اس پر اسے یقین تھا کہ ایک کھلے دشمن کے آگے لیٹنا درست نہیں! اور اسی غیبی بصیرت کی بنا پر سرجن کی مسکراہٹ اسے کھلا دھوکہ معلوم دیتی تھی ۔

---

[1] "نہیں" ۔

ایک نوجوان نرس نے بہلاتے ہوئے یوں گلفشانی کی:۔
"اے اس میز پر لیٹنے سے بڑا آرام آتا ہے!......... میاں، تمنے آہا کالا لال لال چادر ابھی دیکھا!........."
اس جاپانی چھیڑ سے ننھے منے آدمی کے پتنگے لگ گئے۔ چنانچہ پھر اس نے "ایا!" دہرادی یہاں دو سرجنوں اور دو نرسوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے نہایت صفائی سے اٹھالیا اور لال چادر سمیت میز پر جالٹایا۔ جہاں ننھا منا اعلانِ جنگ کر کے اس نے اپنی نسلی جنگ آزمائی کی داد چاہی اور کہنے کو بانہہ ٹوٹی ہوئی تھی مگر اس پر بھی دوسرے حکم تک خوب داد شجاعت دی۔
لیکن ذرا دیکھئے گا! ایک گیلا سفید کپڑا منہ اور آنکھوں پر رکھتے ہی گڑبڑ ختم ہوگئی ____ نتھنوں میں ایک عجیب بھینی بھینی خوشبو پہنچی، ساتھ ہی آواز اور چراغ دُور دُور نظر آنے لگے، حتیٰ کہ ایک اندھیرے سمندر میں بیچارا وسدم ڈوبنے لگا.........
ننھے منے ہاتھ پیر شل ہوکر بے دمے ہوگئے پھیپھڑے موت کی سی سُن کرنیوالی بے خبری سے آخری مرتبہ لڑکر تھکے۔ جس سے دم کے دم کچھ سانس سا پھولا۔ مگر اس کے بعد ساری بے چینی ختم تھی.........
کپڑا اٹھایا تو پھر وہی پیارا پیارا مکھڑا نظر آیا، جس پر غم و غصہ کی بجائے موت کی دیوی کی سی مسکراہٹ تھی.........
ٹوٹی ہوئی ہڈی کے صفائی کے ساتھ فوراً جوڑ ملا دئے گئے۔ بندھن، روئی، پیرس کا پلاسٹر اور پھر اوپر سے اور بندھن غرض مشاق ہاتھوں نے جلدی جلدی سارے مرحلے طے کر دئے۔ اسپنج سے منہ اور ننھے ہاتھ دھلائے۔ اور پھر ننھے سے بے ہوش مریض کو بلانکٹ اڑھا کر میز سے ہٹالیا...... لانے سے لیجانے تک کی یہ ساری باتیں صرف ساڑھے بارہ منٹ میں پوری ہوگئیں۔
ہر وہ چیز جو پہلے پہل دیکھی جائے معمولی نہیں ہوتی۔ اس واقعہ کی ایسی تفصیلات جو سچ مچ دلکھیاری نہ تھیں ____ مثلاً آواز کا تھک جانا، ارادہ کا سن ہوجانا اور ساتھ ہی سند رکھڑے کی سکوت آمیز بدرنگی ____ تو انہوں نے اس المناک واقعہ کو ایسے رنگ میں رنگ دیا کہ تخیلہ بھی

تاریک راہ پڑ کر چپکے ٹوئیاں مارنے لگا۔......یوں گجی مارکبھی بعینہٖ یہی سکون اور مہنس مکھ آرام کے نتائج پیدا کر دیتی۔ چنانچہ اگلے زمانے میں بیسیوں دفعہ ایسا ہوا ہے۔ او بیسیوں مرتبہ عقہ کی ایک ضرب سے کسی کے پیارے پن پر موت کی زردی گھنڈ گھنڈ گئی ہے۔.........

"پھر یہ نندڑیاں اسوقت تک جاگیں اور نہ جگائی جائیں گی جب تک کہ یہ زمین و آسمان ہیں۔" ہاں تو" "جب تک کہ یہ زمین و آسمان ہیں" مگر اس کے بعد! اس کے بعد شاید جاگیں تو جاگیں لیکن اس وقت بھی پہلے کی طرح نہیں۔.........

میں نے دیکھا آپے (Self) کے یوں یکا یک لاچار ہو جانے پر مجھے تاثر سے زیادہ تعجب ہوا۔ کیونکہ اس طرح ایک راز فاش ہو گیا۔ یعنی یہ کہ پلک جھپکاتے ایک کیمیائی لٹکے نے آواز، حرکت، فکر، ارادہ ساری لذت و الم اور یاد غرض سب کو بیٹ دیا۔ احساسات کی کلیوں کی ساری بہار چھن گئی ننھے منے دماغ کی نازک شین پر جو نہ جانے کتنے بڑے بوڑھوں کے ورثہ سے مالامال ہوتی چلی آ رہی تھی موت کی خاموشی چھا گئی۔ اور اب وہاں دیکھئے تو جسد خاکی کا تو دہ لایعنی ______ گوشت پوست کی ایک گڑیا پڑی رہ گئی جس کے لبوں پر مورتی کی سی ہلکی ہلکی انجان مسکراہٹ تھی۔.........

گوتم بدھ کی پتھریلی اور ننھی منی مورتیوں کے مکھڑے جو سڑک کے آزو باز و یا مزاروں پر مست خواب دکھائی دیتے ہیں، جاپان کے بالکل بھولپن کے نمونے اور وہاں کے نند اسے مکھڑوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ ان کی بالی آنکھ ناک کا موہن پن اور ہونٹ اور پلکوں کی لکیروں میں پیار کی تحریر سمجھنے کے لئے ضرور ہے کہ آپ نے جاپان کے نند اسے بالک دیکھے ہوں۔ کیونکہ بدھ سنگ تراشوں کے ہاں یہ بات فن میں داخل ہے کہ وہ الٰہی شانتی کو ایسی موہوم مسکراہٹ سے ہی اجاگر کرتے ہیں، جو اس بھومی ولاوروں کی نندیا سندر بنا دیتی ہے۔

۲

ان مورتیوں کی یاد سے فطرۃً مجھے وہ قوتیں یاد آگئیں، جن کی یہ صرف نشانیاں ہیں اور سانچہ ہی

مجھے خیال ہوا کہ ایک خدا کے تصور میں انسان کی زندگی کا سارا زمانہ بالکل اس واقعہ کا سا ہی ہوگا، جسے میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے ——— یعنی آنا، رونا، ہاتھ پیر مارنا اور پھر اچانک موت کی اٹل بے خبری میں آپڑے کو میٹ دینا! (یہاں خدا سے میرا مطلب وہ خدائے عالمین نہیں جس کے آگے سورج کا روشن ہونا اور گل ہو جانا ایسا ہی جیسے ہم نے رات میں جگنو کی جھلک دیکھ لی۔ بلکہ میرا مقصود ایک ارضی خدا سے ہے) بقول ہربرٹ اسپنسر جب مچھر کا ننھا منا شعور ایک سکنڈ کے دس اور پندرہ ہزارویں حصے کی درمیانی کیفیت معلوم کر لیتا ہے، تو پھر ایک ایسی ہستی کے نزدیک جو روحانی لحاظ سے انسان سے اتنی ہی اعلیٰ و افضل ہو جتنا انسان مچھر سے ہے، تو کیا ایک لپشت کا زمانہ ایک لمحہ کے برابر نہ دکھائی دیگا؟ کیا ایسی ہستی کے آگے انسان کا وجود و عدم کلی کا کھلنا اور مرجھانا نہیں؟ ——— یعنی بننے اور بگڑنے کا ایک لامتناہی اور ناگزیر سلسلہ یا مادہ کے خمیر کی ایک عجوبہ کاری جو ایک ٹھنڈے سیارے کی سطح سے مخصوص ہے؟ واقع میں اگر یہ ہستی بھی اس مظہر قدرت کا یوں تفصیل وار مطالعہ کیا کرتی جس طرح ہم مادہ کے خمیر کا مطالعہ دوربینوں سے کرتے ہیں۔ تو اسے ایک معصوم کی ہنسی فوراً ایک کھوپڑی والے قہقہہ میں مبدل ہوتی نہ نظر آتی، اور بصورت ثانی تو میں خیال کرتا ہوں، ایک پھول سے بالک کی پہلی مسکراہٹ سے لیکر اسکی کھوپڑی کے آخری مرتبہ مایوسانہ دانت نکوس دینے تک کے درمیان جو کچھ نفسیاتی طور سے پیش آتا ہے، وہ سارا کا سارا اس ہستی کے آگے ایسا ہی موہوم رہ جاتا ہوگا جیسا ایک سکنڈ میں مچھر کے دس پندرہ ہزار مرتبہ پر مارنے کو ہم موہوم سمجھتے ہیں۔ مجھے اس بات میں شبہ ہے آیا ایک پورے نظام یا ایک ہی دنیا کے خدا کو ہمارے جذبات سے اس سے زیادہ لگاؤ ہے۔ جتنا سڑے ہوئے پانی کی ایک ننھی منی بوند میں کی سننی خیز زندگانی سے ہمیں ہوتا ہے.........

لیکن پھر سوال یہ ہے، آخر انسان ہے کیا شئے؟ جو ایک خدا کی نظروں میں صرف اسواسطے مٹی سے ابھرتا معلوم دیتا ہے کہ پھر مٹ جائے اور یوں مٹ جانے سے پہلے دم کے دم اپنے ہنسنے رونے کا تماشہ بھی دکھا دے؟......... ایک جسد خاکی! جو برسا برس ہوئے، بے شکل و صورت مادہ کے نقطۂ تخلیق سے صبح ازل کی روشنی میں پیدا ہوا! مگر ارتقاء کی یہ تعلیم کسی طرح بھی اصل زندگی کی پہیلی نہیں بوجھتی ——— زندگی

ایسی پہیلی جو احساسات کا گورکھ دھندا ہے۔ اور جو برسا برس سے موت کا مقابلہ کر رہی ہے۔ بلکہ یہ کہئیے کہ موت کے ہرانے کی ٹوہ میں روح و مادہ کی عجیب و غریب گتھیاں ڈال رہی ہے۔ اور جس نے بالآخر آج اس طرح اپنے وجود کی ابتدائی عمر کو سو سال تک ٹپا ہی لیا!

انسان کی یہ احساسی صلاحیت بجائے خود ہزار ہا پہیلیوں کی ایک پہیلی بن گئی ہے۔ خیال کے متعلق بھی اب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ احساس کا مجموعہ ہوتا ہے۔ لیکن خود ایک معمولی سی معمولی حس بھی مجموعہ یا کسی ترکیب کا نتیجہ ہوا کرتی ہے ——— جسے غالباً امتزاج کا تصادم یا اتحاد کی چمک کہا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح پھر زندگی کی پہیلی ڈراؤنی اور ایسی مبہم رہ جاتی ہے کہ جس کی بوجھ ہی نہیں۔

اسی رازِ حیات سے ڈر کر ہمارے باپ دادا نے بالآخر یہ پاس بھرا حکم لگایا اور گویا ہماری جان بچائی تھی کہ :—

"بیٹا! سر دیجیو، آگ میں جل بھن کر بھسم ہو جائیو، مگر للہ، سوچیو نہیں!"

مگر پچھم کے ایک بڑے بوڑھے کی منادی بھی سن لیجئے :—

"اے تو کہ دنیائے ہستی کے فرزند! اس بات کے بچار سے مت گھبرا کہ تو کہاں سے یوں ابھر آیا! اس آتما کے بچار سے جس سے تو پیدا ہوا اور جس میں پھر ایک دن ملنا ہے تجھے اپنی ہستی قدیم، واحد اور غیر محدود نظر آئے گی!" ....

سیّد وزیر حسن

اعتذار رسالہ کی اشاعت میں اس مرتبہ تعویق اس وجہ سے ہوئی کہ اسکی طباعت کے مسئلہ کو نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے اپنے ہاتھ میں لیکر بغرض منظوری مجلس انتظامی جامعۂ عثمانیہ میں پیش فرما دیا تھا۔ اب اورئینٹل دارالطبع جامعۂ عثمانیہ میں طبع ہو کر مدیر کے مکان سے حسب دستور شائع ہوا کریگا۔ خدا سے امید ہے کہ آئندہ رسالہ کے ہر شعبہ میں ناظرین کو ترقی نظر آئے گی۔

ایڈیٹر

یادِ ایّام

قدردانِ دیور

بھائی پنجتن نے اولڈ بوائے میں چند سطریں لکھ کر ایّامِ گذشتہ کی یاد تازہ کی ہے۔ خصوصاً پوسٹ مین کے نعلدار جوتوں کی آہٹ پر کانوں کے لگے رہنے نے آپ کو بھی کافی محظوظ کیا ہوگا "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" اسی طرح فیرینی اور کھچڑی کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ دن کہاں رہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ خود بھائی پنجتن کے کان پوسٹ مین کے نعلدار جوتوں کے بجائے شاندار موکلوں کے بے نعل بوٹ یا مفلس موکلوں کے ننگے پیروں کی آہٹ پر لگے رہتے ہوں گے (بھائی اصغر و بھائی عسکری وغیرہم بھی برا نہ مانیں) اُن پر کیا موقوف ہے ہم سب کے نہ وہ کان ہیں اور نہ وہ کانوں کا مرکز باقی ہے "آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند" نہ وہ دل ہے نہ وہ جوش و خروش ہے۔ نہ وہ ذوق ہے نہ وہ شوق ہے کہ زردہ اور فیرینی والا جمعہ کا دن آیا کہ وقت سے پہلے تیار ہو کر ڈائننگ ہال کے دروازے کو کھٹکھٹانے جا پہونچے' یا پلاؤ والا پیر اور بدھ کا دن آیا کہ مانیٹروں سے عہد و پیمان ہونے لگے' یا آموں کا موسم آیا کہ بقول پنجابی بھائیوں کے میٹھی کڑہی (گڑانبہ) کے شوق میں بھوک تیز ہونے لگی۔ وہ ہمت اور جرأت کہاں کہ صحت اچھی خاصی ہے مگر بیمار بننے کا شوق ہے۔ طرح طرح کی اسکیمیں بیمار بننے کے لئے زیرِ غور ہیں کہ کسی طرح مصنوعی بیماری حاصل ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب صداقت نامہ عنایت فرماویں اور ہم لوگ پرہیزی کھانے کا لطف اٹھائیں وہ اتحاد کہاں کہ جس وقت مرج آئی متفق ہو کر فوج کی فوج نے آم کے باغ کی طرف چڑہائی کر دی اور چشم زدن میں میدان صفا چٹ ہو گیا۔ وہ جگرا اور کلیجہ کہاں کہ کسی والیٔ ملک یا رئیس کے لئے گارڈن پارٹی دیجائے اور ہم پہنچکر ڈٹ جائیں پیٹ بھر جائے تو جیبوں کو کام میں لائیں اور دن ڈہارے بلا کسی خوف و خطر کے ڈاکہ زنی

کارِ مرداں

از جناب آزاد سہارنپوری

محبت کارِ مرداں خدا معلوم ہوتی ہے
یہ عزت عزتِ ہر دوسرا معلوم ہوتی ہے

ابھی سے تنگ آ کر آرزو کے دمبدم شکوے
ابھی تو آرزو کی ابتدا معلوم ہوتی ہے

خدا حافظ دلِ بے صبرِ الفت کا خدا حافظ
مری الفت بہت صبر آزما معلوم ہوتی ہے

نظر تو کر کہ اسکی آن کیا عالم دکھاتی ہے
خبر تو ہو کہ اُسکی شان کیا معلوم ہوتی ہے

مرے شوقِ سزا کا خوفناک آغاز تو دیکھو
کسی کا جرم ہو اپنی خطا معلوم ہوتی ہے

بس اب بے چارگی سے صلح کر لینی مناسب ہے
کہ اب بیچارگی اُسکی رضا معلوم ہوتی ہے

مری گم گشتگی کیا دیکھتے ہو ۔ بلکہ یہ دیکھو
مری گم گشتگی کس کا پتا معلوم ہوتی ہے

تمھاری بزم کو دامانِ دخلِ شرع پاتا ہوں
تمھارے سامنے مے نوشی خطا معلوم ہوتی ہے

وہ میری زیست جس سے ہر مسرت کی توقع تھی
غمِ نا مختتم کا سلسلہ معلوم ہوتی ہے

کبھی ہستی عالم اصل پر مبنی سمجھتا ہوں
کبھی بالکل نمودِ سیمیا معلوم ہوتی ہے

ضرورت ہے کہ پھر کوئی بڑا انساں پیدا ہو
کہ پھر انسانیت بے دست و پا معلوم ہوتی ہے

بس آزاد اب جو دیں کا خاتمہ سمجھو
طبیعت دشمنِ ہر ماسوا معلوم ہوتی ہے

کاریگروں اور میکانکل انجنیروں کی ضرورت

کسی قوم کی دولت و خوشحالی زیادہ تر اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ اس قوم کے افراد کس قدر کام کرنے کے عادی ہیں وہی پودا پھولتا اور پھلتا ہے جس کی جڑیں فراہمی غذا کی جد و جہد میں سخت سے سخت زمین میں راستہ نکال لیتی ہیں۔ اسی طرح وہی قوم سرسبز و شاداب ہوسکتی ہے جس کے افراد سخت سے سخت حالات کے تحت اپنی ترقی و بقاء کا راستہ پیدا کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں کسی قوم کی رفعت اور اسکی ترقی کا معیار اسکی صنعتی و تعمیری جد و جہد ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں بھی اب بیداری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ ہندوستانی اپنی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھ کر بتدریج اپنے انفرادی مطالبات میں اضافے کرتے جارہے ہیں۔ اس قسم کے انفرادی مطالبات کے پورا ہونے سے دنیائے انجنیرنگ کی ترقی کی وسعت بھی متعین ہو جاتی ہے۔ اگر لوگ جہاں ہیں وہیں رہنا چاہیں تو انجنیرنگ بھی جہاں ہے وہیں رہیگی لیکن اس سے اس اہم ترین قانون قدرت کی تکذیب ہوتی ہے جو قانون ارتقاء کے نام سے موسوم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قانع ترین اور سادہ ترین انسانوں میں بھی زندگی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کا طبعی میلان و جذبہ پایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مدت سے سیول انجنیر پیدا ہو رہے ہیں جنہوں نے ہندوستان اور ممالک متمدنہ میں تعلیم پائی اور بالکلیہ ہندوستان ہی میں تجربہ حاصل کیا اور اپنی خدمات سے مادر ہند کو فائدہ پہنچایا اور پہنچا رہے ہیں۔ ان خدمات کی اہمیت اور وسعت اظہر من الشمس ہے اور اسلئے یہاں ان کی توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں۔

مرتکب ہوجائیں۔ بھائی منظر۔ اب وہ آزادی اور خودمختاری کہاں نصیب۔ جب تو یہ عالم تھا کہ جو جی چاہا کیا۔ ارتکاب جرم کے بعد بھی آزادی قائم تھی لیکن اب تو اگر ایسا کیا جائے تو اسکے سوا کوئی چارہ نہو کہ سرکاری مہمان بننا اور مشقت کی زندگی بسر کرنا پڑے۔ پبلک پارٹیز کا تو کیا ذکر پرائویٹ پارٹیز میں بھی اب وہ شان نظر نہیں آتی ہاں استثنیات ہر ایک قاعدہ کلیہ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ملک خدا تنگ نیست بھی آپ نے سنا ہوگا۔ اکا دکا کہیں اب بھی ایسے مرد میدان موجود ہیں جو اچھے شعر کی طرح اچھے کھانے پر بھی تڑپ جاتے ہیں دور کیوں جاتے ہیں آپ ہی کے اڑوس پڑوس میں دو چھوٹے بڑے بھائی کالج کے اولڈ بائز موجود ہیں جن میں سے اول الذکر چھوٹے بھائی سب انسپکٹر آبکاری اور ثانی الذکر بڑے بھائی فوجی عہدہ پر فائز ہیں (گلاب جامن۔ لاحول ولاقوۃ) چھوٹے بھائی صاحب کا رنگ یہ ہے کہ اگر نہ ملے تو غم نہیں اور اگر ملجائے تو اچھے کھانوں کے ساتھ بہترین سلوک اور انصاف کرتے اور کھلانے والے کے ساتھ اعلیٰ ترین خلوص اور محبت رکھتے ہیں۔ میرا عینی مشاہدہ ہے کہ بڑے بھائی کے یہاں دعوت ہوئی بھابی جان نے انتہائی شفقت کام میں لاکر دیور کے لئے چٹپٹے سیخ کی کباب تیار کئے۔ دسترخوان بچھا تھا اور کبابوں کا آنا تھا کہ باوجود کافی انسانیت کے (خدا ہر بلا ہر آفت سے بچائے) دسترخوان کی مکھی بن گئے' اور ڈٹکر اتنے کباب کھائے کہ مجبورًا چت لیٹنا پڑا۔ حالت یہ ہوی کہ تعریفی الفاظ اور خوشی کی ہی ہنسی کے قہقہے بھی پھنس پھنسکر منہ سے نکلنے لگے۔ کسی واعظ نے بھی شاید جنت کی اس قدر تعریف عمر بھر میں نہ کی ہوگی' جتنی اس قدردان دیور نے اپنی شرافت سے ایک رات میں مدح خوانی کی۔ نوبت بایں جا رسید کہ دوسروں کو بھی تعریف کے لئے مجبور کیا گیا اور ایک حاضر الوقت ثالث حلال سے بھی فرمایش کی گئی کہ کچھ مدحیہ اشعار نظم کئے جائیں۔ اب آپ ہی خیال کیجئے کہ نظم کا کہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کھانے سے بیشتر اگر فرمایش کیجاتی تو ممکن بھی تھا کہ امید میں کچھ اچھے شعر نکلتے۔ ڈٹکر کھا چکنے کے بعد اول تو منہ سے بات نکلنا مشکل تھا دوسرے یہ کہ تعریف کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی' اسلئے کہ تعریفی اشعار سے مکرر کبابوں کے آنے کی کیا امید ہوسکتی تھی بہرحال زید قاصر اور عذر کرتا رہا مگر کوئی معذرت مقبول نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ الٹیمٹم دیدیا گیا کہ اگر نظم نہ لکھوگے تو لڑائی ہوجائیگی' اور آئندہ دعوتوں میں شرکت کا موقع نہ دیا جائیگا۔ مجبورًا بادل ناخواستہ کانکھ کانکھکر کچھ اشعار

نکالے گئے، اور نذر کر دئے گئے۔ کچھ شعر ابتک کمی بیشی کے ساتھ یاد ہیں جو بطور نمونہ بلا تغیر یا اصلاح کے ناظرین اولڈبوائے کے ملاحظہ کیلئے درج کئے جاتے ہیں تاکہ اُن کو پڑھکر اس قدر فطری اور ذوقِ سلیم کا اندازہ فرمایا جاسکے۔

مجھکو بھابی نے کھلائے جو مزیدار کباب
رشک سے جلکے ہوئی جاسد اغیار کباب

بڑھکے تھی زلف معنبر سے بھی خوشبو انمیں
نقشہ کاکل پیچاں تھی گرہ دار کباب

پیاز کتری تھی کہ شفاف بندھا تھا سہرا
پہنکر آئے تھی یا تاج گہر بار کباب

منتشر زلف پریشاں کیطرح ایک تھی انمیں
خندہ زن جاکے بنا گل کیطرح جار کباب

ایک تشبیہ تھی عالم کی نمایاں انمیں
روز روشن تھی اگر پیاز شب تار کباب

گر شکم پور نہ تھے وہ تو شکم پرور تھے
کیوں نہ ہو تے سبب لطف دل زار کباب

تپش آتش الفت میں پکایا ہے انھیں
کیوں نہ ہوں چشم محبت کیلئے سزاوار کباب

کیا کروں بھابی کی احسان فراواں کا بیاں
کم پکانے کو کہا پک گئے بسیار کباب

اب میں جب ملتا ہوں بھابی سے کہا کرتا ہوں
اور کھلوائیے بھابی مجھے اک بار کباب

"وفا"

اولڈ بوائز

۱۔ اتحاد بین الملل کی ضرورت جیسی اِن دنوں محسوس کی جا رہی ہے کبھی نہیں ہوئی۔ اتحاد کانفرنس شملہ کے موقع پر ہمارے برادروان میں سے مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر کچلو وغیرہ نے سر توڑ کوشش کی مگر کانفرنس ناکام ثابت ہوئی۔ اس موقع پر علیا حضرت سرکار عالیہ بھوپال، اور ہز ہائینس نواب سکندر صولت بہادر نیز ہز ہائینس مہاراجہ صاحب بہادر الور نے بطورِ خاص توجہ فرمائی تھی، مگر جہاں گائے اور باجے پر قومیت کا مدار ہو، وہاں قومی زندگی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ ہندو مسلمان بزرگوں کے شیر و شکر رہنے کے واقعات ابھی ہماری نگاہوں میں ہیں، اور ایسے حکایات کی صدا ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے جن کے ذریعہ شادی و غم میں ایک دوسرے کی شرکت ضروری قرار پا جاتی تھی۔ ان واقعات و حکایات میں سیاست کو مطلق دخل نہ تھا، اور محبت و رواداری ہمارے پیشِ نظر رہا کرتی تھی۔ امن و امان کی خاطر اتحاد بین الملل کی ضرورت تو ہز ایکسلنسی لارڈ ارون محسوس فرماتے ہوں گے، ہمیں تو ربط و محبت کی غرض سے ملک کی دو معظم قوموں کے اتفاق کی خواہش ہے۔ ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال قابلِ مبارک باد ہیں کہ گزشتہ دسہرہ کے موقع پر مع ارکان اشاعت شرکت فرما ہو کر اس تیوہار کو زینت بخشی۔ ہز ہائینس کے مندر میں پہنچنے پر ہندو معززین نے ہار پہنائے، اور سپاسنامہ عقیدت پیش کیا۔ آمد و روانگی کے مواقع پر تقریباً دس ہزار کے مجمع نے جے کے نعرے لگائے۔ ہماری خواہش ہے کہ دوسرے حصصِ ہند میں بھی اسی تقلید کی جائے، اور دونوں ایک دوسرے کی تقاریب میں ضرور شرکت کرتے رہیں۔

۲۔ تھوڑے عرصہ سے ہم اس امر کو بیّن طور پر محسوس کر رہے تھے کہ نواب فخر یار جنگ۔ بین داخلی

تغیر واقع ہورہا ہے اور وہ مشاہدۂ فطرت کے بجائے مجاہدۂ نفس کے لئے ساعی ہیں۔ کسی شخص کو یہ بات حاصل ہوجائے تو وہ انسان بنجاتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ بیرونی کشاکش اور مشاغل کی کثرت کے باوجود ہمارے برادرِ کرم ہجومِ شوق میں کعبۂ دل کو لیکر مکہ، مدینہ اور خدا معلوم کہاں کہاں پہونچے۔ حجاز، شام اور عراق وغیرہ کے سفر کی آرزو پوری ہوئی، تو ۲۰ ربیع الآخر کو صبح کے آٹھ بجے وارد حیدرآباد ہوئے۔ اس موقع پر کاچی گوڑہ اسٹیشن بیرقوں سے خوب سجایا گیا تھا، نیچے چاندنی کا فرش تھا۔ "حج مبارک" کے الفاظ بطور خاص نمایاں تھے۔ تقریباً ہر سررشتہ وصیغہ کے اعلیٰ عہدہ داروں سے لے کر چھوٹے ملازمین تک موجود تھے۔ ٹرین اسٹیشن پر پہنچی تو احباب نے نرغہ میں لے لیا۔ ان کی ہر دلعزیزی اس قدر غالب تھی کہ ہر شخص مصافحہ کی کوشش کرتا تھا اور اگرچہ اس باب میں ہمارے بھائی بھی بہت سخاوت سے کام لے رہے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ ہزاروں کے مجمع کا کامیاب ہونا مشکل تھا۔ تقریب پذیرائی پر آپ کے احباب نے اس قدر ہار پہنائے کہ ناقابلِ برداشت ہوگئے، بلکہ کہتے ہیں کہ موٹر بھی پھولوں کے بار سے بوجھل ہوگئی۔ انجمن خادم المسلمین کے اہتمام نے نظم پڑھی ایک صاحب نے عربی قصیدہ سنایا، مسٹر مقصود احمد خاں نے تبریک نامہ پیش کیا۔ ان سب پر اظہار پسندیدگی فرماتے ہوئے، مسٹر فخر الدین احمد خاں اپنی موٹر تک پہنچے، اور گھر پہنچکر ہم سے مل کر پرانے ہوگئے۔

۳۔ یہ خبر سارے ملک میں مسرت کے ساتھ سنی گئی کہ ہز ہائینس مہاراجہ صاحب بجاور نے قاضی عزیز الدین خاں بہادر کے خلف الرشید قاضی امیر الدین صاحب کو اپنی ریاست کا دیوان مقرر فرمایا ہے۔ ہمارے بھائی اب تک صوبہ جات متحدہ میں سپرنٹنڈنٹ (مہتمم) ڈاکخانہ جات تھے، اور اب اپنے عم مرحوم قاضی خلیل الدین خاں بہادر کا منصب حاصل فرمایا ہے۔ اس مسرت بار موقع پر جناب بیاض خیر آبادی نے اپنے قطعہ میں مادہ تاریخ خوب نکالا ہے، فرماتے ہیں!

وزیر راجہ بجاور امیر خوش اقبال

۴۔ مسز سروجنی نائیڈو ایک مدت تک سیاسی فضا میں رہنے کے باعث خستہ حال ہوکر تھوڑے عرصہ کے لئے گھر میں بیٹھیں تو یہاں بھی اُن کے دماغ نے چین نہ لیا، اور اس ملک کی آب وہوا کے مناسبِ حال مقامی شعرا کو مجلس مشاعرہ گرم کرنے کا بلاوا دیدیا۔ مسٹر محمد اصغر، مسٹر شبیر حسن خاں جوش

مسٹر علی احمد اختر، مسٹر آغا حیدر اور مسٹر سید غلام پنجتن شمشاد ایم ایس سی زینت تھے۔ خاص انداز میں مسٹر آغا حیدر اور حضرت شمشاد کی داد کالج کے مشاعروں کو یاد دلا رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ جناب جوش کا کلام بہت سرسبز ہوا، اور پردہ والیاں بھی جوش میں آکر شاعر کی حوصلہ افزائی اپنی برمحل داد سے کرتی رہیں۔ مسٹر محمد اصغر کے دور افتادہ احباب خوش ہوں کہ اُن کے ایک بھائی کا انتخاب ایک بار اور حیدرآباد کی مجلس وضع قوانین کی زینت کے لئے ہوا ہے۔

۵۔ نواب ولی الدولہ بہادر کی دختر نیک اختر اور ہمارے برادر عزیز محی الدین خاں بہادر کی ہمشیر جناب حشمت النسا بیگم صاحبہ کی شادی بتاریخ ۷ ربیع الآخر روز دوشنبہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ایوان ولایت منزل بیگم پیٹھ میں نواب معین الدولہ بہادر کے فرزند ظہیر الدین خاں بہادر کے ساتھ سوا لاکھ روپیہ اور پانچ دینار سرخ مہر پر ہوئی۔ دولہا اور دلہن دونوں کی جانب سے اس موقع پر بڑی حوصلہ مندی سے کام لیا گیا، اور جانبین سے کئی لاکھ کی رقم خطیر صرف کی گئی۔ خدا دونوں کو مبارک کرے۔ فطرت سادگی پسند ہے اور کیا اچھا ہو کہ ایسے مواقع پر مسلمان فطرت کا لحاظ کرتے رہیں۔

۶۔ ۲۰ ربیع الآخر کو ہمارے بھائیوں میں سے بھی ایک نے اپنی شادی رچائی تھی یعنی مسٹر عبدالسلام ایم۔اے، جن کو علیگڈھ چھوڑے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا، دولہا بن کر مولوی فیاض الدین صاحب وکیل کی دختر کے ساتھ شادی کرنے چلے تو اُن کے احباب اولڈ بوائز کی ایک برات اُن کے ہمراہ تھی، اور رسم پذیرائی میں بھی اُن لوگوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ ہم خوش ہیں کہ ہمارے بھائی اب متاہل زندگی میں داخل ہو گئے ہیں۔ ثمر آرزو کی تمنا انھیں ضرور ہوگی، اور ہم بھی اُن کی اس آرزو میں شریک ہیں۔

۷۔ اولڈ بوائز ڈائرکٹری کے لئے برادرم مسٹر شمس الحسن زبیری (فتح آباد) نے ہمیں اپنے حالات روانہ کئے تھے جن کو ہم اپنی اُس کتاب میں درج کریں گے۔ اُس وقت وہ یہ لکھنا بھول گئے تھے کہ علیگڈھ میں ان کے تفریحی مشاغل کیا تھے۔ ہماری درخواست پر اب انھوں نے مختصر سی تحریر روانہ فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:- پہلے میں مدرسہ میں تقریباً سب کھیلوں سے بھاگتا تھا۔ آخر دنوں میں کھیلنا شروع کیا تھا۔ ہاکی سے مجھے شوق رہا۔ کرکٹ اور ٹینس بھی فرماتا تھا۔ علیگڈھ کی کسی ٹیم میں رہ کر کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا، لیکن اپنی سائیڈ کی ٹیم کا

ممبر رہا، اور برابر چار سال لیگ میچز میں شریک ہوا۔ علمی سوسائٹیوں پر میں نے کبھی احسان نہیں کیا، اور نہ ان کا مرہونِ منت ہوا۔" کیا اچھا ہو کہ دوسرے بھائی بھی جلد اس جانب توجہ فرما کر مجھے منت پذیر بنائیں۔ برادرم صدیق الزماں صاحب کے ہم ممنون ہیں کہ اپنے احباب میں اس تحریک کی اشاعت فرما رہے ہیں۔

۸۔ اکتوبر نمبر پا کر بعض بھائیوں نے خیر مقدم بھی فرمایا ہے۔ ہم رفتہ رفتہ ان تحریروں کو درج رسالہ کرتے رہینگے۔ بلند شہر سے مسٹر منظور حسین اپنی روداد میں تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کو شاید یہ معلوم کرکے افسوس ہوگا کہ میری اہلیہ ثانی کا انتقال ۲۲ مارچ ۳۲ء کو ہوگیا، اور اُس زمانہ سے میری زندگی میں ایک خاص ناکامیابی واقع ہوگئی ہے۔ صحت بھی اچھی نہیں ہے، اور طبیعت مکدر ہے۔ شاید زیدی (بریلی) کو بھی اس واقعہ کا ابھی تک علم نہیں ہے۔ ہمیں اپنے بھائی سے اس غم میں دلی ہمدردی ہے۔ انسان وہ ہے جو صبر کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرے، اور ہم اس کی امید منظور سے بھی رکھتے ہیں۔ زیدی اپنے کام میں مشغول اور مگن ہیں۔

۹۔ سردار سلطان احمد خاں بہادر (گوالیار) کی خاتون محترمہ ایک اپریشن کے سلسلہ میں کلکتہ تشریف لے گئی تھیں، لیکن جانبر نہ ہوسکیں، اور ۸/اکتوبر کو کلکتہ ہی میں انتقال فرمایا۔ ایک روز بعد کلکتہ سے لاش روانہ ہوئی، اور اُسی روز گوالیار میں تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ اس موقع پر بڑی مہارانی صاحبہ اور صاحب رزیڈنٹ کے سوا تمام انگریز و ہندوستانی حکام و خواتین نے شرکت فرمائی۔ مسز لوسی سلطان احمد فنِ نقاشی کی ماہر کامل ہونے کے باعث سارے ملک میں شہرت عام رکھتی تھیں۔ خدا ہمارے برادر محترم کو توفیق صبر عطا فرمائے۔

۱۰۔ ہمیں یہ اطلاع پاکر قلق ہوا کہ برادر مکرم مسٹر عبدالمجید خاں (حیدرآباد) کی نوزائیدہ نواسی نے وفات پائی۔ خدا ماں کو صبر اور نعم البدل عطا فرمائے، اور بعافیت رکھے۔ اسی طرح ہمیں برادر عزیز مسٹر سرور حسین (علیگڈھ) کے سہ سالہ بھانجے کے حیدرآباد میں یکایک حوض میں غرق ہونے کی اطلاع پاکر کمال صدمہ ہوا۔ خداوند عالم بچہ کے والد خواجہ حبیب حسن صاحب اور والدہ کو صبر عطا فرمائے، اور بہتر بدل عنایت کرے۔

۱۱۔ برادر محترم مولوی مرزا محمد بہادر صاحب ارقام فرماتے ہیں:۔ "یوسف سلمہٗ وسط نومبر میں یہاں

پہنچیں گے، مناسب ہوگا کہ خود اُن کے قلم سے اُن کے حالات کا اقتباس حاصل کیا جائے۔ جذبات یاور طبع ہو چکے ہیں۔ کچھ قطعات باقی ہیں۔ عنقریب جلد مکمل ہو جائے گی۔ رسالہ کی مدد کے لئے میں ہر طرح سے تیار ہوں۔

۱۲۔ خان بہادر سردار محمد اشرف خاں صاحب پولیٹیکل ایم۔ بی۔ ای مشہد سے واپس آکر اپنے وطن گجرات میں مقیم ہیں۔ انکی خدمت میں ہم نے رسالہ روانہ کیا، اور ڈائرکٹری کے لئے اُن سے حالات مانگے تو جواب میں ارقام فرماتے ہیں:۔ "میرے حالات بہت سارے ہیں، ایام تعلیم، سروس، آوارگی، گم گشتگی، مایوسی، بیکاری، اور ایک بڑا کام جو پیش نظر ہے۔ آپ کونسے حالات چاہتے ہیں......... آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے اقوال حضرت علی کرم اللہ وجہ لکھے تھے، میرے پاس اس کی دو کاپیاں تھیں، لیکن گم ہوگئیں۔ اس کی ایک اور کاپی مل جائے تو مناسب ہے"۔ ہم اپنے بھائی کے ہر قسم کے حالات کے طالب ہیں، بعض کو ڈائرکٹری میں درج کریں گے، بعض سے اولڈبوائے میں کام لیں گے، اور چند ہمارے سینہ میں محفوظ رہ کر روایات کی شکل اختیار کریں گے۔ بہر طور سب کچھ لکھیں، اور سب بھائی اسکو پیش نظر رکھیں۔

۱۳۔ مسٹر خواجہ منور حسن بی۔ اے (علیگ) نے اپنے عم محترم جناب خواجہ جعفر حسن صاحب مرحوم کے مجموعہ مراثی کو ہمیں بغرض ریویو مرحمت فرمایا ہے۔ یہ مجموعہ "اشعار مرثیہ" کے نام سے حال ہی میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ جناب مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں حضرت خواجہ صاحب مرحوم کے حالات (جو مولوی صاحب کو معلوم تھے) درج کئے ہیں، اور ظاہر فرمایا ہے کہ تقریباً پینسٹھ سال تک مشق سخن فرماتے رہے تھے۔ مجموعہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاموں کے سوا مصنف نے مخمسات و رباعیات پر بھی زور طبع صرف فرمایا ہے۔ ایسے کہنہ مشق استاد کا کلام ہمارے نزدیک ضرور اس قابل ہے کہ ملک میں اس کی قدر کیجائے۔ یہ مجموعہ مراثی خواجہ منور حسن صاحب سے سیف آباد، حیدرآباد دکن کے پتہ پر دو روپیہ میں مل سکتا ہے۔

۱۴۔ اوائل سال حال میں جن لوگوں کو حیدرآباد ہائیکورٹ سے سند وکالت عطا ہوئی ہے، ان میں ہمارے بھائی خلیب محبوب حسین، محمد ولی الدین، اور سید حیدر حسین صاحبان بھی شریک ہیں۔ اسی طرح

مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی کو منصفی و وکالت عطا ہوئی۔ ہم ان سب کی کامیابی کے آرزومند ہیں۔

۱۵۔ برادر عزیز مسٹر منظور حسین نقوی (جالندھر) نے ہم سے خواہش کی ہے کہ ہم ہر بھائی کے نام کے قبل لفظ "بھائی" کا اضافہ ضرور کیا کریں، اور اپنے قائم کردہ دستور قدیم کو ترک نہ کریں۔ ہم اپنے برادر عزیز کے ارشاد کی تعمیل ضرور کریں گے۔

۱۶۔ کہتے ہیں کہ پچھلی دیوالی میں ہمارے برادر بزرگ سید سجاد حیدر صاحب نے اپنی مختصری جماعت کے ساتھ خوب ہولی کھیلی، اور اس طرف کے برادران طریقت یہ کہتے رہ گئے ؎

اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے

ہم اپنے بھائی سے مستدعی ہیں کہ علیگڈھ کے چھوٹے بڑے جلسوں کی روداد ہمارے پاس روانہ فرما دیا کریں، اور دور افتادہ بھائیوں کو بھی اپنے قریب ہی خیال فرما کر اپنی مسرتوں میں غائبانہ شرکت کا موقع دیں۔

۱۷۔ مسئلۂ تعلیم سے ہمارے بھائی حافظ ہدایت حسین خاں بہادر بیرسٹر کانپور کی دلبستگی مسلم ہے۔ اسیطرح ہندو مسلم اتحاد کے لیئے اُن کے مساعی قابل قدر۔ فساد کانپور کے زمانہ میں اُنکا یہ طریق کار لائق صد ہزار ستائش رہا کہ اُنہوں نے ہندو باشندگان شہر کی حفاظت مسلمانوں کے ذریعہ سے کیئے جانے کا انتظام کیا۔ اس موقع پر ہم اپنے بھائی کو محض اُن کے خطبۂ صدارت کے باعث یاد کر رہے ہیں۔ حافظ صاحب نے یہ خطبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ جات متحدہ کے اجلاس پنجم منعقدہ فرخ آباد میں بتاریخ ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۷ء ارشاد فرمایا تھا۔ ہم اُن کے شکرگزار ہیں کہ اُنہوں نے ہمیں بروقت یاد رکھا۔ جو مطبوعہ خطبہ ہمارے پاس آیا ہے اُس سے واضح ہوتا ہے کہ صوبہ جات متحدہ کی کل آبادی (۴۵۳۷۵۰۸۷) کے منجملہ مسلمانوں کی تعداد (۶۴۸۱۰۳۲) یا ۱۵ فیصدی ہے۔ لیکن قدیم تعلیم و تہذیب کے اس گہوارہ میں مسلمان اپنی اوسط کے نصف بھی خواندہ نظر نہیں آتے۔ مغل، جو اپنے دور کے آخر آخر اس سرزمین کے حکمران تھے، فی ہزار (۱۴۵) سے زیادہ اُن میں اب پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اسی طرح سادات جو اسلامی تعلیم و تہذیب کے علم بردار رہے ہیں، فی ہزار (۲۱۰) ہی خواندہ ہیں۔ ان دو موقر جماعتوں کی حالت یہ ہے تو دوسرے مسلمان کس شمار میں ہوں گے۔ اپنے خطبہ کے سلسلہ میں حافظ صاحب نے حکومت برطانیہ کی عنایتوں کا ذکر بھی فرمایا ہے اور ڈسٹرکٹ بورڈ و میونسپل بورڈ

میں کثیر التعداد برادرانِ وطن کے سلوک کا تذکرہ بھی کیا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہو کہ ایامِ گذشتہ میں ثانوی تعلیم پر اپنے ہمسایوں کے پانچ آنہ کے مقابلہ میں مسلمانوں نے صرف پانچ پیسے صرف کئے ہیں۔ معاشیاتی دیہکاموں میں ہماری یہ حالت ہے، اگر یونیورسٹی تعلیم کے بعد اُس کی حالت بھی بیان کر دیجاتی تو اچھا تھا۔ شروع سے آخر تک خطبہ دلچسپ ہے، اور ہم چاہتے ہیں کہ کثرت سے پڑھا جائے۔

۱۸ علیگڑھ کے کھلنڈرے جہاں دس بیس کی تعداد میں جمع ہوگئے، اپنا رنگ جمانا اور رعب گانٹھنا شروع کر دیا۔ حیدرآباد توران مردوں کا میدان، اور ان شیروں کا بیشہ ہی۔ اوائل ماہ نومبر میں سکندرآباد ریس کورس پر کواڈرینگلر کرکٹ کا آغاز نہایت خوبی کے ساتھ ہوا، اور اُس کے خاتمہ میں بھی شادمانی و فتحمندی ہمارے شریکِ حال رہی۔ ابتدائی مقابلہ انگریزوں اور پارسیوں کے درمیان تھا۔ اس میں آخرالذکر کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد مسلمانوں اور ہندؤں کے جوڑ میدان میں اترے، اگرچہ مقابلہ سخت تھا لیکن میدان اول الذکر کے ہاتھ رہا۔ فائنل ایک دن کے وقفہ سے ہوا۔ اب مسلمانوں کا مقابلہ پارسیوں سے تھا۔ اس میں بھی مسلمان بازی لے گئے۔ مسلمانوں کی ٹیم میں آٹھ کھلنڈرے علیگڈھ کے شریک تھے، اور اس الیون کی کپتانی کی عزت بھی علیگڈھ کے ایک کھلنڈرے لفٹننٹ سید محمد حسین کو حاصل تھی۔ کپتان محمود حسن خان نے جنہوں نے پورے کواڈرینگلر میں صدی سے بارہ دوڑیں زیادہ بنائیں، اس موسم کے ہیرو تھے۔ نہ صرف اپنی بیٹنگ کے لحاظ سے، بلکہ بولنگ کے لحاظ سے بھی۔ ان کی بہت سی بونڈریوں کے منجملہ ایک اور باونڈری بھی تھی۔ خود الیون کے کپتان صاحب کی بیٹنگ کی شہرت دور دور ہے، اور ہم نے ایسا محسوس کیا کہ وکٹ کیپنگ میں بھی انہوں نے بڑی مستعدی سے کام لیا تھا۔ مسٹر حمایت اللہ ننانوے کے پھیر میں رہے، مگر موقعہ کو بنا لے گئے۔ ان کی اور باونڈری بھی قابلِ تحسین ہے۔ مسٹر سید محمد ہادی کی بیٹنگ اور فیلڈنگ بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ ہمارے کھلنڈروں میں مسٹر محمود علی سد استثنیٰ ہیں۔ ان کے رنوں کی تعداد نونتیس کے ادھر اُدھر رہی لیکن جتنی دیر کھیلے جم کر، اور شان کے ساتھ کھیلے۔ البتہ مسٹر اصغر علی ٹوگو نے اپنے آخری کھیل میں بڑی پامردی دکھائی، اور کئی باونڈریوں کے ساتھ ایک اور باونڈری کے بھی مالک ہوگئے۔ بھائی کھلنڈروں میں سے لفٹننٹ امیر احمد اور مسٹر فتح خاں قابلِ ذکر ہیں۔ مسلم الیون نتیجہ پر مقررہ انعامات کی

مستحق قرار پائی۔ ہمارے بھائی کپتان محمود حسن خانصاحب نے سب سے زیادہ دوڑوں کے صلہ میں فرینڈز یونین کلب کا نقرئی پیالہ، سب سے زیادہ باونڈریاں بنانے کے صلہ میں سر فریدون الملک کا بیٹ، اور فائنل میں سب سے زیادہ رن بنانے کے صلہ میں ایک دستی گھڑی، اور ایک ریکٹ حاصل کیا۔ ہم کپتان محمود حسن خاں اور الیون کے کپتان لفٹننٹ سید محمد حسین کی خدمت میں اس نمایاں کامیابی پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور متوقع ہیں کہ آئندہ جب کبھی ایسا موقع پیش آئے تو اُس سے مقابلہ کرنے کے لئے اُن کی پوری ٹیم ہر طرح تیار پائی جائے گی۔ نواب بہرام الدولہ کے دو فرزند میر تراب علیخاں بہادر و میر زین العابدین خاں بہادر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ دوران مقابلہ میں نہ صرف اِن کھلاڑیوں کے ساتھ اپنی عملی دلچسپی کا اظہار ہر موقع پر فرماتے رہے، بلکہ تماشائیوں کی مدارت کا بھی خیال رکھا۔

۱۹۔ ہمارے جو بھائی حال ہی میں ولایت سے وطن واپس آئے ہیں اُن میں ڈاکٹر عبدالرحمن، ڈاکٹر جعفر حسین، اور مسٹر سید اعظم الدین حسن قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے اڈنبرا سے طب میں سند تکمیل حاصل فرمائی ہے، اور ثانی الذکر پی۔ ایچ۔ ڈی ہو کر آئے ہیں۔ سید اعظم الدین حسن صاحب نے محاسبی کی سند لی ہے۔ ہم اپنے ان بھائیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں، اور اُمید کرتے ہیں کہ انکی بابت تفصیلات دینے کا ہمیں آئندہ موقع ملیگا۔

۲۰۔ کپتان محمود حسن خانصاحب کو کواڈرنگلر کے موقع پر (۱) مہاراجہ سر یمین السلطنت نے ایک طلائی رسٹ واچ سرفراز فرمائی (۲) نواب سر فریدوں ملک بہادر نے ایک کرکٹ بیٹ عطا کیا (۳) نواب کاظم علیخاں بہادر نے ایک چاندی کا کپ عنایت کیا (۴) فرینڈز یونین نے ایک چاندی کا بڑا پیالہ دیا۔ اور (۵) عبدالغفور وینگادرس نے دو کرکٹ بیٹ نذر کئے۔

قاسم حسن صاحب (مولوی ....) خلف مولوی وزیر احمد صاحب بی۔ اے (علیگ) نواب صاحب مرحوم والی ٹونک کی سلک ملازمت میں مسٹر قاسم حسن کے دادا اور نانا دونوں تھے، اور دونوں کو سر سید احمد خان مرحوم سے ملنے اور ان کے مقاصد سے اثر پذیر ہونے کا موقع ملا، اور پھر تاعمر ساتھ رہا۔ ان بزرگوں کے تقریباً تمام اخلاف، کالج کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوئے۔ مولوی وزیر احمد صاحب، جو کالج میں "ٹونک والا" کے نام سے شہرت عام رکھتے تھے، سید محمود مرحوم کے شاگردان خاص میں سے تھے۔ اسی طرح مسٹر ابن احمد مرحوم (بیرسٹر الہ آباد) کی یاد اب تک بہت سے اولڈ بوائز کے دلوں میں تازہ ہے۔

قاسم حسن صاحب کی ولادت دوشنبہ واقع ۲۳ جون ۱۸۷۹ء کو ان کے وطن بدایون میں واقع ہوئی۔ اردو، فارسی، اور ابتدائی انگریزی گھر پر پڑھی۔ مولوی انعام اللہ صاحب سنبھلی برادر شمس العلما مولوی خلیل احمد صاحب مرحوم اس زمانہ کے اساتذہ میں سے ایک تھے۔ فروری ۱۸۸۹ء میں ہمارے اسکول کی جماعت چہارم میں داخل ہو کر ایف۔ اے تک تعلیم علیگڈھ ہی میں پاتے رہے۔ اس عرصہ میں ایک مرتبہ بریلی، اور ایک بار الہ آباد گئے، مگر دونوں مقامات کی تعلیمی فضا ان کے مناسب حال نہ تھی، اس لئے پھر علیگڈھ واپس آگئے۔ دوران تعلیم میں پارٹیوں کے انتظام میں بطور خاص حصہ لیتے، اور جب کبھی کوئی بڑا آدمی آتا، کالج کے سجانے میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ کالج میں ان کا نام "چوکیدار" تھا۔

سر تھیوڈور مارسین کی توجہ سے، کالج کو خیرباد کہہ کر، ملازمت کی جانب مائل ہوئے، اور ۱۹۰۵ء میں صوبہ جات متحدہ میں، نائب تحصیلداری کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ بعد کو تحصیلدار ہوئے، اور پھر ڈپٹی کلکٹری

امتحان میں بدرجۂ اعلیٰ کامیاب ہوکر اس خدمت کو حاصل کیا۔ آخر الذکر عہدہ کے فرائض اس طنطنہ کے ساتھ انجام دئے کہ حکام مافوق کو ان کی قابلیت کا اقرار کرنا پڑا۔ الہ آباد کے ایک مشہور مقدمہ میں بعض سے کلا ان بن ہوگئی، اور ان کے اثر سے صوبہ کی کونسل، بلکہ پارلیمنٹ میں، مسٹر قاسم حسن کے طرز کار کی بابت استفسارات ہوئے۔ کونسل کے سرکاری جواب میں بیان کیا گیا تھا کہ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تصفیہ مقدمات میں، ایمانداری اور قابلیت سے کام لیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں اپنی خدمت سے استعفا دیا، اور تین مہینے کے بعد ہی، نواب نذیر جنگ بہادر کی سعی بلیغ سے، حضور پرنور نے اپنے علاقہ مال میں پانچ سو روپیہ ماہانہ کی خدمت دوم تعلقدار کا فرمان جاری فرمایا۔ اس وقت سے سرکار آصفیہ کے متوسل، اور فارغ الامتحان زبان ملکی (مرہٹی) ہیں۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں، منجانب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، پانچ سال کے لئے محمڈن کالج کے ٹرسٹی منتخب ہوئے، پھر یونیورسٹی کورٹ کے پہلے بیچ کے ممبر رہے۔ اس عرصہ میں، جلسوں میں شرکت کرتے، اور علیگڈھ کے مقاصد سے، دلچسپی کا اظہار فرماتے رہے۔ اپنی زندگی میں چار مرتبہ سخت علیل ہوئے۔ دو مرتبہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کے معالجہ، اور دو بار ڈاکٹر انصاری کے اپریشن سے، صحت پائی۔ زمانۂ علالت میں مولانا محمد علی، اور خواجہ عبدالمجید صاحبان نے، تیمارداری اور برادرانہ معاونت میں جو حصہ لیا تھا، اب بھی انھیں یاد ہے۔ اندرون ملک مختلف حصص ہند کا سفر کر چکے ہیں، مگر تصنیف و تالیف کے باب میں فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے، اس سے اب تک تو معاف رکھا ہے۔ نو سال کے سن میں شادی ہوئی۔ اس جوڑے کے ثمر آرزو (محمد عبد الحفیظ) نے، بیس سال کی عمر میں، انفلوانزا سے ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ اولاد میں اب ایک صاحبزادی باقی ہیں، خدا باقی رکھے۔

ا۔ علیگڑھ کی تازہ دلچسپ خبروں میں سے یہ خبر سنکر ہم کو خاص خوشی ہوئی کہ ہمارے محترم کرمفرما نواب سید نصیر حسین صاحب خیال (ٹرسٹی و ممبر کورٹ مسلم یونیورسٹی) نے ماہ نومبر میں ہماری یونیورسٹی کے معائنہ اور وہاں کے موجودہ حالات و فضا سے آشنا ہونے کا قصد فرمایا ہے۔ نواب صاحب کا قیام وہاں کئی ہفتہ رہے گا اور ممدوح اس اثنا میں یونیورسٹی کے شعبہ جات کو ملاحظہ اور وہاں کے طریقۂ کار کا مطالعہ فرمائیں گے۔ ہم کو اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ممدوح کو اپنی اس قومی درسگاہ کے ساتھ کتنے قدیمی تعلقات ہیں۔ انہوں نے مدرستہ العلوم کو سر سید علیہ الرحمۃ کے زمانہ اور سب سے پہلے غالباً ۱۸۹۴ء میں دیکھا' اور جب سے وہ ہمارے کالج کے ساتھ خاص دلچسپی لیتے اور اس کے خدمات کرتے رہے ہیں۔ نواب محسن الملک کے زمانہ میں' سال میں دو دفعہ علی گڈھ کالج آپ پر فرض تھا۔ جہاں نواب مرحوم کے مہمان عزیز بنے ہوئے احرام باندھے' مناسک ارکان بجالاتے رہتے تھے۔ اس دورے کے علاوہ ممدوح خاص موقعوں پر بھی علیگڈھ طلب کئے جاتے اور معاملات کالج میں درخور رکھتے تھے۔ ہمارے موجودہ بادشاہ (جارج پنجم) بزمانہ ولیعہدی' کالج کے ملاحظہ کو تشریف لے گئے تو اُسوقت بھی ہمارے کرمفرما وہاں حاضر اور ٹرسٹیاں و بہی خواہانِ کالج کے ہمدوش کام کرتے اور ہز ہائی نس آغا خاں کے دہنے بازو بنے ہوئے تھے۔ پھر جبکہ ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں علیگڈھ تشریف لائے تو اُس موقعۂ خاص پر بھی آپ مدعو ہوئے اور اپنے معظم نواب محسن الملک کے ساتھ' شاہ شہید کی پذیرائی واستقبال میں مصروف دکھائی دئے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں آپ کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوئے اور اس کے بعد نواب وقار الملک کے ساتھ بھی کام کرنے کا آپ کو اچھا موقعہ ملا۔ اُس وقت سے اِس وقت تک کہ زمانہ کے

تغیّرات نے حالات بہت بدل دئے اور اکثر بزرگوار اور ہمارے پرانے ٹرسٹیوں کا شغف بھی سرد پڑ گیا، ہمارے کالج کے ساتھ آپ کے انہماک میں الحمدللہ ابتک کوئی فرق دکھائی نہیں دیا، اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ کالج کی جوبلی کے موقعہ پر بھی آپ شریک اور گذشتہ سال کے یونیورسٹی کانووکیشن کے ایّام میں بھی گون پہنے، آپ وہاں نمایاں حصہ لے رہے تھے۔

ہم کو ابتک اس کا علم نہیں کہ ہمارے کرم فرما اس دفعہ بغیر کسی خاص تقریب کے کس مقصد سے اپنے اس قومی انسٹی ٹیوشن کے ملاحظہ کو جا رہے ہیں۔ مگر ہم اولڈبوائے کی طرف سے بے تپاک اُن کا خیر مقدم کرتے اور اسے ایک نیک فال جانتے اور سمجھتے ہیں کہ اُن کے اس اقدام سے ہمارے دیگر بزرگان، ٹرسٹیان اور ممبرانِ کورٹ کا بھی حوصلہ بڑھے گا اور پھر بہت سے بچھڑے بہ آسانی مل جائینگے۔

اس موقعہ پر ہم اپنے مخدوم سے اتنا ضرور کہیں گے کہ آپ نے محسن الملک کی آنکھیں دیکھی اور معاملاتِ کالج سے ہمیشہ باخبر رہے ہیں۔ بیس سال قبل کے زمین و آسمان اور موجودہ فضا کے فرق کو آپ سے زیادہ کون محسوس کر سکتا اور آج کی آب و ہوا کو سمجھکر آپ چند حضرات کے سوا ہمارے آرام کی خاطر دوسرا کون صحیح نسخہ تجویز کر سکتا ہے۔ مخدومنا! آپ نے اپنے سفرِ یورپ میں وہاں کی تقریباً کل درسگاہوں کو ملاحظہ بلکہ اُن کا مطالعہ کیا ہے، اور اپنی کیمبرج یونیورسٹی یونین والی اسپیچ میں بھی آپ ہمارے کالج کو بھولے نہیں ہیں اور برلین یونیورسٹی کے ساتھ مصر کی قدیم جامع ازہر میں بھی اپنے وقت کا کافی حصہ آپ نے صرف کیا ہے۔ آپکا تجربہ تعلیمی معاملات میں اور زیادہ وسیع و وقیع ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم کو پوری اُمید ہے کہ آپ کی یہ قابلِ تقلید وزٹ .... ہمارے بہت سے مراحل طے کر دے گی۔

ہم اخیر میں اپنے اولڈبوائے کی طرف سے گستاخانہ اتنا اور عرض کریں گے کہ ہماری زمین پر پہنچکر اور وہاں کی موجودہ آب و ہوا سے آشنا ہو کر اپنے خیالات اگر آپ نے ہماری زبان سے ادا نہ کئے تو ہم کو سخت شکایت ہوگی۔ آپ کو علم ہے کہ ہم اولڈبوائے آپ کے حرف حرف کو تعویذ اور حرزِ جان سمجھتے اور آپ کے قلم کی ہر گردش پر سمرقند و بخارا کیا، دل و جان بخشدینے پر تیار ہیں۔ اب اگر آپ نے سرد مہری برتی اور یہ اولڈبوائے آپ کا آلۂ زبان نہ بنا تو ہم سے کھلنڈرے اور بہروپئے، پھر ایک بھوکے بنگالی کی طرح

بیٹ بجا بجا کر اور چیخ چیخ کر جناب کی عافیت تنگ کر دیں گے!!

۲۔ گزشتہ دیوالی کی تعطیلات میں جناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر کی صدارت میں دو روز تک حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس نہایت کامیابی کے ساتھ ہوتے رہے۔ اس کامیابی کا سہرا یقینا کانفرنس کے سکریٹری مولوی سید خورشید علی صاحب کے سر ہے، جنہوں نے تھوڑے عرصہ سے اس کو اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کا ایک مفید ادارہ بنانے کی سعی کی ہے۔ ہم نواب ذوالقدر جنگ بہادر کے خطبہ کو دیکھتے ہیں، تو ہمیں اس مختصر میں صفائی، اور سچائی کے سوا دو باتیں بطور خاص نظر آتی ہیں، ایک زنانہ تعلیم پر اظہار خیال اور دوسرے پست طبقہ کی تعلیم پر زور۔ بہ حیث معتمد حکومت ہونے کے نواب صاحب کے لئے یہ قدرتی بات تھی کہ لازمی ابتدائی تعلیم پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے۔ ہم اُن کی اس آرزو میں شریک ہیں۔ اگرچہ حکومت آصفیہ کی جانب سے اب بھی ابتدائی تعلیم عام اور مفت ہے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ اہل ملک خود ہی اس برکت عثمانی سے کافی فائدہ حاصل نہیں کر رہے ہیں۔

کانفرنس کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں ہمارے بھائیوں میں سے نواب فخر یار جنگ بہادر، نواب ناظر یار جنگ بہادر، مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی، لفٹنٹ کرنل محمد عظمت اللہ سردار بہادر، مولوی غلام احمد خاں صاحب، اور مولوی مظہر حسین صاحب کی سعی بلیغ قابل قدر ہے۔ آخر الذکر نے تو اپنے محکمہ زراعت کی ضروریات کو بھی اس موقع پر بطور نمائش کے پیش فرمایا تھا۔ اُمید کہ دوسرے کارفرما بھی اس جانب متوجہ ہوں گے، اور آیندہ نمائش کانفرنس میں ملک کی مختلف قسم کی علمی و صنعتی پیداوار بھی نظر آئے گی۔

۳۔ مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب مددگار ناظم تعلیمات مملکت آصفیہ کی وفات عالم ادب کے لئے ایک تکلیف دہ سانحہ ہے، اور ہمارے لئے کبھی فراموش نہ ہونیوالا واقعہ شروع سے آخر تک کامیاب طالب علمانہ زندگی بسر کر کے مرحوم نے اجمیر کالج سے بی۔ اے کے امتحان میں اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل فرمائی اور ایک اخبار نویس کی زندگی اختیار کرنے کی خاطر دہلی و حیدرآباد میں مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں حیدرآباد کے تعلیمی مسئلہ پر مرحوم کا ایک مختصر سا انگریزی مضمون ڈاکٹر الما لطیفی کی نظر سے

گزرا، اور انہوں نے اسے پسند فرماکر اپنے آخری دورِ نظامت میں، اُن کا انتخاب سرکار آصفیہ کے محکمۂ تعلیمات کیلئے فرمالیا۔ اس طرح سے مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کی سرکاری زندگی کی ابتداء ورنگل ہائی اسکول کے ایک معلم کی حیثیت سے ہوئی۔ محض اپنی قابلیت کے باعث مرحوم کو تھوڑے عرصہ کے بعد ہی نظامت تعلیمات میں جگہ ملی، اور اس کے بعد سے وہ کبھی باہر نہ گئے۔ بہ حیثیت مددگار ناظم تعلیمات و معتمد کمشنر امتحانات خانصاحب کا کام تو سرکاری فائلوں میں بند رہے گا، لیکن یہ راز اب فاش ہوچکا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے زمانہ میں جو اصول کار مرحوم نے قرار دیا تھا، اسی کے مطابق ابتک عملدرآمد ہے۔ اسی طرح محکمۂ تعلیمات کی گزشتہ سالانہ رپورٹوں کی خوبی کا مدار بھی تمام تر ان مرحوم کی قلمکاری پر ہے۔ اس فریضہ کو وہ اپنی زندگی کے اُس نازک زمانہ میں بھی انجام دیتے ہوئے پائے گئے، جب مرض دق میں مبتلا ہوکر گھر میں زیر علاج تھے۔ مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کا شمار ملک کے نثر نگاروں میں ہوتا تھا، اور اپنی اس حیثیت سے تمام موقر رسائل کی قلمی معاونت فرماتے رہتے تھے۔ اپنی مادری زبان کیطرح انگریزی انشاپردازی، بلکہ شاعری پر بھی مرحوم قادر تھے۔ رسالہ المعلم کے خود بھی دِل سوز مدیر تھے، اور اس رسالہ کی کامیابی زیادہ تر مرحوم ہی کی رہینِ منت ہے۔ شاعری میں اُن کی رائے دوسرے شعراءِ عصر سے جدا تھی، اور اس باب میں نوجوانانِ ملک کیلئے ایک نیا راستہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انکی سرکاری رائے ہمیشہ مصنفین و مولفین کے شریک حال رہا کرتی تھی، اور ان سے بہت سے اہلِ قلم فائدہ حاصل کرچکے ہیں۔ ان مشاغل سے جب کبھی فرصت ملتی تھی، امتحانات میں تیار ہونے والے طلبہ کو مدد دیا کرتے تھے۔ انہیں سے کسی میں بھی ذاتی منفعت کو دخل نہیں تھا۔ یہ امر بھی بطور خاص قابل اظہار ہے کہ مرزا رفیق بیگ صاحب جس قسم کے اردو ٹائپ کی تیاریاں کررہے ہیں، انکی کامیابی ایک بڑی حد تک خانصاحب مرحوم کی رہنمائی اور مفید مشوروں کا نتیجہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ٹائپ کی کامیابی کا سہرا عظمت اللہ خاں کے مرنے کے بعد کن بزرگوار کے سر باندھا جاتا ہے۔ وہ ایک تیسرے درجہ کے مددگار تعلیم تھے، اور انہوں نے کبھی آگے بڑھنے کی سعی نہ کی! بلکہ ایک دو بار تو ایسا بھی ہوا کہ معتمدی عدالت اور فوج سے انکی مانگ آئی، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوست نے خود تعلیمات میں ترقی کے متوقع رہنے کی صلاح دی، اور مرحوم اپنی اس حالت پر قانع ہوگئے۔ بالآخر جذبۂ غیرت سے اثر پذیر ہوکر انکی طبیعت نے دائمی حرارت کو قبول کرلیا..... وفات سے چند ہفتہ قبل دق کا علاج کرانے مدن پلی تشریف لیگئے تھے مگر وہاں فالج کے شکار ہوگئے اور وہیں سپرد خاک ہوگئے۔ خدا مرحوم کے پسماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ارباب حل و عقد کو توفیق دے کہ انکے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست ہو جائے۔

اولڈبوائز ڈنر

برادرم سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے آنریری سکرٹری اولڈبوائز ایسوسی ایشن کی عنایت سے اولڈبوائز کی سالانہ میٹنگ اور ڈنر کے جو کاغذات ہمارے پاس پہنچے ہیں، اُن سے واضح ہوتا ہے کہ ۲۵ ر و ۲۶ ر اکتوبر کو علیگڈھ میں ہمارے قدیم بھائیوں کا مجمع دوالی کی تعطیلات میں ہوا۔ میٹنگ کے پریسیڈنٹ ہمارے برادر محترم شیخ عبداللہ صاحب بی۔اے۔ ایل ایل۔ بی تھے اور اُن کی عدم موجودگی میں ایک مرتبہ اِس فرض کو برادر مکرم سید عبدالباقی صاحب ایم۔اے نے بھی انجام دیا تھا۔ اِس میٹنگ کی تحریکات اور سکرٹری صاحب کی رپورٹ کو اپنے آئندہ نمبر میں درج کرنے کی عزت حاصل کریں گے، البتہ ڈنر کی کیفیت ناظرین اولڈبوائے کی خدمت میں اب پیش کیے دیتے ہیں۔ ڈنر زیر صدارت سید حبیب اللہ صاحب بیرسٹر کانپور ۲۶ ر کے بعد کی شب میں ہوا۔ اِس موقع پر ایک دوسرے سے ملنے کے لئے اولڈبوائز کی بیقراری اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے اور ہمارے پیران نابالغ کی زندہ دلی دیدنی ہوتی ہے۔ خود اپنی ہی لاج میں جو خدا خدا کر کے اب ہمارے قبضہ میں آئی ہے، اگرچہ یہ قبضہ تعہد کی قسم کا ہے، شب کے آٹھ بجے مہمانوں کا مجمع ہوا۔ اُن کی پزیرائی ہمارے دفتر کے قریب کے چھوٹے ہال میں کی گئی تھی۔ لیکن اِس موقع پر میزبان و مہمان دونوں رسمیات سے بری تھے۔ پوری فضا خلوص و محبت اور برادرانہ رواداری سے معمور تھی۔ اِن آنیوالوں میں سے بعض کی نشست صوفوں پر تھی، بعض کرسیوں پر پر بیٹھے تھے، بعض نے فرش و قالین ہی پر قناعت فرمائی، اور چند ایسے بھی تھے جنہیں کچھ نہ ملا تو کھڑے رہنے پر صبر کیا۔ کسی نے کسی کا تعارف نہیں کرایا۔ بلکہ ہال میں داخل ہونے پر ہر شخص کو خود ہی تکلیف کرنی پڑتی۔ کالج میں داخلہ کے وقت سے اب تک کی داستان سنانا اِس کے لئے ضروری تھا البتہ بعض سے اُن کے

کالج کے زمانہ کے ناموں کا اظہار اصرار کے ساتھ کرایا جاتا تو بغلیں جھانکتے ہوئے اس کے لئے بھی مجبور ہو جاتے۔ دوران ملاقات میں سگریٹ اور پان کی تواضع ہوتی رہی۔ سر فلپ ہارٹاگ، اور سر جارج انڈرسن ارکان مسلم یونیورسٹی کمیشن، مع اپنے سکرٹری مسٹر ایف رحمان کے ہال میں داخل ہوئے تو سارے مجمع کی صورت ہی دوسری ہوگئی۔ ان سب ثقہ بزرگواروں نے اپنے ان مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ کرکٹ لان کی جانب لاج ہی میں ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تمام مہمانوں کے یکجا ہو جانے پر میزوں کی جانب حرکت شروع ہوئی جہاں خوش ذائقہ کھانے قرینہ سے چنے ہوئے تھے۔ سب سیر ہو کر کھا چکے تو اس موقع کے صدر نشین نے حضور ملک معظم کا جام صحت تجویز کیا، اور نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر نے تائید فرمائی۔ حاضرین نے استادہ ہو کر صاف و شیریں پانی سے اسکی تعمیل کی۔ الماٹیر کا جام حیات مسٹر محمد یعقوب ڈپٹی پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی نے تجویز کیا۔ اور نواب صاحب معزز نے اسکا جواب دیا۔ اس موقع پر نواب صاحب نے افسوس ظاہر فرمایا کہ یونیورسٹی میں جگہ کی قلت کے باعث سیکڑوں طلبہ کو واپس کرنا پڑتا ہے۔ آپکو اس کا بھی ملال تھا کہ ڈنر کے موقع پر موجودہ طلبہ شرکت کا موقع حاصل نہ کر سکے۔ ہماری ایسوسی ایشن کے سکرٹری نے جواب میں بیان فرمایا کہ ایسوسی ایشن شاہراہ ترقی کی جانب گامزن ہو رہی ہے۔ سال آئندہ انشاء اللہ چھوٹے بھائی بھی شریک کئے جائینگے، اور نواب صاحب کی جیب بھی ٹٹولی جائے گی۔

اولڈ بوائز کا جام تندرستی تجویز کرنا نواب صدر یار جنگ بہادر کے حصہ میں آیا تھا۔ آپ نے ملک کی عملی زندگی میں اولڈ بوائز کے اثر کا ذکر بطور خاص فرمایا۔ مسٹر عبدالعزیز وکیل الہ آباد نے تائید میں اور جناب سکرٹری صاحب نے اس کے شکرانہ میں تقریر کی۔ صدر نشین صاحب نے ارکان مسلم یونیورسٹی کمیشن کی تشریف فرمائی کا شکریہ ادا کیا، اور اس کا جواب سر فلپ ہارٹاگ نے دیا۔ ڈنر ختم ہوا۔ اگلی صبح کو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اولڈ بوائز ڈائرکٹری

علیگڈھ اولڈ بوائز!

براہِ کرم علیگڈھ اولڈ بوائز ڈائرکٹری (خزینۃ الکرام) میں اپنے حالات درج کرنے کی غرض سے مندرجۂ ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) نام معہ ولدیت و سکونت۔ مقام و تاریخ پیدائش۔

(۲) تعلیم کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی۔ علیگڈھ میں کس جماعت میں داخل ہو کر کہاں تک تعلیم پائی۔ تعلیم کے زمانے کے خصوصیات و اتفاقات (اگر کچھ ہوں)

(۳) علیگڈھ میں تفریحی مشاغل کیا تھے اور ان میں کیا نام پیدا کیا۔

(۴) علیگڈھ میں طالب علمی میں کن کاموں میں شرکت کا موقع ملا اور اس کے نتیجے۔

(۵) علیگڈھ سے باہر جا کر کس قسم کی زندگی اختیار کی؟ اور اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔

(۶) ملک میں یا بیرون ملک کوئی اہم سفر کیا ہو تو اس کا ذکر۔

(۷) آپ کی علمی، ادبی یا شعری خدمت انجام دی ہو تو اس کا ذکر۔

(۸) شادی کب اور کہاں ہوئی۔ اولاد کی تعداد اور فرزندوں کے نام۔

نیاز کیش

اولڈ بوائے

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۴۰۱۲ سلطانپورہ حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔
قیمت سالانہ صہ — قیمت ششماہی ے

ہمارا کالج

۱۔ نومبر کے آخر ہفتہ میں ہزاکسلنسی سر ولیم میرس نے تھوڑا سا وقت علیگڈھ کے لئے مخصوص، اور ہماری یونیورسٹی کے لئے محفوظ فرما دیا تھا۔ اپنے قیام علیگڈھ کے دوران میں ہزاکسلنسی نے میرس ہوسٹل اور مزمل اللہ ہوسٹل کے سوا مدرسہ کوران کی عمارت کو کشادہ فرمایا۔ اس نیک کام کی ابتدا تھوڑا عرصہ ہوا ہمارے برادر محترم صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب نے فرمائی تھی، اور اصل کام کا آغاز حکیم نابینا صاحب کے دست مبارک سے ہوا تھا۔ اس مدرسہ کے قیام و بقا کے لئے جن حضرات نے حال میں سعی فرمائی ہے اُن میں خود ہزاکسلنسی بھی شریک ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر چندہ کی ابتداء خود سر ولیم کی رقم سے ہوئی، اور انہوں نے پندرہ سو روپیہ اس کار خیر کے لئے عطا فرمائے۔ دوسری بڑی رقموں کے منجملہ نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کے دس ہزار، اور آنریبل نواب صاحب چھتاری کے ایک ہزار شریک ہیں۔ ہزاکسلنسی کے اعزاز میں نواب محمد عبد الصمد خاں بہادر رئیس طالب نگر نے پُر تکلف ڈنر ۸ ، نومبر کو دیا تھا۔ ڈیڑھ سو کے قریب ہندو مسلمان، اور یوروپین مہمان شریک ضیافت تھے۔ فوجی بینڈ مہمانوں کی سامعہ نوازی میں مصروف تھا۔

نوٹس

ایک اسکالرشپ مبلغ چالیس روپیہ ماہوار کا جو فی الحال ایک سال کے لئے ہوگا اُس علیگڈھ اولڈ بوائے کے لڑکے کو جو امتحانی مقابلہ میں اوّل آوے کسی زراعتی کالج میں تعلیم پانے کی غرض سے دیا جائیگا۔ درخواستیں سید سجاد حیدر بی اے آنریری سکرٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے پاس ۱۵ جنوری ۱۹۲۸ء تک آنا چاہئیں

برادر مکرم سید سجاد حیدر صاحب ہمیں یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ آنریبل نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کی سعی موفور سے "اولڈ بوائز لاج" کا ملا بحق "اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" واگزار ہو چکا ہے نواب صاحب بہادر اور ایسوسی ایشن کا شکریہ قبول فرمائیں اور مبارکباد بھی کہ حال ہی میں آپ کا انتخاب کونسل آف اسٹیٹ کی رکنیت کے لئے عمل میں آیا ہے۔

جو ۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو جلسہ سالانہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علیگڈھ میں پڑھی گئی اور منظور ہوئی۔

برادران کرم! اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۲۳ر اپریل ۱۹۲۸ء کو اپنی زندگی کے پانچسال ختم کریگی۔ اسکی زندگی گو ابھی مختصر ہے مگر الحمد للہ اسکی داستانِ خدمت مختصر نہیں۔ اسکی چار سالہ زندگی میں نمائش کا عنصر کم، مگر کام کا حصہ زیادہ ملیگا۔

میں ممبران بیرون علیگڈھ کے ایثار پیہم کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں حقیقت میں علیگڈھ اولڈبوائز کی جو علی گڈھ سے دور، دیار بعید میں رہکر، علی گڈھ کی محبت کے شعلہ کو بجھنے نہیں دیتے، میں جسقدر ستایش بھی کروں وہ کم ہے۔ محض اونکی حقیقی محبت والفت علیگڈھ کا ادنے سا کرشمہ تو یہ ہے کہ آجتک ایسوسی ایشن نے تینتیس ۳۳ ہزار روپیہ جمع کیا جسمیں سے بعد خرچ واخراجات ساڑھے سترہ ہزار روپیہ کی وہ مالک ہے۔ اس روپیہ کے بل بوتہ پر ہم علی گڈھ اولڈبوائز کی اولاد کو اسکالرشپ اور وظیفے دیرہے ہیں۔ اولڈبوائز کا یہ خیر جاری خدا ہتی دنیا تک جاری رکھے۔

میں ایجنڈہ کے ساتھ، ایسوسی ایشن کی آمدنی وخرچ کا مفصل گوشوارہ ارسال خدمت کر چکا ہوں یہاں مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ۳۱ر اگسٹ ۱۹۲۷ء تک ہمارے پاس سترہ ہزار پانچسو چھیاسی روپیہ تیرہ آنہ پانچ پائی ([illegible]) تھا۔ اسمیں سے بقدر ایکہزار چھ سو چوہتر روپیہ ([illegible]) کے کرایہ لاج

اور منافع بنک و پرامیسری نوٹ شامل ہے جو من ابتدائے ۲۱ اگست ۱۹۲۲ء تا ۳۰ جون ۱۹۲۶ء وصول ہوا۔

چار سال میں اس قدر سرمایہ کا جمع ہو جانا اگرچہ بلحاظ تعداد اولڈ بوائز جو بفضل خدا روز افزوں ہے اور جو سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہیں حیرت انگیز نہیں مگر بلحاظ اس عام سرد مہری اور بے توجہی کے جو اولڈ بوائز میں پیدا ہو گئی ہے طمانیت بخش ضرور ہے لیکن اس مختصر جماعت کا جو ایسوسی ایشن کی ممبر ہے ولولہ خدمت و محبت، مساعد و غیر مساعد حالات سے ذرہ برابر متاثر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ علی گڈھ کے خلاف پروپگنڈہ، اطراف و اکناف ملک میں پھیلایا گیا، مگر وہ متاثر نہیں ہوئے۔ علی گڈھ نے جب کبھی وہ یہاں آئے اسی کشادہ آغوش سے، انکی پذیرائی نہیں کی جیسی وہ پہلے کیا کرتا تھا، مگر وہ رنجیدہ نہیں ہوئے۔ ان کے حقوق جو پہلے علیگڈہ کی حکمران جماعت نے انھیں دے رکھے تھے، تقریباً سب سلب کر لئے گئے، مگر انکی زبان سے نکلا تو صرف یہ نکلا۔

ہم نہوں تو نہیں پروا، رہے محفل باقی
یا الٰہی یہ چمن تو کبھی برباد نہ ہو

یہاں کی خانہ جنگیاں ان کے لئے باعثِ ملال ضرور ہوتی ہیں، مگر انہیں یہاں سے بددل نہیں کرتیں وہ اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے برابر یہیں بھیج رہے ہیں، جہاں وہ خود تعلیم پا چکے ہیں۔ غرضکہ ان لوگوں نے ماہ بماہ ٹکس ادا کیا، اور تیس ہزار آپ کی خدمت میں پیش کر دئے۔ خدا انکی ہمتوں کو بلند رکھے اور انہیں جزائے خیر دے

قواعد میں ترمیم برادران! ۱ نومبر ۱۹۲۶ء میں جو سالانہ جلسہ ہوا اس میں ایک عظیم الشان اصول طے ہوا یعنی ایک رزولیوشن پاس ہوا، جس سے صراحتاً ایسوسی ایشن کے سرمایہ میں اپنی برادری کی اولاد کا حق مرجح تسلیم کیا گیا۔ اب گویا یہ اصول طے پا گیا ہے کہ ایسوسی ایشن کے سرمایہ کا معتدبہ حصہ اولڈ بوائز کی اولاد کی تعلیم میں صرف کیا جائے۔

چنانچہ اس رزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد بجٹ میں ایکہزار روپیہ کی رقم منظور کی گئی، اور سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی نے اسکی تقسیم کیلئے، مندرجہ ذیل قواعد پاس کئے:۔

ا۔ چالیس روپیہ ماہوار کا ایک وظیفہ کسی ایسے طالبعلم کو دیا جائے جو کسی انجینرنگ کالج میں تعلیم پاتا ہو۔ (ا) وہ نہ ملے تو کسی میڈیکل کالج والے کو۔ (ب) وہ بھی نہ ملے تو کسی تجارتی کالج والے کو۔ اور (ج) وہ بھی نہ ملے تو بیس بیس روپیہ کے دو وظیفوں میں سے ایک ایم۔ اے کے طالبعلم کو اور دوسرا بی۔ اے کے طالبعلم کو دیا جائے۔

۲۔ صرف ایسے امیدواروں کو مقابلہ کی اجازت دیجائے جو ایسوسی ایشن کے چندہ دینے والے ارکان کے بیٹے یا پوتے ہوں۔

ان قاعدوں کے ماتحت : مفصلہ ذیل اسکالرشپ دئے گئے :-

ایک اسکالرشپ چالیس روپیہ ماہوار کا' خواجہ محمد اسحاق صاحب بی۔اے (علیگ) تعلیم شکرسازی گلاسگو (انگلینڈ) کو۔ میڈیکل کالج کی تعلیم کیلئے امتحان مقابلہ ہوا۔ اس امتحان میں زبیدہ جہاں بیگم اول آئیں' اور انہیں [illegible] روپیہ ماہوار کا اسکالرشپ' اور آل محمد صاحب کو جو دوم آئے [illegible] روپیہ ماہوار کا اسکالرشپ ملا۔

وظیفے' یعنی وہ مدد جو حاجتمند اولڈبوائز کی اولاد کو دی گئی۔ گذشتہ سال' ایسوسی ایشن نے مرحوم مسعود حسین صاحب (ٹومی) کی اولاد کے لئے رزولیوشن پاس کیا تھا۔ چنانچہ' انکی اولاد کی تعلیم کے لئے جو بھوپال میں پڑھ رہی ہے' [illegible] روپیہ ماہوار بھیجے جاتے ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں' اسلئے یہ رقم ماہ بماہ میجر سعید محمد خانصاحب ڈائرکٹرسی۔ آئی ڈی بھوپال و ممبر ایسوسی ایشن کے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ وظائف دئے گئے ہیں:-

(۱) زاہد حسین صاحب پسر احمد حسین صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر [illegible]

(۲) حبیب الرحمٰن صاحب طالبعلم ایم۔اے۔ایل ایل بی کلاس ״

(۳) ابوالفضل ہاشمی صاحب ״ ״ ״ ״ ״

(۴) حضور العباس صاحب ״ انٹرمیڈیٹ کلاس [illegible]

(۵) رفعت خانم صاحبہ ״ زنانہ طبیہ مدرسہ یونانی دہلی [illegible]

ایسوسی ایشن کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ لڑکیوں کو اسکالرشپ اور وظیفہ دیا گیا، ورنہ اب تک بیچاری لڑکیاں اسکی مستحق نہ سمجھی جاتی تھیں۔ بے محل نہو گا اگر میں یہاں اپنی ایک دیرینہ آرزو کا ذکر کروں۔ گزشتہ رپورٹ میں میں نے اسکالرشپ و وظائف کے سلسلے میں، عرض کیا تھا:۔ "میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ اس میں صرف لڑکوں کی تخصیص ہو۔ میں یہ خوب دیکھ رہا ہوں کہ ہماری لڑکیاں بھی، ایسوسی ایشن سے اسکالرشپ لے کر مصر و قسطنطنیہ کے لیڈیز کالج میں تعلیم پائیں گی۔" چنانچہ اس سال پہلا قدم اٹھایا گیا ہے؛ یعنے ایک رزولیوشن آپ کی منظوری کیلئے پیش کیا جائیگا، جس کا مقصد یہ ہے کہ عربی اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کیلئے ۔۔۔ ماہوار کا ایک اسکالرشپ مقرر کیا جاوے۔ یہ اسکالرشپ کسی اولڈبوائے کی اس لڑکی کی تعلیم پر صرف ہو؛ جو مصر کے کسی زنانہ کالج میں جاکر تعلیم حاصل کرے۔ ممالک اسلامیہ میں جاکر تعلیم حاصل کرنا، ایک ایسا خیال ہے جو مجھے اُمید ہے کہ آپ کو ضرور پسند ہوگا۔ ہم اپنے لڑکوں کو وہاں اسلئے نہیں بھیج سکتے کہ وہاں کی ڈگریوں کو، حکومت ہندوستان قبول نہیں کرتی، اور کشمکش حیات میں، کسب معشیت کا یہ پہلو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر بحمداللہ ہم ابھی تک اقتصادی مجبوری کے اُس درجے تک نہیں پہونچے (گو میرا خیال ہے کہ وہ درجہ بھی جلد آنیوالا ہے) کہ ہمیں اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے وقت یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد، کہاں نوکری کر سکیں گی۔

جو وظائف دئے گئے یا دئے جارہے ہیں، وہ ہمیں کسطرح واپس ملیں؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے۔ مجھے علم ہے کہ ہماری یونیورسٹی نے ایک لاکھ کے قریب روپیہ ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے، طلبہ کو دیا۔ یہ طلبہ، نمایاں کامیابی کے بعد ہندوستان لوٹے اور معزز عہدوں، اور بڑے بڑے مناصبوں پر فائز ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر نے یونیورسٹی کو وہ روپیہ جو اس نے انہیں قرض دیا تھا واپس نہیں کیا۔

کیا ہمارا بھی یہی حشر ہونا ہے؟ اُمید ہے کہ ایسا نہو گا۔ اسلئے کہ ہمارے ایک طالبعلم، محمد حسین خانصاحب، جو اسوقت ایک جلیل عہدے کے فرائض انجام دیرہے ہیں، بلا طلب، اُس تمام اسکالرشپ کو ادا کر رہے ہیں؛ جو انھیں دیا گیا تھا۔ وہ ماہانہ پچاس روپیہ کی معقول رقم دیرہے ہیں؛ اور اُسکے علاوہ ایسوسی ایشن کی

ممبری کا چندہ باقاعدہ طور پر بھیجتے ہیں۔ خدا اُن کے مدارج میں روزافزوں ترقی کرے۔

مگر ایک اور صاحب ہیں، جو معقول تنخواہ پا رہے ہیں۔ اُنسے بھی اعادۂ قرض حسنہ کا مطالبہ کیا گیا، اور انکی خدمت میں حساب بھیجا گیا۔ ارشاد ہوا حساب غلط ہے، یہ ہونا چاہئے۔ عرض کیا گیا بہتر جو رقم آپ فرماتے ہیں، وہی صحیح ہے، وہی عنایت ہو۔ اُنکے جواب میں خاموشی ہے۔

حکایت تغافل و اہمال

برادران! اب میں آپ کے پکے پھوڑے کو چھیڑنا چاہتا ہوں، یعنی اولڈبوائز لاج کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تغافل و اہمال کی داستان ایسی دل دوز داستان ہے، جو ختم ہی ہونے میں نہیں آتی۔ لاج ہم سے کس طرح چھنا، اولڈبوائز اُس سے کس طرح بیدخل ہوئے، یہ سب کو معلوم ہے، اور اسکا ذکر دلخراش کن نہیں۔ اُسکی واپسی کے متعلق جو کوششیں کی گئیں اُنھیں آپ کی خدمت میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

برادر محترم صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب جب وائس چانسلر ہوئے، اولڈبوائز کے کئی ڈپیوٹیشن اُن کے پاس گئے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ زمام کار اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد میں اس مسئلہ پر غور کرونگا۔ پورا ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء کے گیارہ مہینے اُمید و انتظار میں ختم ہوگئے۔ ۱۹۲۵ء کے آخر میں نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر نے خط آزادی ہمیں مرحمت کیا، اور لاج واگذار ہوا۔ مگر اس حکم میں یہ درج تھا کہ لاج Lease پر ایسوسی ایشن کو دیا جاتا ہے۔ مالک مکان اجارہ دار قرار پایا۔ اسکے بعد ۵ و ۶ نومبر ۱۹۲۶ء کے سالانہ اجلاس میں مندرجہ ذیل رزولیوشن پاس ہوا۔

"اولڈبوائز لاج کو کامل طور پر واپس لیا جائے، اور اس غرض کی تکمیل کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے"

چنانچہ ۱۸ فروری کو ایک ڈپیوٹیشن اولڈبوائز کا نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اُس نے ایک ایڈریس[1] پیش کیا جس میں عرض کیا گیا تھا۔ "یہ حضور کے فیصلہ ہی کا طفیل ہے کہ اولڈبوائز لاج،

---

[1] یہ ایڈریس منجانب ایسوسی ایشن مسٹر احسان الحق، خانبہادر مرزا قسیم بیگ چغتائی، مسٹر خلیل احمد مراد، مسٹر خواجہ عبدالعلی، مسٹر عبدالرب، اور مسٹر سید سجاد حیدر نے پیش کیا تھا۔ ایڈیٹر

پھر اولڈ بوائز کا مستقر ہے، اور بشرائط مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے تحت تصرف میں ہے۔ لیکن حضور کے حکم میں ایک لفظ Lease کا الیا ہے، جس نے ایسوسی ایشن کو متاجرانہ حیثیت دے رکھی ہے۔ ہم بکمال ادب حضور والا کی خدمت میں استدعا کرتے ہیں کہ متاجری کی قید و شرط اٹھا دی جائے اور مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، عمارت اولڈ بوائز لاج کی مالک قرار دیجائے۔

حضور والا! اس ایسوسی ایشن کے قواعد و ضوابط میں یہ داخل ہے کہ ایسوسی ایشن یونیورسٹی کے تمام قوانین و قواعد کی جو اسپر اور ممبران پر عاید ہوتے ہوں پابندی کریگی، اور ہمیں یقین واثق ہے کہ انشاء اللہ ایسا موقع پیش نہ آئیگا جب کہ ایسوسی ایشن اپنی آزادی رائے اور آزادی عمل کو برقرار رکھتے ہوئے، قوانین جبریہ، و احکامات حکام مجاز یونیورسٹی کی تعمیل سے سرتابی کرے۔ لیکن اگر کسی وقت احیاناً یونیورسٹی کسی شدید ضرورت کی بنا پر، عمارت لاج پر قبضہ کرنا چاہے تو ہم چاہتے ہیں کہ یہ فیصلہ اس وقت قرار پا جائے کہ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو عمارت کی واقعی لاگت، یا اسوقت کی قیمت جو مقدار میں زیادہ ہو، ایسوسی ایشن کو یونیورسٹی ادا کردے۔ ایسوسی ایشن بلا کسی عذر کے اولڈ بوائز لاج کی عمارت کو یونیورسٹی کے قبضہ و ملکیت میں دیدے گی۔"

نواب صاحب نے وعدہ فرمایا کہ وہ اس معاملہ کو معہ اپنی زبردست اور وقیع سفارش کے اکزیکٹو کونسل کے سامنے پیش کردیں گے۔ اور مجھسے ارشاد فرمایا کہ میں ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک درخواست گزرانوں۔ چنانچہ میں نے ۲۱ اپریل ۱۹۲۷ء کو یہ درخواست پیش کی۔ مگر نہ معلوم یہ درخواست کس منحوس ساعت میں لکھی گئی تھی، کہ کونسل نے اب تک اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

برادران! میں نے درخواست میں ذکر کیا تھا، اور گذشتہ سال اپنی رپورٹ میں بالتفصیل عرض کیا تھا، کہ Lease کی وجہ سے، سارا مسئلہ، حالت عطالت میں پڑا ہوا ہے، اور معاملہ اس مرحلہ پر آکر رک گیا ہے، جہاں سے بغیر ایک قطعی فیصلہ کے آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ میں نے گذشتہ رپورٹ میں عرض کیا تھا:-

"آپ ذرا موجودہ صورت حالات پر غور فرمائیں۔ لاج دو منزلہ عمارت کی شکل میں مکمل

کیلئے جانے کے ارادہ سے تیار کیا گیا تھا۔ اوپر کی منزل ابھی بالکل نہیں بنی۔ اسوقت یونیورسٹی کے
ممبران اسٹاف کے رہنے کے لئے مکانات کی سخت ضرورت ہے، لاج ایک ایسی عمارت ہے اور ایسے
موقع پر واقع ہوئی ہے کہ غیر متاہل پروفیسر یا وہ جو تنہا رہتے ہوں اسمیں کمرے لیکر رہنا بہت پسند کرتے
ہیں۔ اوپر کی منزل میں اگر چار کمرے رہنے کیلئے بنا دئے جائیں تو کم سے کم اسٹاف کے چار ممبروں کیلئے
جگہ نکل آئے، اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو کرایہ کی معقول آمدنی ہو۔ مثلاً اس وقت دو کمروں کا کرایہ
چالیس روپیہ آتا ہے اگر اوپر کے درجہ کے چاروں کمرے تیار ہوجائیں تو اسی روپیہ ماہوار اوپر کی منزل
سے ملے۔ اس طرح ایک سو بیس روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی محض کرایہ سے ایسوسی ایشن کی ہوجائے۔ اور
کئی پروفیسر جو (معاف کیجئے گا اگر میں کہدوں) اسوقت بے خانماں و بے سروساماں پھرتے ہیں آسودگی
راحت کے ساتھ مستقر پا جائیں۔ آپ کی ایسوسی ایشن کی بحمد اللہ مالی حالت اب ایسی ہے کہ وہ لاج
کی دوسری منزل بہت آسانی سے بنا سکتی ہے۔ لیکن جب تک کہ Lease کی تلوار ہمارے سروں پر
لٹک رہی ہے کم سے کم میں تو اس پر راضی نہ ہونگا، کہ ہماری ایسوسی ایشن کا ایک پیسہ بھی اس عمارت پر
صرف کیا جائے، جس سے نہ معلوم کس وقت اور کس بنا پر ہم نکال دئے جائیں، اور جس میں صراحتاً
ہمیں کسی قسم کا حق ملکیت نہیں ہے۔ لیکن یونیورسٹی کی ضروریات پر نظر کرتے ہوئے میں بادلِ ناخواستہ
ایک بات پر راضی ہوسکتا ہوں، اور وہ یہ کہ موجودہ بالائی منزل ہم بنا دیں، لیکن اگر کسی وقت یونیورسٹی
اس عمارت پر قابض ہو تو ہمارے بنائے ہوئے حصہ کی قیمت جو اُس وقت ہو یونیورسٹی ہمیں دے،
بشرطیکہ یہ قیمت کسی حال میں اس سے کم بھی نہ ہو جو ہم نے اُس عمارت پر صرف کی ہو۔ اور اگر اُس وقت
قیمت، لگائی ہوئی لاگت سے زیادہ ہو تو اسکے بھی ہم ہی مستحق ہوں گے۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ ایسی
تو ہر صورت میں اپنا فائدہ ہی سوچا گیا ہے۔ جواباً میں عرض کرونگا، کہ بیدخلی ایک ایسا تشدد ہے کہ
جسے بیدخل ہونیوالا ٹھنڈے دل سے قبول نہیں کرتا، اور اسکی اشک شوئی کیلئے بیدخل کنندہ معقول
معاوضہ دیتا ہے۔ معلوم نہیں آپ حضرات کی کیا رائے ہے، اگر فردائے قیامت ہی کے لئے فیصلہ
معلق رکھا گیا، تو لاج کی بالائی منزل نہ معلوم کب بنے، یا بنے بھی کہ نہیں؟ مجھ سے چند قانون داں

بھائیوں نے فرمایا تھا کہ Lease کا لفظ اس قدر خوفناک نہیں ہے جتنا تم اُسے سمجھے ہوئے ہو' اسلئے کہ Lease میں یہ شرط نہیں ہے کہ ایسوسی ایشن بطور کرایہ لاج کے کوئی رقم یونیورسٹی کو دیگی! اور جب کرایہ درج نہیں تو بغیر کرایہ کے Lease نہیں ہو سکتی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ قانون کی یہ شرح' جو مجھ سے بیان کیگئی ہے' وہ کہاں تک صحیح ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ قانون داں بھائیوں کی ایک کمیٹی اس مسئلہ پر غور کرکے' اور موجودہ پیچیدگی کو مدنظر رکھ کے' کوئی فیصلہ کردے' اور مجھے ہدایت کردے کہ آیا منزل بالائی' موجودہ حالت میں بنادی جائے یا نہیں؟

برادران! مثل سال گذشتہ کے میں پھر آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں' کہ یونیورسٹی کورٹ میں آپ کو اپنے نمائندے بھیجنے کا کوئی حق نہیں۔ ضمناً' آپ رجسٹرڈ گریجویٹس کو ووٹ بشرطیکہ آپ بھی گریجویٹ ہوں دیسکتے ہیں۔ محض بہ حیثیت اولڈبوائے' آپ کو اتنا بھی حق نہیں! جو ایجوکیشنل کانفرنس کے ہر ممبر کو ہے۔ وہ پانچ روپیہ فیس دیکر' سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی میں منتخب ہو سکتا ہے! اور وہاں سے یونیورسٹی کورٹ میں پہونچ سکتا ہے۔ آپ پر ہمیشہ کے لئے کورٹ کا دروازہ بند ہے۔ میری رائے ہے' کہ یونیورسٹی ایکٹ میں حقوق اولڈبوائز سے چشم پوشی کیگئی ہے' اور اب کہ قانون پر نظر ثانی کیجارہی ہے' وقت ہے کہ آپ بھی اپنے نقطۂ نظر کو پوری قوت کے ساتھ کارفرمایان یونیورسٹی کے سامنے پیش کریں۔

برادرانِ مکرم! فضا مکدّر ہے' صف آرائیاں ہورہی ہیں' اس محبوب' اس عزیز درسگاہ پر سخت وقت گذر رہا ہے۔ آپ ہر نازک وقت' ہر نازک موقع پر چاروں طرف سے دوڑکر' اسکی حمایت وحفاظت کو آئے ہیں اور حصن حصین بنکر اُسکے گرد کھڑے ہوگئے ہیں' اور اُسے گزند پہونچنے نہیں دیا۔ اشخاص سے ہمیں کوئی غرض نہیں' مگر اسکی بہبودی ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے' اور میں یقیناً آپ کی دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہوں جب میں پکار کر کہتا ہوں

جو عدوئے باغ ہو برباد ہو — اسمیں یا گلچیں ہو' یا صیاد ہو

خاکسار.............. سید سجاد حیدر

فسوں کاری

از جناب جوش ملیح آبادی

اے دورِ ہوس پرور! اے عہدِ ریاکاری!!
کیا شرع میں تیری بھی جائز نہیں میخواری؟

میرے دلِ نازک میں کیوں شورشِ گریاں ہے
اے عشق کی بیتابی! اے عقل کی خودداری!!

گفتار میں آ اس کو آئینِ جنوں سمجھا
اے عشق! سنا تو نے کیا کہتی ہے ہشیاری؟

اس بزم میں سوچو تو کیا نیند کے معنی ہیں
جب عالمِ غفلت میں اک خواب ہے بیداری

آرام طلب دل پر، احساسِ غلامی سے
اک ضرب لگا کامل، اک زخم لگا کاری

یہ عیش کی صورت ہے، وہ لطف کا ساماں ہے
اے عقل! کھلونوں کی تا چند خریداری؟!

کس حد کی جنوں پرور شرطیں ہیں محبت کی
خاموشی و گویائی، بدمستی و ہشیاری

پردہ اب اٹھایا ہے، ابلائے محبت نے
کاندھے پہ مرے رکھ دو تابوتِ ہوس کاری

اے شرمِ گنہ! تجھ سے بیکار الجھتا ہے
یارانِ طریقت کا پندارِ نکوکاری

ملتے ہی نظر ان سے ہنستا تو کیا، ہمدم!
میں رو نہ سکا، دل پر عالم وہ ہوا طاری

معبود! طلب کر لے قدرت کے مناظر کو
کافر ہوں اگر خود سے کی ہو کبھی میخواری

اندھوں کو دکھا جلوے، بہروں کو سنا نغمے
قدرت نے مرے حق میں، یہ حکم کیا جاری

میری ہی نگاہوں نے اے جوش! سکھائی ہے
اس جانِ تمنا کی آنکھوں کو فسوں کاری

SWINBURNE

مطالعہ سوئن برن

دورِ حاضر کے ایک اچھے نقاد نے لکھا ہے: شیلی Shelley اور سوئن برن کی مشابہت ہمیں اس حیرانگیز خیال کی طرف لیجاتی ہے کہ شیلی نے سوئن برن کی صورت میں نیا جنم لیا ہے۔ اور یہ واقعی اس ڈوبے ہوئے شاعر کی روح ہے، جو دوبارہ زندہ ہو کر آکسفورڈ یونیورسٹی Oxford University میں اپنی وہ تعلیم مکمل کرنے آئی ہے، جس کا سلسلہ اسے اس صدی کے آغاز میں کالج سے نکالدئے جانے کی وجہ سے منقطع ہو گیا تھا۔ یہ خوشنما خیال چند عجیب مشابہتوں کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے، سوئن برن صرف اسی ایک بات میں شیلی سے مشابہت نہیں رکھتا کہ وہ اسکی طرح ایک اچھے خاندان میں پیدا ہوا اور پھر اسکی زندگی کا ابتدائی زمانہ ایٹن Eton کے مدرسے میں اسی انتہاپسندانہ جوش کے ساتھ گذرا جس انتہاپسندانہ جوش کے ساتھ شیلی کا زمانہ گذرا تھا۔ بلکہ وہ اس بات میں بھی شیلی سے پوری مشابہت رکھتا ہے کہ اس کی آواز بھی عیسائیت اور سماجی رسوم Conventions کی مخالفت میں اتنی ہی بلند ہے جتنی بلند شیلی کی آواز تھی۔ اور جس طرح وہ ہر بات کا ایک دم فیصلہ کر لیا کرتا تھا، اسی طرح یہ بھی چھوٹتے ہی جو رائے قائم کر لیتا ہے اسی پر جما رہتا ہے۔ ممکن تھا اس صدی کے آغاز میں اسکے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا جو بائرن Byron اور شیلی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ لیکن زمانہ بدل چکا تھا، پبلک وسیع الخیال اور فہمیدہ ہو گئی تھی، اور نقادوں نے ایک زبان تسلیم کر لیا تھا کہ: سوئن برن انگریزی ادب کا بہت بڑا ناظم Verse Writer ہے اگر زندگی میں پوری طرح

قدر نہ کی گئی تو مرنے کے بعد ضرور کی جائے گی۔ اس لئے وہ اس سلوک سے بچا رہا جو اسکے ہم سیرت شیلی کے ساتھ کیا گیا تھا۔

اگر یہ واقعہ ہے یعنی فی الحقیقت شیلی نے سوئن برن کی صورت میں دوبارہ جنم لیا ہے، تو ہمیں ماننا چاہئے کہ اس نے اپنی اس دوسری زندگی میں پہلی زندگی کے تجربات سے بہت کچھ مفید ذہانت حاصل کرلی ہے۔ وہ یقیناً پہلے سے بہت زیادہ اچھا اور مضبوط کیرکٹر رکھتا ہے، اس نے اپنے انتہاپسندانہ خیالات و جذبات صرف نظم کی حد تک محدود رکھے ہیں، اور وہ گھریلو زندگی میں بھی اپنے چال چلن سے سماجی رسوم کی مخالفت نہیں کرتا۔

شاعری میں اس کا درجہ شیلی سے بہت بڑا ہے، اور ٹینی سن Tennyson روزے ٹی Rossetti اور براؤننگ Browning بھی اسکی برابری نہیں کر سکتے۔ بلکہ کوئی انگریز شاعر یہاں تک کہ ملٹن Milton بھی نظم کی استادی میں اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ مجھے صاف لفظوں میں کہنا چاہئے کہ وہ یورپ کے تمام شعرا میں ایک بڑا شاعر ہے، کیونکہ وہ انگریزی، فرنچ، یونانی، اور لاطینی زبانوں میں شعر کہنے کی یکساں اور اعلیٰ مہارت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے تمام شعرا بھی اسکے آگے نیازمندانہ سر جھکاتے ہیں۔

شاعری کی طرح تمثیل Drama نگاری میں بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے، اور وہ انگریزی کے تمام زندہ تمثیل نگاروں میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انیسویں صدی کے تمثیل نگاروں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی ہمسری کر سکے۔ اٹھارویں صدی کے بہترین ڈراموں میں صرف ایک ہی ایسا ڈراما ہے جو شاید اس کے ڈراموں کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکے، اور وہ شیلی کا "سن سی" Cenci ہے۔ لیکن اس کے "پرومتھیوس انباونڈ" Prometheus Unbound کے مقابلے میں سوئن برن کا یونانی حزنیہ "اٹلانٹا ان کیلیڈان" Atalanta in Calydon بہت کچھ سبقت لے گیا ہے۔

سوئن برن کی خداداد قابلیتوں کی ایک اور خصوصیت اس کی تنقیدی قابلیت ہے۔ وہ ایک بڑا

نقاد ہے؛ ایسا بڑا نقاد کہ اس کے انتقاد سے اسکے مخالف ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ بڑا جوہر شناس ہے، اور اسی چیز نے اسے ان لائق نوجوانوں کی مدد پر آمادہ کیا جو منظر عام پر آنے کے لئے کسی نمایاں شخصیت کی دستگیری کی محتاج تھے۔ اس نے ان کے نتائج افکار پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے، اور ان کی واجبی قدر افزائی کی۔ ان باتوں سے تم اسکی زبردست قوتوں کا اندازہ کر سکتے ہو۔

وہ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوا تھا، یونیورسٹی کی زندگی اختیار کرنے کے ساتھ ہی اس نے شاعری میں قدم رکھا، اسوقت سے ابتک اسکی شاعری کا سلسلہ جاری ہے، اور اب اس کا کلام مقدار میں اس صدی کے شاید کسی بڑے شاعر سے بھی بڑھ گیا ہے۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ سوئن برن کے بھیس میں **شیلی** نے دوسرا جنم لیا ہے؛ تو یہ بھی حقیقت ہے کہ پہلے وہ بچہ تھا اور اب دیو ہو گیا ہے۔

میرے ان الفاظ نے شاید تمھیں حیرت میں ڈالدیا ہو گا لیکن اس سے میرا مقصد اس خاص امتیاز کا اظہار ہے جو نظم و نثر میں وزن و قافیے اور ترنم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بڑا شاعر Poet کہنے سے میرا مطلب نظم کا بڑا استاد Master of Verse ہے۔ اگر تم مجھ سے یہ پوچھو گے کہ؛ کیا سوئن برن اخلاقی اور فلسفیانہ مطالب میں بھی ٹینی سن، روزے ٹی اور براوننگ سے بڑا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ نہیں۔ وہ بڑا ہے صرف علم و فضل، کثرت الفاظ، اور خوبی کے ساتھ ان کے استعمال کرنے میں۔ اور چھوٹا ہے، اعلیٰ جذبات اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین، اور مبہم احساسی کیفیات کے اظہار میں؛ جن سے شاعری میں دل فریبی پیدا ہوتی ہے، اور جس کی وجہ سے اس سے ایسے لوگ بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں جنھیں صناعت لفظی Art of Words سے سروکار نہیں ہوتا۔ اس حیثیت سے سوئن برن تمام وکٹورین Victorian شعرا میں بہت کم دلچسپ ہے۔ یہ غیر معمولی امتیازی قوت، صرف انگریزی ادب کے مطالعے ہی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے کلاسی کل Classical مطالعہ بھی ضروری ہے جس سے ادبی اظہار خیال کی اعلیٰ ترکیبوں کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ سوئن برن کے ہاں یہ چیز بہت زیادہ ہے، اور عام طور پر اس کے سمجھے جانے میں یہی ایک بڑی روک ہے۔ جو لوگ عالم نہیں ہیں اور ادب کے

ہر شعبہ پر یہ گہری نظر نہیں رکھتے وہ اس کے مطالب پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ میں سمجھتا ہوں اصناف سخن میں ملٹن کی طرح وہ بھی بہت کم مفید نمونے پیش کر سکتا ہے، اور خیالات وجذبات کے پہلو سے اسکا کلام ملٹن سے بھی کم قیمت ہے۔

شاعری کے مطالعے کے چند طریقے ہیں، عوام کی بڑی تعداد جو شعراء کی کتابیں خریدتی اور پڑھکے لذت پاتی ہے، عروضی مباحث سے عموماً بے خبر ہوتی ہے۔ ایک لاکھ سے زیادہ انگریز جو ٹے نی سن کا مطالعہ کرتے ہیں، مجھے شبہ ہے کہ ان میں سے ایک ہزار بھی اس کا آرٹ پوری طرح سمجھتے ہوں۔ البتہ شاید انگریزی یونیورسٹی کے ادبی نصاب لینے والے طلبہ اس کے فن کے محاسن جانتے ہوں۔ لیکن شعراء کی دولت و شہرت علماء سے نہیں، بلکہ بڑی بڑی نیم تعلیم یافتہ جماعتوں سے ہوتی ہے، جو انہیں جوش، جذبات، اور تخیل کے لئے پڑھتی ہیں، اور وہ انہیں لذت کے ساتھ تشفی سے بھی لبریز کر دیتا ہے، اور ان کے خیالات میں روشنی اور انکی عادتوں میں اصلاح پیدا کرتا ہے۔ اس کے لئے عوام کو شاعر کا طریق کار جاننے کی ضرورت نہیں ہے، صرف نتائج سمجھ لینے ہی کافی ہیں۔ یورپ کے شعراء ان معنوں میں وہاں کی آبادیوں کے معلم ہیں۔ یہ شاعری کے مطالعے کا عام طریقہ ہے۔

دوسرا طریقہ عالمانہ اور ناقدانہ ہے۔ لیکن اس سے میرا مطلب فلسفیانہ طریقہ نہیں ہے۔ یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم ایک شاعر کا پوری توجہ سے مطالعہ کرتے ہیں: قافیے کی بندش، اور ترکیب کی چستی جانچتے ہیں، اسکے حسین فقروں، اچھوتے لفظوں، نئی باتوں، اور انداز بیان کے دلکش اسلوبوں سے مزے لیتے ہیں؛ اور وہ الفاظ کے صورت و رنگ کی آمیزش سے جو نئے نمونے پیش کرتا ہے، ان کو پرکھتے ہیں۔ لیکن اس طرح کسی شاعر کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت بہت کچھ ہمارے ادبی رجحان اور تعلیمی مواقع پر منحصر ہے۔

پہلے طریقے کی نسبت مجھے شبہ ہے کہ تم سوئن برن کے ہاں کچھ نہ پا سکو گے۔ وہ شیلی کی طرح مطالب سے اکثر خالی ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرے طریقے کی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم اسکے بہترین کلام میں سے بہت کچھ منتخب کر سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مجھے صاف طور پر یہ بھی کہہ دینا چاہئے تاکہ آگے چل کر

تمھیں مایوسی نہو کہ تم اس کے ہاں وہ حسین اور موہنے خیالات نہ پاسکوگے جو روزے ٹی، ٹینی سن، اور براؤننگ کے ہاں پاتے ہو؛ جو ان جان طور پر دلوں میں گھر کر کے ہمیشہ آنکھوں میں پھرتے اور دلمیں سمائے رہتے ہیں۔

یہاں میں اپنے موضوع سے ہٹ کر اسکے کلام کے بدترین حصے کی نسبت بھی کچھ کہوں گا۔ یہہ حصہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس کی اشاعت نے انگلستان میں عام سنسنی پیدا کر دی تھی؛ ایسی سنسنی بائی رن کی "ڈان جان" Don Juan کی اشاعت کے بعد سے ابتک کبھی نہیں ہوئی۔ گو شاعرانہ حیثیت سے یہ ایک بہت بڑا لریکل Lyrical تحفہ ہے، جو اس کتاب کے ذریعے اس نے انگریزی ادب کو دیا ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ یہہ تحفہ بعض حیثیتوں سے نہایت غیر اخلاقی ہے؛ ایسا شدید غیر اخلاقی کہ اس کے آگے بائی رن کی انتہائی عریانیاں بھی پاک اور معصوم نظر آتی ہیں۔ تعجب ہے اسکو زندہ رکھنا انگریزی پبلک نے کیسے جائز رکھا۔ لیکن شاید اس نے یہ زندگی اپنے حسن کی وجہ سے پائی ہے! چند سال ہوئے، مجھے یاد پڑتا ہے، ایک لائق انگریز تبصرہ نگار نے ایک فرانسیسی نظم کے متعلق لکھا تھا کہ: یہہ نظم فرانسیسی زبان کی حسین ترین نظم ہے! لیکن بدقسمتی سے مطبوعات میں اس کا ذکر تک نہیں کیا جاسکتا۔

اگر کسی شاعر کے کلام میں اعلیٰ محاسن کے ساتھ انتہائی عریانیاں بھی ہوں تو اس کے محاسن اسکی عریانیوں پر غالب ہو جائیں گے، اور اس کی عظمت ہمیشہ قائم رکھیں گے۔ عریانی ایک عیب ہے؛ لیکن یہ عیب زندہ رہ سکتا ہے، اگر اس میں کچھ حسن ہو۔ سوئن برن کا کلام فرینچ شاعری کیطرح اپنے محاسن کی وجہ سے قابلِ قدر، اور اپنی انتہائی عریانیوں کی وجہ سے قابلِ نفرت ہے، کیونکہ اس نے نہایت بے باکی سے ان کہنی کہی ہیں۔ تاہم ہمیں اس کے اس حصۂ کلام کو بھی قبل از وقت کوئی رائے قائم کئے بغیر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

ہمیں سوئن برن کو انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ اگر کسی کی قلم سے کچھ غیر اخلاقی باتیں نکلیں، تو بلا تحقیق یہ نہیں فرض کر لینا چاہیئے کہ اس کی زندگی بھی ایسی ہی غیر اخلاقی ہوگی۔ یہہ

ضروری نہیں ہے کہ جو بڑی بڑی اخلاقی باتیں کہیں ان کا عمل بھی ویسا ہی ہو۔ **شیلی** اس کا ایک نمونہ ہے۔ وہ نہایت باعصمت شاعر تھا' اسکے مجموعۂ کلام میں ایک سطر بھی ایسی نہیں ہے جو نامناسب کہی جا سکے؛ لیکن بدقسمتی سے عملاً اسکی زندگی اس کے بالکل برعکس تھی۔ بخلاف اس کے **سوئن برن** جس نے ہزاروں غیر اخلاقی شعر کہے ہیں' اپنی عملی زندگی ایسے داغوں سے پاک رکھتا ہے۔ وہ شاعری میں جتنا عریاں اور بے عصمت ہے' عمل میں اتنا ہی باحیا اور باعصمت ہے۔ عام طور پر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ شاعر کی صناعی حیات Artistic feeling کو بدی کی حیات Vicious feeling سمجھ لیا جاتا ہے' اور جہاں وہ رسوم کی بندشوں سے الگ ہوتا ہے' یہ خیال کیا جانے لگتا ہے کہ وہ نظامِ اخلاق سے نفرت کر رہا ہے۔

تم تھوڑی دیر کے لئے اپنے تئیں ایک نوجوان طالب العلم کی جگہ سمجھو' اور اپنے سامنے وہ تمام محسوسات و خیالات لانے کی کوشش کرو جو فطرتاً ایک نوجوان میں ہوتے ہیں۔ **سوئن برن** نے یہ عریاں نظمیں ایسے ہی زمانے میں کہی تھیں۔

مغرب کے ہر متمدن لڑکے پر کئی دور گذرتے ہیں۔ جن میں وہ انسانی تاریخ ارتقا کے مختلف دوروں سے گذرتا ہے' اور اس کی انفرادی زندگی میں نوعِ انسان کی تشریحی' اور نفسیاتی تاریخ دہرائی جاتی ہے۔ تم دیکھو بچہ بالکل وحشی ہوتا ہے' اس میں نہ مذہب ہوتا ہے نہ رحم' اسکی ننھی سی روح بیدردی' اور خود غرضانہ چالاکیوں سے معمور ہوتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے جو قوی نشو و نما پاتے ہیں' وہ حفاظت ذاتی کے قویٰ ہوتے ہیں' اور یہ اولین عہد انسانیت کے قویٰ ہیں۔ اسکے بعد گھر کی تربیت اس میں نیکی اور بدی کے خیالات' اور مذہبی حیات پیدا کرتی ہے' اس دور میں اسکی حالت بہت کچھ عہد متوسط کے انسان سے مشابہ ہوتی ہے' اور اسی کے ساتھ وہ تاریخ ارتقاء انسانیت کے عہد متوسط میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر کالج کا تعلیمی نصاب قدیم یونانی حیرت انگیز تہذیب سے اس کا تعارف کراتا ہے جس سے اس کے دل میں **یونان** کی سماجی تہذیب کا احترام پیدا ہوتا ہے' اور وہ موجودہ دنیا کے مقابلے میں' اس زمانے کی اخلاقی برتری کی عظمت کرنے لگتا ہے' اور اس کے اندر عہد نوزائیدگی Renaissance

کے سے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ اگر وہ حسن کا احساس رکھتا ہے، اور اگر اس کے قویٰ کی تربیت زیادہ تر جمالیاتی Esthetical ہوتی ہے تو وہ محبت کے جوش سے لبریز ہو جاتا ہے، اور والہانہ طور پر قدیم فطرت پرستی Paganism کا احترام کرتے اور اسکے مقابلے میں جدید ماحول کو ناپسند کرنے لگتا ہے۔ یہ احساس اول تو اکثر و بیشتر عارضی ہوتا ہے، لیکن اگر کبھی اس کی جڑیں دل میں راہ پا لیتی ہیں تو پھر اسکی ساری زندگی ہی کو بدل دیتا ہے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ایک ایسے نوجوان کے لئے جس پر پُر جذبات جوانی چڑھ رہی ہو، کالج کا ادبی نصاب دفعتہً یونانی زندگی کی حسین اور دل فریب کہانی پیش کر دے تو یہ یقینی امر ہے کہ انسانیت کے اولین جمالیاتی قویٰ اسکی زندگی کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اب ہمیں سوئن برن کی حالت پر غور کرنا چاہئے جس کے متجاوز جمالیاتی اور عالمانہ قویٰ، ان اثرات سے ابتدائے عمر میں دوچار ہوئے، ان سے اس کے نوجوان نفس کو زلزلے کا سامنا پہنچا، اور اس کا فطری نتیجہ ایک شدید ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوا جو تمام ادبی، مذہبی، اور سماجی رسوم کے خلاف تھا۔ اگرچہ زمانے اور ماحول نے اسکی مخالفت کی، اور دھمکیوں اور لعنتوں کے اوچھے ہتیار لے کر قدیم فطرت پرستی کی روح کو جو اس کے نزدیک ایک خطرناک چیز بنتی، چھپانے اور دبا دینے کی کوشش کی، لیکن یہ باتیں ایسی تھیں جیسے آگ پر تیل۔ وہ جوان تھا، اور اب بھی ہے، اور راک نہایت نڈر، مشتعل، اور باہمت طبیعت رکھتا ہے۔ ایک بڑا خیال دفعتہً اس کے سامنے آیا، اور اس نے ٹھان لیا کہ اس کو انجام دئے بغیر نہ رہوں گا۔ یہ خیال معمولی نہ تھا، بلکہ انگریزی شاعری کے لئے ایسی مسرور آزادی حاصل کرنیکی کوشش تھا جیسی آزادی فرانسیسی شاعر کو موجودہ زمانے میں حاصل ہے۔ اس نے اظہار خیال کی تمام راہوں میں کامل آزادی کے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی، اور مزاحمتوں کا ایسی بے جگری سے مقابلہ کیا جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ یہ کتاب جس پر اعتراض کیا جاتا ہے اسی کوشش کا ثمرہ ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سوئن برن ان اصلاحی کوششوں میں کامیاب ہوا؛ کیوں کہ اس کی کوششیں کسی قدر حد سے گذری ہوئی اور قبل از وقت تھیں۔ اسی کے زمانے میں ایک بڑا فرینچ شاعر

چارلس بودلیر Charles Budelaire تھا جس پر علانیہ سر عدالت نفرت کیگئی، حالانکہ اس کی نظمیں سوئن برن کی نظموں سے بہت کم دلیرانہ تھیں۔ اسی طرح ایک بڑے فرینچ ناولسٹ فلے برت Flaubret کو اپنے ایک ناول پر عدالت میں جواب دینا پڑا، جس کے خیالات اب بہت معصومانہ خیال کئے جاتے ہیں۔ فرینچ ادبیات میں آزادی کے مشہور علم بردار انشا پرواز زولا Zola اور شاعر ریشی پن Richepin نے اظہار خیال کی ایسی آزادی کو جائز رکھے جانے کے لئے جو کوششیں کیں وہ سوئن برن کی کوششوں کے بہت بعد کیں۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوئن برن کی کوششیں بہت قبل از وقت تھیں۔ انکو اپنی جلدبازی اب دیکھنی چاہئے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ وہ سرے سے غلطی پر تھا، کامل آزادی کا فرینچ شاعری پر یہ اثر ہوا کہ اب ہمیں اس میں اچھے خیالات ملتے ہیں، لیکن انگریزی ادب میں اس کا یہ اثر ہوا کہ سوقیت کے ساتھ غیر اخلاقی غلو کیا جانے لگا، اور جب اس چیز کا نیا پن ختم ہوگیا تو اس کے خلاف ردعمل شروع ہوا، اور قومی حیا اور نفرت نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ یہ مختصر سا زمانہ انگلستان کی تاریخ میں ایک " کارنے وال " Carnival زمانہ تھا۔ انگریزی رائے عامہ کی سوجوں نے پوری طرح اس کی مخالفت کی، اور جابرانہ قدامت پسندی نے کچھ دنوں کے لئے ادبی ترقی کی راہ میں بہت سنگین رکاوٹیں پیدا کردیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہم انگریزی ادب میں وہ کام نہیں کرسکتے جو فرانسیسی ادب میں کرسکتے ہیں۔ لیکن صرف ایک سوئن برن ایسا تھا جو یہ کام کرسکتا تھا، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی زبان پوری طرح مکمل بھی نہیں ہے۔ نہ اس میں جتنا چاہئے حسن ہے، نہ لوچ اور نہ عریانیوں کی نفیس ادا و تعبیر کی صلاحیت۔ اسکے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ انگریزی کیرکٹر اتنا شائستہ بھی نہیں ہے۔ ایک فرانسیسی نہایت جرأت اور حسن ادا کے ساتھ ایک نہایت ہی عریاں بات کہہ سکتا ہے، مگر ایک انگریز، سوائے سوئن برن کے، نہیں کہہ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اب پوری طرح تمھارے ذہن نشین ہوگئی ہوگی اور تم یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہوگئے ہوگے کہ اس غلطی کی وجہ ایک بڑی حد تک اس کی جوانی، اور اس کی

حیرت انگیز خداداد قابلیت تھی۔ اُس نے اپنی اعلیٰ قابلیت سے جو کچھ کیا، وہ انگریز شعراء میں سے ایک بھی نہ کر سکا۔ یہ ایک صداقت ہے کہ صدیاں چاہئیں کہ انگریزی زبان میں کوئی ایسا پیدا ہو جو ایسا کام کر سکے جیسا سوئن برن نے کیا۔ (باقی آیندہ)

ابوالخیر مودودی

نوٹ۔ مضمون بالا سے متعلق ہم آیندہ اظہار خیال کریں گے۔

کہتے ہیں کہ "اولڈ بوائے" کا نومبر نمبر اپنی کتابت، طباعت، اور صنعت کاری کے لحاظ سے بہت خوب رہا۔ ہاں! ہوگا!! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ رسالہ کو اس سے بہتر حالت میں لانے کی آئندہ سعی بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے، اور ہم انشاءاللہ! اپنے فرض سے غافل نہ رہیں گے۔ ہمارے جن بھائیوں کو پریس کے کام کا تجربہ ہے، اُن کو رسالہ زیر بحث میں یکایک تغیر ضرور حیرت میں ڈال دیگا۔ سچ یہ ہے کہ ماہر فن کی حیثیت سے وہی اس کی بڑی قدر کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ طباعت کے کسی کام کو انجام تک پہنچانا، رستم دستاں کے ہفتخواں سے کم نہیں، اور کام لینے والے کو کس قدر صعوبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے ناظرین پر اس امر کو ہم مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ دار الطبع جامعہ عثمانیہ کے مددگار مہتمم جناب مولوی ابوبکر خانصاحب خویشگی کی ذاتی دلچسپی، نفاست پسندی، اور ذوق سلیم کو اس باب میں بڑا دخل ہے اور ایک خوش فکر شاعر کی طرح کبھی دو بجے رات کو اُنکی آنکھ کھل جاتی ہے تو "اولڈ بوائے" ہی کے خیال کو دماغ میں لیکر اٹھا کرتے ہیں۔ برادر مکرم شیخ سعید محمد خانصاحب اپنے ایک عزیز کا ایسا اچھا کام دیکھ کر ضرور خوش ہوئے ہوں گے۔ لیکن ہم اُنسے زیادہ خوش نصیب ہیں کہ اُن کے عزیز حیدرآباد میں بیٹھ کر اس کد و کاوش میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ مسٹر خویشگی نہ صرف فن طباعت کے ماہر ہیں، بلکہ فن جریدہ نگاری سے بھی خوب واقف ہیں، اور اس لحاظ سے ہم اُن کے مفید مشوروں سے گاہے گاہے فائدہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔

شعلۂ ایمانی

جناب مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی

عالم کو منور کرے شعلۂ ایمانی — پھر سوز دروں سے کر پیدا شرر افشانی

ہاں جادۂ ملت سے لغزش نہ قدم کھائے — دے دل کو ثبات ایسا اے قوت ایمانی

جو پھونک دے سینہ کو اور دل کو جلا ڈالے — وہ سوز عنایت کر اے آتش پنہانی

فاران کے شعلہ کو بھڑکا دے جہاں بھر میں — پھر برق تجلے بن اے جذبۂ روحانی

پھر شمع رسالت سے عالم میں اجالا کر — پھر خاطر مسلم سے کر دور پریشانی

مشہور زمانہ تھی کل تک تری آزادی — اے باد صبا! تا کے ویرانہ میں زندانی

سطوت کی زلیخا ئی ہے والہ و شیدائی — اب چاہ سے باہر آ اے یوسف کنعانی

تو سایۂ دولت ہے گم کیوں تری غیرت ہے — اے بال ہما کب تک ہر خس کی مگس رانی

سوکھی ہوئی کھیتی کو پھر نشو و نما دیکر — اک بار ہرا کر دے اے رحمت یزدانی

کیا حال کہوں اپنا اے ترمذی محزوں!
اس کشمکش غم سے ہوتا ہے لہو پانی

شرح دیوان غالب پر ایک نظر

(بہ سلسلہ گذشتہ)

۷

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا بہ قدرِ لب و دنداں نکلا

شرح :- "یعنی جس میں جتنی قابلیت تھی اس نے اسی قدر مجھ سے لذت درد کو حاصل کیا ورنہ یہاں کچھ کمی نہ تھی" لیکن اس شرح سے یہ نہیں واضح ہوتا کہ لذّتِ درد کے "ریزہ" یا کون یار ہیں؟ اور کس طرح انہوں نے اس خوان نعمت سے یہ قدر حوصلہ لب و دنداں سیری حاصل کی؟ میرے خیال میں مصنف کی مُراد یاروں سے یا تو عشق ہے جس نے قایل کے دل حسرت زدہ کے خوان نعمت سے کام نکالا جیسا کہ مصنف نے اور ایک جگہ اسی مضمون کو صاف صاف لفظوں میں ادا کیا ہے۔ شعر

جگر کو مرے عشق خوننابہ مشرب
لکھے ہے خداوند نعمت سلامت

یا یہ کہ قایل دردرسیدہ ہے (جیسا کہ مرزا کی سوانح پڑھنے والوں کو معلوم ہے اور جس کا اظہار خود ان کے کلام سے جابجا ہوتا ہے) اسلئے اس کا کلام سراسر مائدہ لذت درد ہے جس سے قارئین و سامعین بقدر استعداد فہم لطف حاصل کرتے ہیں۔ لیکن یہ معنے لینے کے لئے دلِ حسرت زدہ کے ساتھ کچھ اور اضافہ کرنا ہوگا یعنے یوں کہنا پڑیگا کہ۔ "میرے دلِ حسرت زدہ سے نکلا ہوا کلام مائدہ لذت درد تھا جس سے کام یاروں کا الخ"

حقیقت یہ ہے کہ شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو ان میں سے کسی قرینے پر بھی دلالت کرے۔

۸

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

شارح مدظلہ نے مجموعہ خیال کے فرد فرد ہونے کے معنے یہ بتائے ہیں کہ "عقل و ہوش کا مجموعہ غیر مرتب تھا یعنے ناتجربہ کاری کا زمانہ تھا"۔ میں عرض کروں گا کہ مجموعہ ہوش و عقل کے فرد فرد ہونے کو ناتجربہ کاری سے کیا تعلق! یہ صورت تو اختلال حواس اور فتور عقل پر دلالت کرتی ہے نہ کہ ناتجربہ کاری پر۔ بظاہر مصنف کا منشا یہی ہے کہ وہ بچپن ہی سے جبکہ وہ عشق کا مفہوم سمجھنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا حسن پرست اور بندۂ عشق تھا (تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا)۔ اور اس مطلب کی توثیق لفظ "ابھی" سے ہو رہی ہے، لیکن الفاظ اس مضمون کے مساعد نہیں ہیں۔ اگر خیال کی جگہ فہم یا ادراک کا لفظ ہوتا تو معانی میں یہ بے ربطی نہ پیدا ہوتی۔

۹

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

مضمون صاف ہے۔ شارح علامہ تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ بھی احتمال ہے کہ مصنف نے بہ یک کف بردن صد دل میں حساب عقد انامل کی طرف اشارہ کیا ہو" (عقد انامل کا حساب بھی بتایا ہے) یہ تاویل بعید ہے۔ ایک ایک ہتھے میں سو سو دلوں کو لینے کی کوشش بجائے خود مشکل پسندی کی دلیل ہے۔ مرزا بیدل رح چہار عنصر میں ایک مقام پر لکھتے ہیں "اگرچوں سبحہ صد دل فراہم آرد یکے باد دیگرے نہ جوشد"۔ یہی سبحۂ صد دل ہے جو مرزا غالب کے ہاتھ آیا ہے۔ مرزا غالب نے سبحہ ہزار دانہ اشک بھی کہا ہے (تلاش کرو جدید نسخہ حمیدیہ دیوان غالب میں) اور یہ خیال بھی بیدل ہی کے یہاں سے لیا گیا ہے۔ ع

کہ چو سبحہ ہر قدم او فتد بہ ہزار آبلہ کار ما

۱۰

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

شارح نے "وفا" سے وفاداری عشاق مراد لی ہے مگر کوئی وجہ نہیں پائی جاتی کہ عمومیت کو خصوصیت سے بدلا جائے۔ میرے نزدیک تو مرزا غالب بھی وفا کے اسی فقدان عام کے شاکی ہیں جیسکے شیخ سعدی اس شعر میں شکایت کرتے ہیں ؎

یا وفا خود نبود در عالم | یا مگر کس درین زمانہ نکرد

فرق صرف اسی قدر ہے کہ ؎

ہیں دل عاشق و رقیب دو نظر کے منتظر | ایک پہ ہیں ہزار نقش دوسرا سادہ ایک ہے

۱۱

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

شرح ہے کہ "زمرد کے سامنے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ مگر تیرا سبزۂ خط کیسا زمرد ہے کہ افعی زلف پر اسکا اثر نہ ہوا"۔ یہی معنے شوکت صاحب نے بھی لئے ہیں۔ مگر اس شرح سے سبزۂ خط کا استخفاف ہو گیا۔ حالانکہ۔ ع

ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نگفت

میرے خیال میں مصنف کا مقصد افعی زلف کی سرکشی پر زور دینا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زمرد سے افعی دب جاتا ہے مگر تیرا افعی کاکل ایسا سرکش ہے کہ عام زمرد کا تو کیا ذکر سبزۂ خط کے زمرد سے بھی نہ دبا۔ یعنے انتہا کا سرکش ہے۔ دوسرے مصرع کا حرف تاکید "بھی" انہیں معنوں کا موید ہے۔

۱۲

دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزل تقوی نہ ہوا

اس شعر کے قافیہ کی نسبت شارح علامہ نے یہ افادہ ادبی فرمایا ہے کہ "مصنف نے فارسی والوں کا اتباع کیا ہے کہ وہ لوگ عربی کے جس کلمے میں ی دیکھتے ہیں اسکو کبھی الف اور کبھی یا کے ساتھ نظم کرتے ہیں؛ تمنی و تمنا، تجلی و تجلا، تسلی و تسلا، ہیولی و ہیولا، دنی و دنیا بکثرت اُن کے کلام میں موجود ہے۔" میں اسپر اتنا اضافہ اور کردوں گا کہ خلاف محاورہ اسطرح کے اجتہادات جائز نہیں سمجھے جاسکتے۔ الف مقصورہ جو عربی میں بصورت ی لکھا جاتا ہے اس پر ختم ہونے والے وہی الفاظ اُردو میں یائے معروف کے ساتھ قافیہ ہوسکتے ہیں جو عام طور پر ہماری زبان میں ی کے ساتھ بولے جاتے ہیں جیسے عیسیٰ۔ لیلیٰ۔ تسلی۔ تجلی لیکن اگر دنیا کی جگہ کوئی دنی لکھے تو سننے والے کو بے تحاشا ہنسی آجائیگی۔ یہی حال ہیولی اور تقوی کا ہے۔ غالب کی شان استادی اُن کیلئے اس اتباع یا اجتہاد کو جائز رکھ سکتی تھی مگر دوسروں کو ایسے قوافی سے اجتناب واجب و لازم ہے۔

۱۳

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

حاصل شرح ہے "یعنے کہ حرارت غریزی جو کہ باعث حیات ہے، خود وہی ہر وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے"۔ شارح علامہ نے جو مطلب اس شعر کا بیان فرمایا ہے اس سے بہتر نہیں ہوسکتا اسلئے کہ عمر بالضم والفتح زندگانی و زیستن کے معنوں میں ہے اور تعمیر کے معنے ہیں کسی کو بڑی عمر دینا۔ لیکن عام طور پر اُردو زبان بولنے اور سمجھنے والوں کے حاشیۂ خیال میں بھی تعمیر کے یہ لغوی معنے نہ ہوں گے یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعمیر و خرابی کو خرمن اور خون گرم دہقان سے کیا مناسبت ہے اور یہ استعارات کہاں تک باہم دست و گریباں ہیں؟ کھیت مکان کے اندر ہے یا مکان کھیت کے اندر؟

دوسری جگہ مصنف نے پھر اسی مضمون کو کسی قدر تغیر کے ساتھ اس طرح نظم کیا ہے ؎

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے   برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

اور اس شعر کا مطلب شارح نے خود مصنف کے الفاظ میں نقل کیا ہے جو یہ ہے "موجودیت لانے کی

منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگت تو او پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیئے کہ درخت
یا غلہ جو کچھ بو یا جاتا ہے دہقان کو جوتتے بوتے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو
گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت وکار میں گرم ہوا
ہے وہی لالے کی خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت، اور صورت رنج ہی ہے
غرض یہ ہے کہ ہستی دار بلا ہے اگر کوئی یہاں راحت پانے کا قصد کرتا ہے تو وہ راحت عین آفت ہو جاتی
ہے۔ دہقان لالے کے لئے خون گرمی و سرگرمی کرتا ہے لیکن اسی سے لالے کو داغ حاصل ہوتا ہے"۔ اب
میں ایک شعر مرزا بیدل کا پیش کرتا ہوں اسے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں ؎

شعلہ کاراں را بہ خاکستر قناعت کردنست
ہر کجا عشق است دہقاں سوختن ہم حاصل است

اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ شعر بالا میں اور مرزا کے اشعار میں کیا تعلق ہے۔ 'سوختن' کا حاصل کشت ہونا اس
خیال کا مورث ہے کہ "مزارع کا جو لہو کشت وکار میں گرم ہوا ہے وہی خرمن کا برق ہے" لیکن مرزا بیدل
یہ فرماتے ہیں کہ عشق کی دہقانی کا حاصل سوختن ہے اسلئے عاشقوں کو خاکستر ہی پر قناعت کرنا چاہیئے۔
یعنے عشق کا نتیجہ ہی یہ ہے کہ عاشق کی ہستی مٹ کر خاک سیاہ ہو جائے اسلئے عاشق کو چاہیئے کہ وہ اپنی
تباہی' بربادی' نامرادی' وغیرہ وغیرہ پہ قانع رہے اور فنائیت کو اپنی ریاضت کا حاصل سمجھے مرزا نے اس
خیال میں ترمیم و تحریف کرکے دوسرے الفاظ میں نظم کرنا چاہا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جسطرح خود دہقاں
کا خون گرم خرمن کی برق کا ہیولا ہے یعنے جس طرح دہقان کے خون کی گرمی یا خوں گرمی خرمن کے لئے
برق بنجاتی اور اسے خاک سیاہ کر دیتی ہے اسیطرح میری تعمیر (زندگی دراز) میری خرابی (فنا) کا
کا باعث ہے۔ اس مثال کی بے ربطی ظاہر ہے۔ اس لئے کہ دہقان کی خون گرمی یا اس کے خونِ گرم کا
برق بنکر خرمن پہ گرنا اور اسکو جلا دینا ادعائے محض اور بے معنی سی بات ہے حقیقت واقعہ اور عین مشاہدہ
تو یہ ہے کہ دہقاں کی خون گرمی ہی کشت زار کی سرسبزی اور فراہمی خرمن کا باعث ہوتی ہے۔ تعمیر و خرابی
اور خرمن و برق کے الفاظ بھی غیر متناسب ہیں۔ پس اگرچہ خیال صحیح ہے مگر مثال خلافِ حقیقت اور
غیر مربوط ہے اسلئے شعر کے الفاظ معانی سے ربط نہیں رکھتے۔

دوسرے شعر میں خونِ گرمِ دہقاں کو برقِ خرمنِ راحت کہا گیا ہے اور اس دعوے کے اثبات میں پہلا مصرع " کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے" پیش ہوا ہے۔ جسکی تشریح خود مصنّف نے کی ہے۔ مگر یہ تشریح بھی کچھ ایسی ہے کہ شارح علامہ نے اسکو نقل کر کے سکوت اختیار فرمایا ہے۔ لیکن میں عرض کرونگا کہ یہاں بھی خونِ گرمِ دہقاں کا لالے کی داغ سامانی کا باعث ہونا ادعاہی ادعا ہے اور اسکو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ حضرت شوکت مرزا کے بہت بڑے معرف ہیں لیکن وہ بھی فرماتے ہیں کہ " اس شعر اور متذرجۂ بالا شعر کے مصرعوں میں باہم ربط نہیں۔ بھلا لالہ کو کارگاہ سے کیا تعلق۔ اگر مصرع اولی یوں ہوتا۔

گلستاں ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے

تو کچھ مناسبت بھی نکل آتی پھر بھی دوسرے مصرعہ کو پہلے مصرعہ سے لگاؤ نہیں۔"

۱۴

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

شرح ہے " رفتار کو موج اور نقشِ قدم کو حباب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح موج کا ذوقِ روانی کم نہیں ہوتا اسی طرح میرا ذوقِ صحرانوردی بھی کم نہ ہوگا۔" مطلب تو حاصل ہو گیا لیکن الفاظ شعر پر پھر ایکبار نظر ڈال جائیے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ جسطرح (پانے) موج کا ذوقِ روانی (کثرت حباب کی وجہ سے) کم نہیں ہوتا، اسیطرح میرا ذوقِ صحرانوردی (کثرت آبلہ پائی سے) کم نہیں ہوتا۔ یعنے میرے آبلۂ پا جو حبابِ موجۂ رفتار ہیں ذوقِ صحرانوردی میں مزاحم نہیں ہوتے۔ لیکن بجائے " آبلۂ پا " کہنے کے قافیہ کی مجبوری سے شاعر " نقشِ قدم " کہہ گیا۔ جو صحیح نہیں ہوسکتا، اسلئے کہ نقشِ قدم مانعِ رفتار یا مورثِ ماندگی نہیں ہوا کرتے۔ بہرحال پائے تخیّل کی آبلہ داری سے معانی شعر میں لنگ پیدا ہو گیا ہے۔

حقیقتِ پروانہ

اے عاشقِ دل خستہ! اے سوختۂ الفت!! تو رازِ محبت کا اک سالکِ یکتا ہے
رگ رگ میں نہاں تیری ہے آگ محبت کی تو عشقِ مجسم ہے، تو حسن کا بندہ ہے

تو رہبرِ کامل ہے۔ اس عشق کی منزل میں ہر نقشِ قدم تیرا، اک شمعِ ہدایت ہے
تقلید تری واجب، ہے رہروِ الفت پر یعنے ترا جل بجھنا، اک درسِ محبت ہے

آ۔ دل میں تجھے رکھ لوں آ، اے شیفتۂ الفت! تیری ہی طرح میں بھی، بیمارِ محبت ہوں
بیخود بھی ہوں مضطر بھی، دیوانہ و رسوا ہوں مستِ مئے الفت ہوں، سرشارِ محبت ہوں

تو شمع کا عاشق ہے، میں شمعِ حقیقت کا تو اسکا ہے شیدائی، میں اسکا ہوں دیوانہ
آ۔ جان فدا کر دیں، جل بجھ کے سرِ محفل رہ جائیگا دنیا میں، دونوں کا اک افسانہ

دفینہ

جوابِ پروانہ

کیا مجھ سے مخاطب ہے، اے نرگسِ مستانہ! کس طرح سناؤں میں، حالِ دلِ دیوانہ
پُرشور ہی، غمگین ہی، بسمل ہی محبت میں منظور ہی گر تجھ کو، سن لے مرا افسانہ

تو نور مشکل ہے، میں سوزِ مجسم ہوں تو شمع منور ہے، میں سوختہ ساماں ہوں
کچھ میری حقیقت کو، محسوس کیا تو نے؟ جلنا مرا شیوہ ہی، میں حسن پہ قرباں ہوں

آنکھیں مری کہاں ایسی، ہوں قابلِ نظارہ ہاں! تیری محبت میں، پھرتا ہوں میں آوارہ
آ، دونوں بہم ملکر، دکھلادیں زمانہ کو تو شمع مرے دل کی، میں ہوں ترا "پروانہ"

بسمل

مولوی سید مظہر اللہ صاحب اپنے اوقات فرصت کو خالص مذہبی کاموں پر صرف فرماتے رہتے، اور اس باب میں عملی طور پر اپنی وابستگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ مسلمانان علاقہ رزیڈنسی حیدرآباد کی جانب سے ۔ا ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو وکٹری گراونڈ پر مجلس میلاد النبی ہمارے بھائی کی عملی دلچسپیوں کا تازہ ثبوت ہے۔ میلاد کمیٹی کے معتمد (سکرٹری) کی حیثیت سے اس کام میں جو تکلیف انہوں نے برداشت کی ہے اسکا اجر تو بارگاہ ایزدی سے ملے گا، مگر دنیاوی صلہ یہ ہے کہ جلسہ بہت کامیاب رہا، اور حضور پُرنور نے بھی اس مجلس مبارک میں شرکت فرماکر اپنے حسن عقیدت کا اظہار فرمایا۔ خداوند عالم اپنے بندوں کو حقیقی تعلیم اسلام سے بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس مجلس مبارک میں جن مواعظ کو حاضرین نے سنا ہے، اُن سے سبق حاصل کریں۔

اولڈبوائے کا دورِ ثالث

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام — ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

کہتے ہیں کہ بلی کے سات جانیں ہوتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے "اولڈبوائے" میں بھی کیٹ Cat کی روح حلول کرگئی ہے کہ مرتا ہے اور پھر جی اوٹھتا ہے[1]۔ "اولڈبوائے" نے پہلا جنم کاشی کی سرزمین مقدس پر لیا جبکہ اوسکی ماں بھائی عشرت؎ اور باپ علیگڈھ کے کھلنڈروں کے سرغنہ بھائی شوکت تھے جو اب نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام میں صرف معلم الملکوت سے دوسرے درجہ کی شہرت رکھتے ہیں اور "مولانا" کے ڈراونے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ "اولڈبوائے" کا یہ پہلا قالب یا پہلا دور بہت زیادہ دلکش اور دلفریب تھا لیکن جنگِ عظیم کے آتش فشاں شعلے اسکے واسطے برق خرمن بنگئے اور چند سال میں علیگڈھ کی صحبتوں کا یہ افسانہ گو نظروں سے غائب ہوگیا؛ سید احمد خانی میکدہ کے متوالے برسوں اس کمسن ساقی کی یاد میں خون کے آنسو بہاتے رہے۔

یاد ایام فراموش ہونے کو تھی کہ فرزندان علیگڈھ کے نشین یعنے نواب سکندر صولت کے دارالاقبال بھوپال سے "اولڈبوائے" نے دوسرا جنم لیا اور چہار طرف سے مبارک سلامت کی صدائیں گونج اٹھیں اور

---

[1] فانی ہی نہیں فانی! میں درس فنا بھی ہوں ۔ افسانۂ عبرت ہوں اور عبرتِ افسانہ (اولڈبوائے)

بہت جلد سعید کا نورِ چشم اولڈبوائز کی گودوں میں کھیلنے کودنے لگا۔ اگرچہ اولڈبوائے کا یہ نقش ثانی پہلے کی طرح تو حسین اور کرشمہ زا نہ تھا تاہم علیگڈھ کے شیدائیوں کے لیئے آنکھوں کا تارا تھا۔ یہ دور بھی چشم زدن میں ختم ہو گیا۔

بھوپال کے بعد اب مسلمانان ہند کی سطوت گم شدہ کی یادگار احسن البلاد حیدرآباد سے "اولڈبوائے" نے تیسرا جنم لیا ہے اور اس دفعہ کارساز عالم نے کبرسنی میں بھائی منظر کی گود آباد کی ہے۔ وَكَذَالِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيْد۔ بھائی منظر ایک مشہور مضمون نگار باپ کے خلف الرشید اور خود بھی علمی مذاق اور ذوق سلیم رکھتے ہیں، اسلیئے یہ امید کرنا کچھ بیجا ہوگا کہ انکی آغوش عاطفت میں اولڈبوائے عمر طبیعی حاصل کرسکے گا۔ آمین

"اولڈبوائے" اسوقت ایک سخت پرآشوب زمانہ میں عالم وجود میں آیا ہے جبکہ علیگڈھ کی شہرت اور سرسید کی عمر بھر کی کمائی معرض خطر میں ہے اور کمسن مسلم یونیورسٹی کے کارنامے میزان محاسبہ میں تولے جارہے ہیں۔ سرابراہیم رحمت اللہ صاحب کی صدارت میں ہرہائینس چانسلر صاحبہ کی قائم کردہ کمیٹی تحقیقات عمال یونیورسٹی کے دفتر اعمال کو جانچ رہی ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۙ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۙ۔

ایسے وقت میں "اولڈبوائے" کے پہلے نمبر میں یونیورسٹی کے نیک و بد کے متعلق ایک حرف بھی نہ ہونا جس قدر مایوس کن ہے اسکا اندازہ کرنا دشوار ہے بالخصوص جبکہ اس کے معاونین قلمی کی فہرست میں نواب نذیر جنگ اور مسٹر عنایت اللہ جیسے فرزندان کالج کے نام درج ہیں جو سرسید اور نواب محسن الملک مرحوم کے عہد کی زندہ تاریخ ہیں۔

اردو علم ادب کے رسالے تو ہندوستان میں سیکڑوں شائع ہوتے ہیں اور انمیں سے بعض قبولیت عام کے تمغے بھی حاصل کرچکے ہیں۔ "اولڈبوائے" کی ضرورت اور مقبولیت ادبی اور تاریخی مضامین کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وہ صرف اس حالت میں اپنے وجود کو باوجود بنا سکتا ہے کہ۔ع

دور میں ساقی رہے گردش میں پیمانہ رہے

اور میخوار ان کالج کو ائے میکدۂ لغولیت کی مئے کہنہ ترقی جدید کے جام نو میں بھر بھر کر پلائی جائے۔ بطور نمونہ کے میں چند عنوان ذیل میں درج کرتا ہوں جن پر مضامین کا سلسلہ غالباً پرلطف اور دلچسپ ہوگا:۔

(۱) محمڈن کالج اور مسلم یونیورسٹی کے طلباء کی زندگی کا موازنہ۔

(۲) مسلم یونیورسٹی کے قانون اور قواعد پر تنقیدی مباحثہ۔

(۳) سر سید کا طلباء کے ساتھ برتاؤ اور اسکے متعلق حکایات اور لطائف۔

(۴) نواب محسن الملک مرحوم کی کالج لائف کے افسانے۔

(۵) مسلم یونیورسٹی Co-operative سوسائٹی قائم کرنے کا خیال اور اسکا اسکیم۔

(۶) اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف اولڈ بوائز کو متوجہ کرنے اور ایسوی ایشن کو زیادہ دلچسپ اور بکار آمد بنانے کے تدابیر اور تجاویز۔

(۷) مسلم یونیورسٹی میں کار آمد تعلیم کے اجراء کے اسکیم اور ان کی عملی تدابیر۔

(۸) مسلم یونیورسٹی کی تعلیم اور تربیت کا ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے مقابلہ۔

(۹) مسلمانوں کو یونیورسٹی کی طرف متوجہ کرنے کی تدابیر۔

یہ اور اس قسم کے بہت سے ایسے عنوان ہیں جن پر مضامین کا ایک نہایت دلچسپ اور کار آمد سلسلہ جاری ہوسکتا ہے۔ بہر حال میں "اولڈ بوائے" کا ہر حالت میں پرجوش خیر مقدم اور اس کی درازئ عمر کی دعا کرتا ہوں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

امید ہے کہ بھائی منظر علی صاحب میری ہمدردانہ اور مخلصانہ تنقید کو معاندانہ نکتہ چینی پر محمول نفرمائینگے اور جس خلوص کے ساتھ یہ چند سطور سپرد قلم کئے گئے ہیں ویسے ہی فراخدلی سے وہ انکو اپنے توجہ کے قابل خیال کرینگے۔ میں بھی انشاء اللہ العزیز اپنی تھوڑی سی بساط اور گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود گاہے گاہے اپنے خیالات پریشان کو حوالہ قرطاس کرکے خراج الفت ادا کرتا رہونگا ؎

مٹیں دنیا کی رسمیں سب پرانی مگر الفت کا اک رسم کہن ہے

محمد یعقوب مراد آباد

جلوس کا ہاتھی

کہتے ہیں کائنات کی جملہ اشیاء اپنا کمال چاہتی اور اسلئے ارتقائی کینچلیاں ڈالتی جاتی ہیں۔ آفاقی طور سے یہ بات سچ ہو یا نہو ' ہمیں اس سے یہاں سروکار نہیں ' البتہ بدیہات میں بنئے کی توند اور ہمارے دوست مسٹر خواہ مخواہ کی " ابعاد ثلاثہ " پر یہ اصول کچھ اس نزاکت سے چپاسا گیا ہے ' کہ تصور کے ساتھ ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگتی ہے۔ پھر کیا مجال جو لالہ روکڑ چند کی توند یا مسٹر موصوف کی (لمبائی ۔ چکلائی ۔ موٹائی) میں سے کوئی شعبہ بھی سائنس کے ساتھ نہ بڑھا ہو ! وہ تو یوں کہئے بڑی خیر گزری کہ یہ دونوں بھاری بھرکم ہستیاں (یہاں بجائے لالہ جی کے ان کی توند سے خطاب ہے !) ہندوستان کے ہی بطن سے پیدا ہوئیں اور جو خدانخواستہ کہیں یورپ یا امریکہ میں ان کا شان نزول قرار پاجاتا تو نہ جانے اب تک کتنی مرتبہ کلا بینوں سے ان کی بوٹی بوٹی دیکھ لی جاتی ! کیونکہ وہاں سائینس ایک طرف تو جوہر Atom سالمہ Molecule اور برقیہ Electron کی جانچ پڑتال سے یہ ثابت کر رہا ہے ' کہ انسان زیادہ تر خالی خولی ہی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر بفرض انسان کے ان اجزائے ترکیبی کی قوتیں باہم ٹکرادی جائیں تو چھ فیٹ کا لم ترڈھنگ آدمی خیر سے مکھی کیا مچھر بنکر رہ جائیگا ! مگر دوسری طرف دیکھا جاتا ' کہ مسٹر خواہ مخواہ کا وجود دیکھو دیا میاں بنئے سلمہ کی بھاری بھرکم توند اس استدلال کی راہ میں زبردست روڑا بنی ہوئی ہے۔ جس سے انکار کرکے ظاہر ہے کہ انسان کیونکر کافر بن جاتا ! اس لئے ضرور تھا کہ یہ دونوں سپوت سائنٹیفک تحریروں کے پالے پڑتے اور رگھڑ گھڑا کر نہ جانے غریب کیا سے کیا بن جاتے ! یوں اس سائینٹفک تماشا

زمین پر بھی لوگ ان کی عمارت نمو سے غافل نہ رہ سکے ۔ چنانچہ ایک صاحب نے تو بلا کی چلی کٹی سنائی، مگر یہ خود دبلے پتلے ہیں!

"اماں! توند ہو یا مسٹر خواہ مخواہ! ان کا مایہ خمیر تو خمیری آٹا بن گیا ہے، جو دم بدم پھید پھولے اٹھتا ہے!"

مبادا قارئین کرام آئندہ توند کے ہیر پھیر سے الجھ پڑیں، میں یہیں سے اسے تنہا کر دینا مناسب سمجھتا ہوں ۔ اس لئے آگے جو کچھ عرض خدمت ہو گا وہ صرف مسٹر خواہ مخواہ کے چند اوصافی سوانح کا تعارف ہے اور بس! جنہیں تاریکی میں رکھنا ایک طرف موصوف کی صریح اہانت تھی تو دوسری طرف تفنن لطیف کا خون بھی ہوا جاتا تھا!

مسٹر خواہ مخواہ بچپن ہی سے لوگوں کی آنکھ کا تارا بنے رہے ۔ تھا یہ کہ آپ کے بڑوں میں سے چند حضرات .... بڑے قلم کے دھنی گزرے ہیں ۔ جن کے طفیل یہ ہمہ اوصاف کے گویا نور عین اور لخت جگر تھے! خیر، یہ تو ان کی عامیانہ زندگی تھی؛ رہی سکول سے کالج تک کی بھولی بھالی زندگی تو وہ بھی عجب عجب "اعاظم توصیف" سے مملو ہے! اسکول ہو، کالج ہو یا نہو، موصوف اپنے وجود ذیجود کے گدگدانے والے آماس کے علاوہ بھی اپنی خوش فعلیوں سے ضیافت مذاق فرماتے رہتے تھے ۔

ایک دفعہ کا ذکر سنئے، نصیب دشمناں مسٹر موصوف کی طبیعت اتنی ہو گئی، احباب کو پتہ چلا تو ڈنڈا ڈولی کر کے زبردستی حکیم جی کے ہاں لے پہنچے ۔ اہتمام یہ تھا کہ "پا بہ دست دگرے دست بدست دگرے"! حکیم جی گو پبلک میں قضاء الملک مشہور تھے، مگر تھے بڑے ستم ظریف! ساتھ ہی اس درجہ باکمال بھی تھے کہ بجائے نبض کے قیافہ دیکھکر علاج کیا کرتے! انھیں دیکھتے ہی تڑسے بول اٹھے:۔

"صاحبزادے! بلا کے بلغمی واقع ہوئے ہو، خیر، نسخہ لکھے دیتا ہوں، کاسریج، محلل بلغم ہے! دیکھنا ان چیزوں کا پرہیز کر لینا"

بھلا طالب علموں کے سامنے یہ مرض تشخیص ہو، طالب علم بھی علی گڑھ کے جو غریب معصوم محض ہوا کرتے ہیں! اور بات جہاں کی تہاں رہ جائے ۔ ایک صاحب بڑھ ہی تو گئے اور لگے حکیم جی کا شکریہ

اداکرنے باضمناً نہایت تپاک سے یہ بھی عرض کیا کہ مسٹر خواہ مخواہ کا بھولے سے عقیقہ میں نام ہی نہیں پڑا تھا! جس سے محبانِ کالج کو بڑی تشویش تھی! آپ نے تشخیص مرض کے ساتھ اس مہم کو بھی سر فرمادیا! بڑی عنایت اور عزت افزائی کی! دیگر ہمسر کانوں نے یہ سنکر ایک فرمائشی قہقہہ اڑایا اور اس سہہ گھڑی سے میاں خواہ مخواہ "میاں بلغمی" مشہور ہوگئے!

غرض مدت مدید تک کالج اسی طرح آپ کے وجود با جود سے محظوظ ہوتا رہا مگر سنا ہے شدہ شدہ ایک وہ زمانہ آیا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی سعی ناشکور رہی اور باوجود کوشش جب موصوف یہاں سندی نہیں بن سکے، تو ایک ادعائی بزرگ کے اعزازی فرزند بنکر یورپ سدہارے! لیکن اس میں بھی اختلاف ہے، بعض مبصرین کی رائے ہے کہ آپ چند وجوہ سے صرف بمبئی تک کی سیر کرکے چلے آئے! واللہ اعلم!!

خیر! یورپ یا بمبئی سے کوئی آٹھ سال میں لوٹے تو اپنی قابلیت پر آپ نازاں تھے۔ لوگ انھیں ابھی "تعزیرات" کی چوٹی کی دفعات کا عامل ہی سمجھ رہے تھے؛ کہ موصوف نہ معلوم خود کو کیا کیا سمجھنے لگے، اور جہاز سے اترتے ہی لگے مرغے کی طرح اکڑنے! سنا ہے سمندر کی ہوا ہندوستانیوں کو کچھ یونہی اکڑا دیتی ہے!! غرض بعض احباب .... نے شرماشرمی ایک آدہ دعوت کردی، بس کیا تھا، اس چکناؤ کے ملتے ہی آدمیت سے گزر گئے! مگر یارانِ طریقت بھی بلا ہوتے ہیں۔ پھر لنگوٹئے! جو چھٹی کا کھایا تک یاد دلادیں! مختصر یہ کہ ایک شان و شوکت والی پارٹی میں جہاں موصوف بھی شمع محفل بنے ہوئے تھے دو پرانے جاٹیاؤں نے آہی لیا! اور عین اُسوقت جب موصوف اپنی احوالی سرگذشت میں یوں منہمک تھے:۔

"حضرات! لندن ہو، پیرس ہو یا کلیفورنیا، ایسے پیارے مقامات ہیں؛ کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں جسے دیکھئے اخلاق کا پتلا، ایمان کی یہ ہے وہاں ہر شخص نے میرے قدم لئے اور میری بڑی آؤبھگت کی! آپ کا اصرار ہے۔ میں آپ کے سامنے وہاں کے حالات بیان کروں۔ میں نہیں سمجھتا اس سے زیادہ بھی کچھ اور کہا جا سکتا ہے!........ وغیرہ وغیرہ۔"

ان میں سے ایک صاحب اس نادر اور دلچسپ گل فشانی پر جپ نہ رہ سکے تو آگے بڑھ کے فرمانے لگے :۔

"حضرات! آپ کو شاید اس بات کا احساس نہیں، مسٹر خواہ مخواہ کا لکچر جس درجہ پر از معلومات ہے اتنا ہی دلچسپ بھی ہے! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ موصوف کا جوش بیان اور آپ حضرات کا انہماک اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ طائر شب رنگ موصوف کے کان لے اڑا! مگر نہ موصوف کو ہی اس کی خبر ہے، نہ آپ حضرات کو!" یہ سننا تھا کہ بچارے خواہ مخواہ کے ہوش اڑ گئے، ساتھ ہی ایکدم سے ہاتھ کانوں کی طرف اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں! سامعین گو معزز ین تھے، مگر انسان تھے! یوں پہلے ہی سے وہ بہت کچھ بھرے بیٹھے تھے۔ لیکن اس واقعہ کی گدگدیوں نے بے قابو کر دیا! خلاف متانت لوٹ لوٹ گئے۔ چاہے اس بات سے ہی ہمارے دوست کو کان ہوئے ہیں! تو یہ بات نام کو بتی۔ کیونکہ آپ اس واقعہ پھر کو خیر سے اپنی ہر دلعزیزی کی نشانی سمجھتے رہے! میں نہیں سمجھتا' ان کے قابل......پاک روحیں باوقار......کی ان متین حرکات سے کس درجہ خوش ہوتی ہوں گی!

..........'کا وظیفہ اکثر کامیاب ہوتا اور خوب کامیاب ہوجاتا ہے۔ اسکی پہلی کامیابی تو غالباً یہ ہے کہ آپ ہندبدر ہوئے! دوسری مرتبہ اسکے آثار قبولیت شاید اس وقت ظاہر ہوئے جب آپ "سفارش نگر" میں ایک معزز عہدے کی ناسور کرسی پر رونق افروز ہوئے!

غرض کہاں تک آپ کے اوصاف حمیدہ کی بھینی بھی جائے۔ آپ کا وجود تو سرتاپا تودۂ اوصاف ہے! پھر اس پر جناب کی "عقل و دانش" کے چار چاند! عجب نہیں جو یہاں سے قارئین کرام کا رشک حسد کی صورت اختیار کرنے لگے! مثال کے طور پر ایک اور واقعہ عرض کرتا ہوں۔ یہ سچا سعدیؒ کے "دروغ مصلحت آمیز" والے اصول کے مفہوم سے متعلق ہے۔ یعنی.........صاحب اس گوشت پوست کے کوہ ہمالیہ سے بیزار ہو گئے تھے۔ اور بالکل یقینی تھا کہ "سفارش نگر" کی رعایا برایا ان کے وجود سے ہمیشہ کو ترس جائے۔ لیکن موصوف نے ہمیشہ یہی فرمایا کہ......صاحب سے ملنے کیا آیا' مجھے یہیں روک لیا۔ پھر ایسی محبت ہو گئی کہ چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ میں سوچتا ہوں' اباجان کی میراث میں اللہ کا دیا

سب کچھ اترا ہے۔ نوکری کس کے لئے کروں لیکن .... صاحب ہیں کہ ایک منٹ جدا ہوتے نہیں دیتے۔ عجب مشکل اور مجبوری ہے۔ یاران طریقت نے جو یہ سفید جھوٹ سنا، تو فوراً سمجھ گئے کہ یہ ساری تمہید حفظ ماتقدم سے زیادہ نہیں! یہہ ڈپلومیٹک جھوٹ حقیقت یہ ہے جیسا چاہے ویسا انہیں راس نہیں آیا کیونکہ .... کی سنگت کی وجہ ہمیشہ "داد مخصوصہ" کی زحمت اٹھانی پڑی۔ تاہم موصوف اپنی اختراع پر نازاں ہیں اور اسکی مشق کرتے رہتے ہیں۔ اردو کو ممنون ہونا چاہئے کہ لغت میں "خواہ مخواہی جھوٹ" کا اضافہ ہو رہا ہے۔ جو اپنی نوعیت و وسعت مفہوم کے لحاظ سے بمدارج "سفید جھوٹ" سے بڑھا چڑھا ہوگا!

لاحول ولا ساری باتیں کہہ رہا ہوں۔ لیکن موصوف کی ترقی کا اصلی گر اب بھی بیان سے رہا جاتا ہے۔ آپ کا ذریعۂ ترقی بقول چند محبان خاص "صنفی سیڑہی" سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے! جس میں ہر دو اصناف کے ڈنڈے لگے ہوئے ہیں! صنف قومی کے متعلق ہمیں یہ تفصیل ملی ہے کہ اسمیں صرف ایسے مردان کار شریک ہوتے ہیں! جو بقولیکہ "صنف مشترک کے" خصائص رکھتے ہوں! اس فطری رعایت سے ظاہر ہے مسٹر خواہ مخواہ کی ترقی حق المحنت بنجاتی ہے۔ مگر موصوف کا ایثار دیکھئے کہ وہ اسکے بھی روادار نہیں! کیونکہ وہ اسے نری رعایت سمجھتے ہیں۔ جو اتفاق سے ایک تو .... دوسرے حق الخدمت بنگئی ہے!

کالج والے عقیقہ میں جو انکا نام "میاں ملغی" پڑا تو وہ خرگوش کے کان، بنئے کی توند اور ضرب المثل جانور کی بیوقوفی کی طرح ہر وقت کا انکا ساتھی ہو گیا تھا! لیکن سب کو حیرت تھی کہ مسٹر خواہ مخواہ تو سانس کے ساتھ جون بدلکے گویا منٹ منٹ از سر نو تولد ہو رہے ہیں! برینہم ان کا کوئی عقیقہ ہوتا ہے اور نہ کوئی سہانا نام تجویز کیا جاتا ہے! آپ اندازہ کیجئے کہ اس بات نے ان کے محبان خاص کو کس درجہ کانٹوں پہ لٹیچا ہوگا۔ سنا ہے اس فکر میں ان بیچاروں کا کھانا پینا تک چھوٹ گیا تھا۔ مگر سچ ہے جو ڈھونڈے گا سو پائیگا۔ بالآخر محنت ٹھکانے لگی۔ اور یہہ عظیم مہم سر ہو گئی!

ایک دوست کی تقریب شادی ہے۔ جہاں علیگوں کی ریل پیل ہے۔ ایک دالان میں میاں خواہ مخواہ بھی چبوترہ بنے بیٹھے ہیں! جس پر احباب کی ظریفانہ نظریں پڑ پڑ کر پھسلی جاتی ہیں! کچھ دیر بعد برات روانہ ہوئی۔ اور ہمارے دوست خواہ مخواہ سب کے آگے آگے چلنے کی مصیبت میں گرفتار ہوگئے

سچ بھی ہے ایک مصری اہرام پر آپ یا اللہ میاں گزی کا تپلون، فرتوت ہیٹ اور جھول نما کوٹ منڈھ کر فرمائیں کہ تو چل بھی! تو یہ تری ستم ظریفی اور سر تا سر ظلم ہے!! پھر اس پر یہ عذاب مستزاد ہو کہ دمبدم پھبتیوں کا بوجھ لاد دیا جائے! ہاں تو، مسٹر خواہ مخواہ پاکوب ہیں اور آوازے اور پھبتیوں کے گوناگوں تحائف ان کی خدمت میں پیش ہوتے جاتے ہیں! مگر میں اتنا ضرور کہونگا کہ سارے تحائف اوپری دل سے پیش ہوئے! جو باوجود جامہ زیبی موصوف پر کھلتے ہی نہ تھے! ایک پرانے عقیدت کیش بھی اس فکر و کاوش میں منہمک ساتھ ساتھ تھے۔ انہوں نے سوچ سانچ کر بالآخر ایک جچا تلا آوازہ کس ہی دیا! جو چاند ماری کی کامیاب گولی کی طرح موصوف کی "بلز آئی" پر جا کے لگا! فرماتے ہیں "ذرا جلوس کے ہاتھی کی بہار دیکھنا!" بات عقیدت کے ہونٹوں سے نکلے اور قبول و شہرت کے کوٹھوں نہ چڑھے کیا معنی؟ جبکہ وقت و مقام کے رعایت شامل حال ہو۔ چنانچہ رات کے مقام مقصود تک پہنچتے پہنچتے یہ بھاری بھرکم اور سریلے الفاظ ہر کس و ناکس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اور یقین ہے تو آئندہ رسم عقیقہ تک یونہی گونجتے رہیں گے!

خیر! غرض یہ موصوف کا عقیقہ ثالث ہے۔ جسکی تقریب و تعارف اس خاکسار کے سپرد ہوئی ہے۔ اور گو میرا دست شوق اب موصوف کے کانوں تک نہ پہنچے تاہم آواز مبارکباد پہنچا دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کرونگا۔ کہ "میاں بلغمی" کے خطاب کے تحت جو فرائض اور ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں "جلوس کے ہاتھی" کے خطاب کے بعد ان کی معراج ہو جاتی ہے! اب آپ کی سعادت و فرض شناسی کو دیکھنا ہے کہ وہ سماجی مذاق و تفنن کو آپ کے "فیل وجود" پر کس کس طرح سواری کرنے کا موقع دیتی ہے!!

وما علینا الا البلاغ

"میر مخفی"

ڈیرہ دون اور سہارنپور کے خوش ذائقہ چاولوں کے شوقین حضرات حافظ منظور احمد (علیگ) سے "رائس سپلائی ایجنسی"، سہارنپور کے پتہ پر خط و کتابت فرمائیں۔

یادِ ایّام

بخدمت جناب مدیر "اولڈ بوائے"

ڈیئر سنظر!

"اولڈ بوائے" کو آئے ہوئے کئی دن ہوئے، رسید نہ لکھ سکا۔ شکریہ قبول ہو۔ پرچہ بہت اچھا ہے۔ جسکی صبح بنارس میں ہوئی ہو، اسکی شام حیدرآباد میں بری نہیں۔ مگر کچھ بڑھاپا برس رہا ہے، عالمانہ یبوست غالب ہے۔ ممکن ہے آب و ہوا کا اثر ہو، کیوں کہ حیدرآباد اس وقت مخزن علوم و فنون ہو رہا ہے، یا ممکن ہے عمر کا تقاضا ہو۔ مگر اس قید سے "اولڈ بوائے" آزاد ہے۔ کیوں کہ یہ وہ ذات شریف ہیں، جن میں بیس برس کے جوان سے لیکر ستر برس کا بڈھا بھی ڈھونڈئیے تو ملجائیگا۔ مضامین سبحان اللہ! بعض نہایت کاوش و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ باقی سب اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ پرانا رنگ البتہ اگر ہے، تو میر بچپن کے مضمون میں بالخصوص ان کے اخیر جملوں میں ہے۔ "بڈھوں کو بچہ بنانا" اور شاید بچوں کو بڈھا بنانا" دونوں خدمتیں "اولڈ بوائے" کے سپرد ہوں۔ دوسرا فرض تو ادا ہو گیا، مگر پہلا ندارد ہے۔

کل ایک صاحب نے پوچھا کہ "اولڈ بوائے" نے اپنے مقاصد تو بہت سے بیان کئے ہیں، لیکن وہ ترکیب کونسی ہے جس سے اسکے ایسے مضامین، جو خاص کر کالج اور کالج لائف سے متعلق ہوں، دلچسپ و شگفتہ

اور آئندہ بیکار آمد ہوں ۔ میں نے عرض کیا کہ میرے ذہن میں دو باتیں آتی ہیں ۔ ایک یہ کہ جہاں کہیں اولڈ بوائز (بالخصوص ایک ہی زمانہ کے) دنیا کی فکروں سے آزاد ہو کر جمع ہوں، اُن میں جا بیٹھئے، اور اسوقت جو باتیں اٹھیں ہوں انھیں لکھتے جائیے، پھر دیکھئے کیسا اچھا مضمون نکل آتا ہے ۔ مگر اسکا خیال رہے کہ ذرا دُور بیٹھیں، ورنہ شورِ عنادل میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیگی ۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی "طفلِ کہن سال" دنیا کے "کرکٹ فیلڈ" سے صفر لے کر جہاں کا تھا اُدہر آ نکلے تو اسکے ہمرکاب ہو جائیے ۔ اور وہاں کے چپے چپے پر جو کیفیتیں وہ محسوس کرے اُسے نوٹ کرکے تک بندی شروع کر دیجئے، پھر دیکھئے کیا لاجواب مضمون نکلتا ہے ۔ جسے گانا نہ آتا ہو وہ بھی پڑھ کر گنگنانے لگے ۔

مسٹر مدیر! میں آپ کو خط لکھنے تو بیٹھ گیا، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں، ذہن خالی ہے اور بکواس ضروری ۔ آپ اور میں دونوں علیگڈھ کالج کے ہیں، جہاں نئی تہذیب خاص طور پر سکھائی جاتی تھی مگر میں آپ کو بزرگوں کی ہم مکتبی کا حال سناؤں جو پرانی تہذیب کے لوگ گذشتہ صدی عیسوی کے اوائل میں متعلم رہے تھے ۔ ۴۰ برس سے زیادہ ہوئے کہ دہلی میں ایک نکاح کی محفل میں پرانے دہلی کالج[1] کے "اولڈ بوائز" کا ایک مجمع نظر سے گذرا تھا ۔ یہ سب اس کالج کے اورنٹیل ڈپارٹمنٹ میں طالب علم رہ چکے تھے ۔ ان میں پانچ چھ بزرگ ایسے بھی تھے جو بعد کو شمس العلما ہوئے ۔ خدا غریق رحمت کرے ان سب کو ۔ اب ان میں ایک بھی زندہ نہیں ہے ۔ جن کے مکان پر یہ مجمع ہوا تھا وہ بھی دلی کالج کے اولڈ بوائے تھے، اور نکاح بھی ان ہی کے لڑکے کا تھا جو آیندہ علی گڈھ کا اولڈ بوائے ہوا ۔ والان کے عرض میں یہ سب بزرگ ایک ہی طرف مل کر بیٹھے ۔ دوسرے کی ہمت نہ تھی کہ ان کی جماعت میں قدم رکھتا ۔ سب کے بیچ میں مولوی نذیر احمد مرحوم سرپنچ بنے بیٹھے تھے ۔ شاید حیدرآباد سے اسی زمانہ میں قطع تعلق کرکے دلی آئے تھے ۔

---

[1] پرانا دہلی کالج ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں غالباً ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا تھا اور غالباً نصف صدی قائم رہکر بند کر دیا گیا ۔ یہ سب بزرگ جن کا میں ذکر کرتا ہوں، اس کالج کے مشرقی صیغہ کے طالب علم تھے، اور غدر (۱۸۵۷ء) سے بہت پہلے ہی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے ۔ یہ مجمع غالباً دسمبر ۱۸۸۶ء کا واقعہ ہے ۔

غرض جب سب صاحب جمع ہوئے تو پھر جوان بزرگوں میں پرانے قصے، یارانِ عدم رفتہ کی یاد، اور زندگی کے شکوے، مرحوم استادوں کے تذکرے، پرانے لطیفے، پرانی باتیں، ونگے اور شوخیاں، بات بات پر ہنسیاں، یہاں تک کہ پھبتیاں اس بلا کی شروع ہوئیں کہ ساری محفل دنگ رہ گئی۔ محفل میں ایسی قدیم تر تہذیب کے لوگ بھی تھے جنہوں نے سوائے مسجد اور خانقاہ کے کسی انگریزی مدرسہ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ انکی نظروں میں یہ بزرگ ایسے ہی تھے جیسے ہم اپنے بزرگوں کی نظروں میں بعد کو ثابت ہوئے۔ غرض مرحوم دلی کالج کے ان پرانے طالبعلموں نے کوئی چیز اپنے زمانہ کی ایسی نہ چھوڑی جسے غایت درجہ اُنس یا ظرافت کے پہلو سے یاد نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ اس خونچے والے کا بھی ذکر آیا جس سے مدرسہ میں سودا لے کر کھایا کرتے تھے۔ ایک صاحب بولے کہ دریبہ میں اب بھی اسکا پوتا خونچہ لگاتا ہے۔ دوسرے بولے کہ ہمارا یار چیندولال تو لاہور سے جب دلی آتا ہے اسی سے منگوچیاں لے کر کھاتا ہے۔ مولوی نذیر احمد بولے کہ تم سب چٹورے تھے۔ یہاں جیب میں دام ہی نہ ہوتے تھے کہ چلوتھیاں کرتے۔ شدہ شدہ حیدر آباد کا ذکر آیا۔ پھر تو مولوی صاحب نے وہاں کے وفاتر کے معائنوں اور ملازمت سے اپنے علیحدہ ہونے کے قصے اس لطف و بے تکلفی سے بانگِ دہل میں فرمانے شروع کئے کہ ایک ایک قہقہے پر سارا مکان لرز اٹھتا تھا۔ باقی جس قدر حاضرین تھے حیرت میں تھے، اور کہتے تھے کہ خدا اُن کو سنوارے یہ شہر کے مولوی اور منشی ہیں یا چھکڑ۔ اس علم و فضل پر ان کو کیا ہو گیا ہے! جب تک محفل بیٹھی رہی یہی رنگ رہا، اور ختم ہونے پر دلی کالج کے یہ پرانے لوگ آوازیں ایک سوز کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "جب سے کالج چھوٹا تھا اتنے ہم مکتب کبھی پہلے ایک جگہ جمع نہ ہوئے تھے، اور نہ شاید پھر کبھی ہوں"۔ غالباً یہی ہوا بھی۔

مسٹر منتظر! یہ وہ اسلاف تھے، جن کے اخلاف میں ہم علی گڈھ کے نام لیوا اولڈ بوائز ہیں۔ مجھے اُس وقت کی باتیں اب پوری یاد بھی نہیں، مگر ان سب کی گفتگو ذہانت اور ظرافت کا ایک عجیب نمونہ معلوم ہوتی تھی، اور سب سے زیادہ لطف یہ تھا کہ اس بڑھاپے اور بزرگی میں وہ بالکل بھولے بھالے مدرسہ کی بالتو فی لڑکے نظر آتے تھے۔ یہ پرانی تہذیب کے لوگ تھے۔ ہماری تہذیب اُن سے زیادہ آزاد ہے، اور جب ہم لوگ مل بیٹھتے ہیں تو ہمارا نشہ پانی مٹی سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ بس کاغذ پنسل سے مسلح ہو کر

آپ بھی یارانِ طریقت میں کسی ایسے ہی موقع پر پہنچ جائے اور پھر وہاں کی تصویریں الفاظ میں اُتار کر "اولڈبوائے" میں شائع کیجے۔ یا جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے اس سے بھی زیادہ پُر اثر وہ کیفیت ہوتی ہے جب کوئی اولڈ بوائے بڈھا ہو کر کالج میں آنکلتا ہے۔ کبھی اسکے ریورٹر بن کر بھی ساتھ ہو لیجئے۔ یہ کیفیت کسی ایک ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر جگہ کم وبیش ایک سا حال ہے۔ کچھ عرصہ ہوا علی گڈھ کے ایک صاحب ولایت سے تعلیم پا کر آئے، تو انہوں نے اکسفورڈ کا ایک قصہ سنایا۔ قصہ انہوں نے انگریزی میں بیان کیا تھا جس کا لطف ترجمہ میں کہاں آسکتا ہے، پھر بھی سننے کے قابل ہے۔ آکسفورڈ کے ایک مُسن اولڈبوائے اتفاق سے اپنا پرانا کالج دیکھنے آئے، دُور ہی سے عمارت کو دیکھ کر حسرت سے کہنے لگے " وہی پرانا کالج ہے " دروازے سے صحن میں داخل ہوئے تو فرمایا " وہی پرانا صحن ہے " آگے بڑھ کر ایک کمرے میں پہونچے تو کہنے لگے " وہی پرانا کمرہ ہے " کمرے میں کتابیں دیکھ کر بولے " وہی پرانی کتابیں ہیں " کمرے کے ایک گوشہ پر نظر پڑی تو وہاں طالب علم کے پاس ایک نوعمر حسین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا " وہی پرانا قصہ ہے "۔ طالب علم کو یہ جملہ ناگوار گذرا۔ کہنے لگا، " ہائیں! آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔ یہ تو میری بہت قریب کی عزیز ہیں "۔ اولڈبوائے صاحب، سن کر ہنسے اور گردن ہلا کر بولے " وہی پرانا عذر ہے "۔

اخیر کے دو جملوں کو چھوڑ کر جسکی نوبت ابھی اس ملک میں نہیں آئی ہے، اس کل قصے سے ظاہر ہے کہ جہاں لڑکپن اور جوانی بے فکری میں بسر ہوئی ہو، اسکو زیادہ عمر میں دیکھئے تو بیچ کا فصل معدوم ہو جاتا ہے، اور انسان تھوڑی دیر کے لئے پھر اسی زندہ دلی کے وادئ نشاط میں جابستا ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ میں بھی برسوں کے بعد علی گڈھ گیا تھا، دو دن رہا، کیا بتاؤں کہ اس قلیل مدت میں قلب کی کیا حالت رہی۔ کالج کی عمارتوں اور باغوں میں لاوارثوں کی طرح پڑا پھرا۔ میرا جاننے پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک ایک چیز کو دیکھ کر میری زبان پر بھی، وہی " ہمانست کہ بود " کی گردان اکسفورڈ کے اولڈبوائے کی طرح آنے لگی قدم قدم پر خدا جانے کب کی بھولی بسری باتیں یاد آتی جاتی تھیں۔ گذری ہوئی صورتوں اور نقشوں کا ایک ہجوم تھا جو ذہن میں اترتا اور دوسروں کو جگہ دینے کیلئے مٹتا چلا جاتا تھا۔ اس کو خود غرضی سمجھئے یا مقتضائے فطرت کہ جتنے لوگ یاد آئے یا جن مکانوں کو دیکھا یا اُن کے نشان تلاش کئے، وہ سب اپنے ہی

زمانے کے تھے۔ کوئی رنگ، کوئی بو، کوئی پھول اس گلزار طفلی کا ایسا نہ تھا جو یاد نہ آیا ہو۔ گو سب اپنے وقت کی چیزیں۔ پھر بھی اتنا ضرور تھا کہ جس کمرے کو دیکھتا تھا، وہ بہت کچھ اپنا ہی کمرہ معلوم ہوتا تھا، اور جس طالب علم پر نظر پڑتی تھی اس میں بہت کچھ میں خود ہی نظر آتا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں کبھی سب مل کر رہتے تھے۔ اب کوئی کہیں ہے کوئی کہیں۔ ہر ایک دنیا کی مکروہات میں مبتلا ہے اور "اولڈبوائے" سے کہہ رہا ہے "اللہ کچھ فرمائے جائے"۔ ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

جی چاہتا ہے کہ اُسی بے فکری کی زندگی کو کالج ہی کے در و دیوار کے سایہ میں پھر کوئی زندہ کر دکھائے۔ اولڈبوائز کو اگر توجہ ہو تو اپنے اپنے زمانہ کے دوستوں اور استادوں کا حال لکھکر انکے اخلاق و کرم، تادیب و سلوک کو یاد دلاسکتے ہیں۔ کھیلوں اور مشغلوں کا ذکر کریں۔ آپس کی چہلیں اور شرارتیں، مگر بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ رکھکر لکھیں۔ جس جس طرح اپنی عمریں ضائع کی ہیں اُس پر بھی کفِ افسوس ملتے جائیں۔ دل میں شکر ہو اور طبیعت میں گداز۔ کالج کی عمارتوں، باغوں اور زمینوں کا حال بھی ضرور ہو۔ جب یہ تمام کیفیتیں اور منظر مختلف وقتوں کے مختلف اولڈبوائز کے لکھے ہوئے آیندہ زمانہ میں کسی مورخ کے سامنے آئیں گے، تو وہ بقید وقت کالج اور کالج لائف کے مکمل حالات بیان کرسکے گا، اور سردست آپکے پرچے کے لئے بھی ذخیرہ کافی مہیا ہوتا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اولڈبوائز ڈائرکٹری کی تیاری میں آپ ان باتوں کی طرف بھی اولڈبوائز کو توجہ دلاتے رہینگے۔ اب کیا عرض کروں، فی امان اللہ۔

۱۵ دسمبر ۱۹۲۶ء۔　　خاکسار

محمد عنایت اللہ

جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب کے ہم شکر گزار ہیں کہ ہمارے لئے یہ مضمون لکھنے کی تکلیف گوارہ فرمائی۔ رسالہ بچوں کا بھی ہے، اور بوڑھوں کا بھی؛ اور یہی اس کا مدعا ہے کہ بوڑھوں میں جوان آج

باقی رکھے۔ اولڈ بوائز میں دو باتیں خاص ہیں:۔ ایک تو کالج سے الفت دوسرے آپس میں محبت۔ ان دو کے سوا ذوق کا اختلاف، عمر کا تفاوت، اور حوالی کا اثر سب پر جدا جدا پڑتا ہے۔ کھلنڈرے کھیل کے ذکر کو پسند کرتے ہیں، اور پڑھنڈرے یہ چاہتے ہیں کہ کتاب کے کیڑے بنے رہیں۔ اس مرتبہ کثیر التعداد پڑھنڈرے بھائیوں کی فرمائش پر اُن کی دلچسپیوں کا سامان بھی کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے ایک خاص مضمون کا وعدہ فرمایا ہے۔ ہم اُن کے موعودہ مضمون کا انتظار بے قراری کے ساتھ کرتے رہیں گے، اور شکرگزاری کے ساتھ شائع کریں گے۔ اولڈ بوائے

برادرم "وفا" کو "قدر دان ویلور" کی رسید میں ہم نے لکھا تھا، کہ مضمون دیکھتا ہوں تو کباب کھانے کو جی چاہتا ہے، اور کباب کھاتا ہوں تو مضمون یاد آجاتا ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ "کباب کھانا کیا دشوار ہے، صحیح جستجو اور حقیقی طلب درکار ہے

شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

آپ تو کباب والے اولڈ بوائے سے بہت قریب ہیں۔ اتا پتا یہ ہے! کوتاہ قامت، دبلے پتلے، دراز بینی، سفید رنگ، ڈاڑھی منڈاتے ہیں، مونچھیں کترواتے ہیں، فوجی عہدہ دار ہیں، دو لڑکیوں کے والد اور ایک بی بی کے شوہر ہیں، اور بڑے مشہور شخص کے داماد ہیں۔ مکان اُنکا آل سینٹ چرچ کے مغرب میں اسٹیشن ریلوے کے مشرق میں، فتح میدان کے جنوب، اور کلکمنڈی کے شمال میں واقع ہے۔ علاوہ فرائض سرکاری کے گھر سے باہر کم جاتے ہیں، لیکن کبھی کبھی کرکٹ فیلڈ وغیرہ پر نظر آجاتے ہیں۔ نام اُنکا ایک بڑے مشہور شاعر کا نام ہے، اگرچہ وہ شاعری سے زیادہ رغبت نہیں فرماتے۔ راہ طلب میں بسم اللہ کرکے قدم رکھئے، آپ کو بھی کباب مل جائیں گے"۔ ہم اپنے پوستین بھائی کو یقین دلاتے ہیں کہ ان بزرگوار کا پتہ مل گیا، اور عجیب اتفاق ہے کہ کرکٹ فیلڈ ہی پر نظر آئے۔ کباب بھی کھلانے کا وعدہ کیا، اور چار خریدار اولڈ بوائے کے لئے نقد دیدئے۔ ڈائرکٹری کے لئے حالات بھی دیں گے، اور رسالہ کے لئے لطیفے بھی۔ اب اور کیا چاہئے۔

اولڈ بوائز

۱۔ اعلیحضرت حضور پر نور خلد اللہ ملکہم نے ازراہِ مراحم خسروانہ امیرزادگان پائیگاہ میں سے نواب خیر نواز جنگ بہادر، نواب حسن یار جنگ بہادر، اور نواب وحید یار جنگ بہادر فرزندان نواب سلطان الملک بہادر کے نام ماہوارات و معمولات کا اجرا فرماکر ہمارے ان بھائیوں کو سرافرازی کا موقع عطا فرمایا ہے۔ یہ ہرسہ نواب مع دیگر اعزہ کے "پائیگاہ ہوس" علیگڈھ میں مقیم اور ہمارے اسکول میں مدت ہوئی زیر تعلیم تھے، اور وہاں سے جناب مولانا گاندھی جی صاحب اعلی اللہ مقامہ کے تشریف فرماے علیگڈھ ہونے پر حیدرآباد طلب فرمالئے گئے۔ نواب خیر نواز جنگ بہادر اب متاہل زندگی بسر فرما رہے ہیں، اور ایک فرزند کے باپ ہو چکے ہیں۔ نواب حسن یار جنگ بہادر نے گزشتہ امتحان انٹرمیڈیٹ میں ہمارے کالج سے کامیابی حاصل کی تھی۔ اب پائیگاہ کی تاریخ اُن کے زیر نظر اور زیر تصنیف ہے۔ نواب حید یار جنگ بہادر خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم ان ہرسہ حضرات کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ اولڈ بوائے کے پہلے نمبر کو دیکھ کر نواب حسن یار جنگ بہادر نے حوصلا فزا الفاظ میں ہمیں یاد کیا تھا۔ فرماتے ہیں!

"آفریں ہے آپکی ہمت پر کہ آپ نے اس ستارہ کو پھر پرتو فگن کر دکھایا۔ دعا ہے کہ خدا آپ کے ارادوں میں کامیابی دے، اور "اولڈ بوائے" نئے سرسے پھولے پھلے۔ آپ کا اولڈ بوائز ڈائرکٹری شائع کرنے کا خیال بھی نہایت قابل تحسین ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ اور علیگڈھ اولڈ بوائز پر احسان عظیم ہوگا۔ ضرور شائع کیجئے۔ میں حتی الامکان اسمیں مدد کرونگا۔"

۲۔ مخدومی و مکرمی مولوی ابوالحسن صاحب (ہمارے سابق اسسٹنٹ سکرٹری) نے گذشتہ حج بیت اللہ کے موقع پر اللہ میاں کی برات دیکھی تھی۔ گھر واپس ہوئے تو فرزند ارجمند مسٹر حسن عبداللہ کی تقریب شادی کے وقت اس نمونہ کو چھوٹے پیمانہ پر دیکھنے کے خواہشمند ہوئے۔ یہ شادی، ر نومبر ۱۹۲۷ء کو قرار پائی تھی، اور چودہ ہزار مہر پر دلہن، دولہا کی ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ براتیوں کی کثرت کے باعث چودہ موٹرلاریاں مولوی صاحب کی جانب سے ناہموار سڑکوں پر دن رات کام کرتی رہیں۔ ہم دولہا کی ہمت عالی سے اسلئے خوش ہوئے کہ باپ سے مہر ادا کرنے کے باب میں صاف صاف کہدیا، کہ خود اپنی محنت کے پیسہ سے ادا کریں گے۔ خدا اس تقریب کو میاں بی بی اور سارے خاندان کیلئے مبارک کرے۔

۳۔ ڈائرکٹری کے لئے اپنے حالات روانہ کرتے ہوئے ہمارے بھائی "چوکیدار" تعلیمی زمانہ کے خصوصیات میں تحریر فرماتے ہیں، کتابیں پاس نہ تھیں، پڑھنے کے لئے وقت نہ تھا۔ بزمانہ کالج روشنی کے لئے لیمپ تک نہ تھا۔ جب شاہ منیر عالم صاحب چالیس بتیوں کی قوت کا لیمپ لے کر قریب میں آکر رہے تھے تو چند طلبہ ملکر بازار سے کرایہ پر متعدد لیمپ لائے تھے۔ کھانے کے کمرہ کی میزیں نکالکر کمرے کے سامنے سجاکر ان کے پڑھنے کا مقابلہ کیا تھا۔ آخر کار نواب محسن الملک مرحوم نے ان کو بنگلہ میں بھیجدیا، اور روشنی اور محنت سے نجات ملی"۔ اب ان حضرات کے پڑھنے کی کیفیت بھی سنیئے؛ "گپ، پھرنا، کالج کا کام مثلاً جب کوئی بڑا آدمی آئے کالج سجانا، پارٹیوں کا انتظام، کورس میں حصہ لینا، پڑھنے سے بھاگنا۔ انٹرنس سکینڈ ڈویژن میں پاس کیا، حالانکہ جغرافیہ کے دن دہلی تماشہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ انگریزی ترجمہ میں ہمیشہ اول نمبر رہا، مسٹر ہارسین بھی سب سے زیادہ ترجمہ میں نمبر دیتے تھے۔ ریاضی میں صفر کے سوا کسی نے ایک نمبر بھی نہ دیا! تین مرتبہ فرسٹ ایر میں شریک ہوا، سکینڈ ایر میں پہنچا۔ پر کوئی دوست (غالباً مظفر محمد خاں بی اے ڈپٹی کلکٹر ......) فرسٹ ایر میں اسکول کے زمانہ کے تھے، ان کی فرمائش پر عرضی دیکر فرسٹ ایر میں آگیا"۔ یہ اس شخص کی کہانی ہے، جو بعد کے زمانہ میں اول درجہ کا مجسٹریٹ ثابت ہوا۔

۴۔ مکرمی ڈاکٹر مرزا حسن علیخاں کھلانے کے وقت، اور کھانے کے موقع پر انداز تشکر میں اپنے بہت سے دوستوں سے جدا ہیں۔ ولایت میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا، تو دوستوں کی فرمائش ہوئی کہ

حضرت دعوت ؟ سنگ آمد و سخت آمد کہہ کر تیار ہو گئے ۔ بہت سے انگریزی اور مغلئی کھانے پکوائے، اور بادام کا حلوا شائد خود بنایا ۔ کھانے والوں نے حلوے کی بہت تعریف کی، اور سب سے زیادہ یہ بات پسند آئی کہ ڈاکٹر نے کچھ سوچ سمجھ کر کھلایا ہوگا ۔ شاید اس موقعہ کے شعر کو سن کر، نہیں! غالباً ترقی کے موقعہ پر برادرم آغا حیدر حسن کے دل میں بھی گدگدی اٹھی اور اپنے دوستوں کو خشک دعوت دیدی ۔ (آپ خشک کی دعوت نہ سمجھیں) ڈاکٹر حسن سلیمان کی قسمت میں سیب و انگور آئے، مگر لطف یہ ہے کہ آغا حیدر بھی دستر خوان پر ڈٹے ہوئے ان میں برابر کے شریک بن گئے ۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے چار مصرعوں سے آغا کی تواضع فرمائی ۔ کہتے ہیں۔

آج صاحب نے جو بھیجے ہیں یہ سیب و انگور ۔۔۔ بادۂ ناب سے ہر ایک ہے ان میں معمور
بھیجنے والے نے کیا جانئے کیا سحر کیا ۔۔۔ دیکھتے دیکھتے ہو جاتی ہیں آنکھیں مخمور

ہم تو یہ جانتے ہیں کہ دونوں کے دل بادۂ محبت سے معمور ہیں، ورنہ سیب و انگور میں کیا دھرا ہے ۔ یہ مثال شکرگزاری کی تھی ۔ اب ایک نمونہ ناشکری کا بھی ملاحظہ فرمایئے ۔ برادرم قاضی تلمذ حسین صاحب ایم ۔ اے اپنے دوستوں کو جمع کرنے اور اُن کو کھلانے پلانے کے بہت عادی ہیں ۔ اس قسم کی مدارات میں زیادہ تر مودودی، منظر، جوش، اور سیندان اکثر قاضی صاحب کے شکار ہو جایا کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کی خاطر بیچارے کبھی اپنی انگلیاں بھی جلالیتے ہیں ۔ کھلاتے ہیں اور زیادہ کھانے کا اصرار کرتے ہیں ۔ پلاتے ہیں، اور کہتے ہیں اور پیو ۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اوپر کے چار درویشوں میں سے تین قلندر قاضی صاحب کے یہاں مدعو تھے ۔ سب نے پیٹ بھر کر کھایا، اور سیر ہو کر پی ۔ میزبان کا اصرار اس کے بعد بھی باقی رہا ۔ حضرت جوش کو جوش آگیا، اور فرمانے لگے ۔

قاضی صاحب کی چاء پیتے ہیں ۔۔۔ پھر بھی حیرت ہے لوگ جیتے ہیں

قاضی صاحب نے منہ بنا کر "جیتے" کی جگہ "مرتے" بنادیا ۔ انھیں یہ خبر نہیں کہ اُن کے بہت سے دوست انکی انھیں اداؤں پر تو مرتے ہیں ۔ اس مرنے پر بھی شاعر کا شعر ہو گیا، اور پہلے شعر کے لگ بھگ ہوا، مگر ہم بھول گئے ۔

۵ ۔ برادرم مسٹر سعید احمد صدیقی، اور عزیزی سید فائق حسین دونوں ہماری دلی مبارکباد قبول کریں، کہ اول الذکر تحصیلداری حضور آباد سے مددگاری مال ضلع کریم نگر پر، اور آخرالذکر تحصیلداری

پالونچہ سے ضلع ورنگل کی مددگاری مال پر مامور ہوئے ہیں۔ مسٹر فائق حسین اس لحاظ سے بھی لائق مبارکباد ہیں کہ خداوند عالم نے انھیں فرزند نرینہ عطا فرمایا ہے۔ ہم اُن کی اس محبت کو ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ جب ہم نے رسالہ اولڈ بوائے کی اشاعت کا اعلان اپنے احباء و اعزہ میں کیا تو سب سے پہلے انھیں نے ہماری جانب دست امداد بڑھایا تھا۔ سچی محبت بڑی قدر کی چیز ہوا کرتی ہے، اور فائق اس باب میں پورے ہیں۔

۶۔ مولوی مسعود علی صاحب بی۔اے (علیگ) خود تو ہمارے کالج کے فرزند رشید تھے ہی، انھوں نے اپنی اولاد کو علیگڈھ کی برکتوں سے فیضیاب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مسٹر رشید احمد ایم۔ اے ایل ایل بی، اور مسٹر سعید احمد صدیقی ایچ سی ایس اُن کے دو لائق فرزند ہمارے اس بیان کے گواہ ہیں۔ باقی اولاد میں سے مسٹر حبیب احمد نے بھی اس برکت کو حاصل کیا ہے۔ ہمارے برادر محترم نے حال میں اپنے انھیں فرزند کی شادی رچائی تھی، اور سنتے ہیں کہ یہ غیر معمولی دھوم سے ہوئی۔ ہم نوشاہ اور اُن کے پدر بزرگوار دونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

۷۔ ولایت سے واپس آنیوالوں کے باب میں ہم نے گذشتہ اشاعت میں وعدہ کیا تھا کہ آئندہ تفصیل عرض کریں گے۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مسٹر سید اعظم الدین حسن بلگرامی اسکول آف اکنامکس و پولیٹیکل سائنس لندن میں زیر تعلیم تھے۔ اس اسکول کا تعلق وہاں کے سررشتہ ریلوے سے ہے۔ مسٹر اعظم بلگرامی نے اسکول کے اکنامکس و اکاونٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اسکے ساتھ ہی انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسپورٹ سے (جو انسٹی ٹیوٹ آف انجینیرس کے مماثل ہے) وہاں کی گریجویٹ شپ حاصل کر کے ڈپلوما پایا۔ قلمرو آصفیہ کے نوجوانوں میں اسکے لحاظ سے ہمارے بھائی سرخیل ہیں۔ دوران تعلیم میں لندن و شمالی مشرقی ریلوے کے دفاتر کے صیغہ حسابی میں عملی تربیت حاصل کرتے رہے۔ واپسی میں ممالک جرمنی، سوئیزرلینڈ، اٹلی، اور فرانس وغیرہ میں رہتے سہتے وطن واپس آئے۔ اب یہاں اسسٹنٹ گورنمنٹ اڈیٹر نظام گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اولڈ بوائے کی توسیع اشاعت میں ہمیں ان سے بڑی مدد مل رہی ہے، اور ہم اس باب میں مسٹر اعظم کے بدل ممنون ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ گنجایش کی قلت کے باعث بہت سے نوٹ آئندہ نمبر کے لئے ملتوی کرنے پڑے۔

اولڈ بوائز ڈائرکٹری

علیگڑھ اولڈ بوائز!

براہ کرم علیگڑھ اولڈ بوائز ڈائرکٹری (دخزینۃ الکرام) میں اپنے حالات درج کرنے کی غرض سے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) نام معہ ولدیت و سکونت۔ مقام و تاریخ پیدائش۔

(۲) تعلیم کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی۔ علیگڑھ میں کس جماعت میں داخل ہو کر کہاں تک تعلیم پائی۔ تعلیم کے زمانہ کے خصوصیات و امتیازات (اگر کچھ ہوں)

(۳) علیگڑھ میں تفریحی مشاغل کیا تھے اور ان میں کیا نام پیدا کیا۔

(۴) علیگڑھ میں عملی طور پر کن کاموں میں شرکت کا موقع ملا، ان کے نتیجے۔

(۵) علیگڑھ سے باہر جا کر کس قسم کی زندگی اختیار کی، اور اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔

(۶) ملک میں یا بیرون ملک کوئی اہم سفر کیا ہو تو اس کا ذکر۔

(۷) ملک کی علمی، ادبی، یا شہری خدمت انجام دی ہو تو اس کا تذکرہ۔

(۸) شادی کب اور کہاں ہوئی۔ اولاد کی تعداد۔ فرزندوں کے نام۔

نیاز کیش

اولڈ بوائے

نمبر	مضمون	مضمون نگار	
۱ -	پیام ٹیگور	جناب مولوی افضل حسین صاحب فاروقی	۳
۲ -	انکشاف	" مولوی سلطان حیدر صاحب جوش	۱۰
۳ -	دل لوٹ کر آتا ہے	" مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم	۱۳
۴ -	شرح دیوان غالب پر ایک نظر	" مولوی سید محمد ضامن صاحب کنتوری	۱۶
۵ -	شام غریباں	" کپتان محمد اعجاز علی صاحب شہرت	۲۱
۶ -	تائیس دلی میں	" مولوی سید وزیر حسن صاحب	۲۳
۷ -	کلام ضامن	" ضامن کنتوری	۳۰
۸ -	یاد ایام	"سیلانی"	۳۲
۹ -	ہمارا کالج	----------------	۳۸
۱۰ -	اولڈبوائز	----------------	۴۰

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے نمبر ۱۲/۴۰ سلطانپورہ حیدرآباد دکن سے شایع کیا
قیمت ششماہی

ROCKLANDS, SAIFABAD,
Hyderabad Deccan.
9th November 1925.

My Dear Ahmed,

I am giving this letter of introduction to Moulvi Manzar Ali a well-known man and a great scholar and author of books. Two of his books were patronised by His Exalted Highness and were published at Government expense. He will show them to you. He has now written a book which contains a short account of each and all of the State Officials and others. I think our Exalted Master is sure to like and favour with his patronage.

I am sure you will like Manzar Ali when you have a talk with him and see some of the work he has done.

Yours ever affectionately,
SYED HOOSAIN BILGRAMI.

Nawab Sir Ahmed Hoosain Khan,
Amin Jung Bahadur, K.C.I.E., C.S.I., etc.

رابندرا ناتھ ٹیگور جو زمانہ حال کا ایک مشہور شاعر ہے دنیا کی ممتاز ہستیوں میں ایک خاص
مرتبہ رکھتا ہے [illegible] کی شاعری [illegible] انگلستان [illegible] عظیم الشان شاعر کی طرح ہندوستان کے
مایۂ ناز فرزند کو سمجھتا ہے اگر یہ کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا [illegible] اور وہ بہار ترنم ریز نثار
اور نقاش کی حیثیت سے جو [illegible] ٹیگور [illegible] قابل قدر ہے۔ قدرت نے
اس کے کلام میں خاص [illegible] شیرینی اور [illegible] وہ بحر فطرت کا غواص ہے اور جو ربط وہ دیکھتی
انسان اور فطرت [illegible] پیدا کر دیتا ہے [illegible] اس کا طرز تحریر اس زبان میں جو اسکی مادری زبان
نہیں ہے انگریزی زبان کے اساتذہ کی یاد کو تازہ کر دیتا ہے ٹیگور کے یہاں [illegible] تخیل نہیں پایا جاتا۔ وہ زمانہ
حال کے شعراء میں سربرآوردہ ہے۔ انیسویں صدی کی اعلیٰ ترین شخصیت جو سرزمین انگلستان میں نمایاں ہوئی؛
یعنی طامس کارلائل کے نزدیک شاعری صرف تخیلات کا انعکاس ہی نہیں بلکہ شاعر کا فرض ہے کہ وہ ماضی
یا حال جس زمانہ کی نسبت لکھ رہا ہو اس وقت کے تاثرات اور رجحانات کا پورا چربہ اتار دے۔ اسکے نزدیک
ادب راز سربستہ کے افشاء کی کلید ہے [illegible] انسان کا حیات ہستی ناظر کے لئے عریاں
ہو جاتا ہے شادی کا نام مسرت ہے اور موت کا انجام غم و اندوہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم آنکھیں رکھتے ہیں اور
دیکھتے نہیں کان رکھتے ہیں پر سنتے نہیں۔ [illegible] شاعری کا حصہ ہے کہ وہ ان کو پرکھے دلاویز اور لطف
بنائے اور پھر اس مسئلہ کے ہر پہلو پر بحث کر کے ہمارے لئے باعث فلاح و بہبود بنائے ٹیگور کی شاعری میں
ہر بات میں الوہیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ انسان کے روبرو ایک اعلیٰ معیار پیش کرتا ہے اور موجودہ

زمانہ کے رخ کا روشناس ہے۔ معاشرتی اور سیاسی مسائل جو زمانہ حال کے بڑے بڑے دور اندیشوں کو الجھنوں میں ڈالے ہوئے ہیں، ٹگور بھی ان میں منہمک ہے اور وہ جس ملک میں جاتا ہے وہاں کی قوم کو ہدایت کرتا ہے جسطرح ایک چڑیا اپنے آشیانہ سے نکلکر مختلف درختوں کی ٹہنیوں پر اپنے نرسیلے نغمے گاتی پھرتی ہے اسی طرح ہندوستان کی بلبل ہزار داستان انگلستان سے امریکہ اور امریکہ سے جاپان جاتی ہے اور وہاں اخوت کا سریلا راگ گاتی ہے اور پھر جذبۂ وطن کی کشش اسے اسیطرح واپس لے آتی ہے جسطرح چھوٹی چڑیا دن بھر مصروف پرواز رہنے کے بعد شام کو اپنے ہی گھونسلے میں بسیرا کرتی ہے۔

ٹگور ایک جگہ لکھتا ہے۔

حرکات سے اپنے تیرا اظہار مقصود ہے میری زندگی کا

افعال سے میرے تیری تصویر ہر دیکھنے والے پر عیاں ہے

شاعر کے الفاظ کا سمجھنے والا خواہ کچھ ہی مطلب کیوں نہ سمجھے لیکن اس کا حقیقتی اور انتہائی مقصود تیری ہی ذات سے متعلق ہے"۔

ٹگور روحانیت کا پیغام بر اور انسانیت کا مغنی ہے۔ جس اعلیٰ مقصد کو اس نے پیش نظر رکھا ہے وہ یہی ہے۔ جن الفاظ میں ٹگور نے اپنے ایک ہیرو کے مقصد کا اظہار کیا ہے وہی الفاظ خود اسپر صادق آتے ہیں۔ وہ ایک شاہی پیغام بر ہے جو کو بکو دربدر اس کا پیغام پہونچاتا پھرتا ہے۔

ٹگور کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا مطربانہ رنگ ہے۔ گیتان جلی جو شاعر کی بہترین تصنیف خیال کی جاتی ہے اس خصوصیت کی بنا پر اعلیٰ ترین قدر دانی کی مستحق ہوئی۔ اس مجموعہ پر اسے نوبل انعام سے مشرف کیا گیا۔ گیتان جلی مطربانہ نظموں کا مجموعہ ہے اور اپنے اس رنگ میں بڑے حسن وجمال سے نکھری ہوئی ہے۔ اس میں شاعر کے دلی جذبات کی پوری کیفیت موجود ہے۔ انسانی روح کی اس "ہستی عظیم" کے ساتھ وابستگی کی تمنا کا حسین پیرائے اور بلند آہنگی سے اظہار کیا گیا ہے "میں صرف جذبۂ الفت کا منتظر ہوں تاکہ اپنی ہستی اسپر مٹا دوں" شاعر کی تشنگی قرب کا پتہ اس کی ایک دعا سے چلتا ہے۔

"میری بس یہی صدا لگاتا رہے ہو کہ میں تجھے اور صرف تجھے ہی چاہتا

ہوں۔ باقی تمام خواہشات جو مجھے ستاتی ہیں غیر حقیقی اور لایعنی ہیں"

اس کا یہ ذوق یکجہتی اسقدر زبردست ہے کہ وہ التجا کرتا ہے۔

"میری ہستی صرف اتنی رہجائے کہ میں تجھے "اپنا سب کچھ" کہہ کر

پکار سکوں۔

میری ہستی صرف اتنی رہ جائے کہ میں تجھی کو اپنے گرد پاسکوں

ہر راہ سے تجھی تک پہونچوں اور ہر دم اپنی محبت تیرے لئے پیش کروں"

وہ خالق کو مالک، والدین اور رفیق سمجھتا ہے۔ کیف نغمہ سے مخمور ہوکر وہ اپنے مالک کو رفیق کے نام سے پکارتا ہے۔ اسکے نزدیک ہستی عظیم بادشاہوں کی بادشاہ بھی ہے اور پتا بھی، جس کے قدموں پر وہ سربسجود ہے۔ کہیں وہ اسے بھائی نظر آتا ہے جیسے وہ اپنے سرمائے میں بمسرت حصہ دار بناتا ہے۔ کہیں وہ اسے اپنی "مادر شفیق" کی حیثیت سے دیکھتا ہے، جس کے لئے وہ اپنے دُر اشک کی مالا پروتا ہے۔ پروردگار کے ایسے تخیل سے ایک سچے پرستار کے تصورات کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ خالق کے کن کن اوصاف کا وقتِ واحد میں شیدائی ہوتا ہے۔ مناظر فطرت میں اسے ایک بادشاہ کا تزک و احتشام نظر آتا ہے۔ جب پرستار پر خدا کی رحمت و شفقت ہوتی ہے تو اسے "مادر شفیق" کے بھیس میں نظر آتا ہے جو مسکراتی ہوئی دست شفقت دراز کرتی ہے۔

ان نغموں میں دل کی تڑپ اور انتظار کی بیقراری کو خوب واضح کیا گیا ہے۔ روح اسطرح کل میں سما جانے کے لئے بیقرار ہے جیسے ایک دوشیزہ چند لمحے اپنے دلبر کے سینے سے لگ کر اپنے آپ کو بھولجانے کی متمنی ہو۔ یہ صریح بے مہری ہو اگر اس کا دلبر ایسی حالت میں بھی کہ وہ معصومیت اور شوق کے جذبہ سے اسکی منتظر ہو اس کے پاس نہ آئے۔ پھر اگر انتظار کرتے کرتے وہ بددل اور مغموم ہو جائے تو تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔ شاعر اپنے تئیں اس بے نوا دوشیزہ سے تعبیر کرتا ہے جو پھولوں سے گودی بھرتی ہے اور لاحاصل انتظار میں آنسو بہاتی ہے۔ ایک اور جگہ وہ کہتا ہے۔

"تجھ سے ملنے کی موسم آیا۔ یہ ہیں زندگی کے دن گذرتے ہیں
لیکن اب تک اُمید پوری نہ ہوئی تو نے ابھی سے مجھ سے روپوشی ہے۔
رات ختم ہونے کو ہے تو اب تک نظروں سے اوجھل ہے۔"

افسردگی کی حالت میں وہ جو التجا کرتا ہے نہایت درد انگیز ہے۔

"اگر تو مجھے اپنی صورت نہیں دکھائے گا، اگر تو مجھے یوں ہی اکیلا
چھوڑ دیگا معلوم نہیں یہ برکھا رات کیسے کٹے گی۔"

اے میرے محبوب دوست، میرے عزیز محبوب، میرے گھر کے
دروازے کھلے ہیں۔ خواب کی طرح نہ گذر جانا۔

"آج میری نیند اڑ گئی۔ اے محبوب! میں گھڑی گھڑی دروازہ
کھولتی ہوں اور اندھیری رات میں چاروں طرف نگاہیں دوڑاتی ہوں۔"

وہ اس انتظار سے اکتا کر کہتا ہے۔

"دن گذرے جاتے ہیں اور تو دکھائی نہیں دیتا۔ میرے دل کے
مالک! اب زیادہ منتظر نہ رکھ۔"

ہندوستان کے اس فلسفی شاعر کے نزدیک حیات غیر متناہی ہے۔ گیتانجلی کے ابتدائی نغمہ ہی میں اس فلسفہ کی کلید موجود ہے۔

"تو نے مجھے غیر متناہی بنا دیا۔ تیری یہی مرضی ہے اس نازک ساغر کو
تو بار بار خالی کرتا ہے اور ہمیشہ اک زندگی تازہ سے اسے معمور کر دیتا ہے۔"

اس خیال سے کہ انسان کی زندگی کا انجام موت نہیں ہے بلکہ روح اپنا قالب وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے اہل مشرق بخوبی واقف ہیں۔ شاعری میں عموماً مسئلہ حیات پر بحث ہوتی ہے لیکن مسلمات یعنی انسان پر ایسی دنیوی زندگی کے بعد کیا گذرتی ہے، اس پر بہت کم التفات کیا جاتا ہے۔ عوام کے نزدیک موت وحشتناک اور راز سربستہ ہے بلکہ ان لوگوں میں بھی جن میں فلسفیانہ رنگ موجود ہے۔

موت کا ڈر پایا جاتا ہے۔ انگریزی شاعری میں مسئلہ زندگی یعنی انسانی کوششوں اور ناکامیوں کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے اس تاریک اقلیم کا خیر مقدم کیا اسکی کیفیات و حالات کو کچھ تفصیل کیا ہو۔ کلفٹن کہتا ہے۔

"موت جو کچھ بھی ہو، زندگی اور موت دونوں پہلو بہ پہلو ہیں۔

......موت یقیناً کوئی وحشتناک چیز ہے"۔

انگلستان کے عظیم ترین شاعر کے نزدیک جس کی نظر رسا افق مادی سے عمیق ارضی تک تھی موت ایک ایسا خطہ ہے جہاں سے کوئی مسافر واپس نہیں آیا۔ وہ اپنے ایک مقبول ڈرامے میں اپنے ہیرو کو جو اس کا ہم خیال ہے اس سوچ بچار میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ جب کسی کام کا انجام کار موت کے باعث غیر یقینی ہو تو ایسی صورت میں آیا زندگی قابل التفات ہے یا نہیں۔ آخرکار مشغولیت کی زندگی کے بعد وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سکوت کا پردہ پڑ جاتا ہے لیکن ہندی شاعر کے یہاں جو خیر مقدم موت کا کیا جاتا ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اسکے نزدیک موت زندگی کی آخری تمنا کا پورا ہونا ہے۔ زندگی اور موت توام ہیں۔ اسکے نزدیک موت بھی زندگی کی طرح حقیقی چیز ہے اور انسان دونوں اقلیم سے مانوس ہوتا ہے کیونکہ بچہ اسوقت روتا ہے جب ماں اسے ایک چھاتی سے چھڑاتی ہے۔ لیکن جوں ہی دوسری چھاتی سے لگا لیتی ہے اسے تسکین ہو جاتی ہے۔ جب روح قفس ہو جاتی ہے تو کچھ تشویش ضرور ہوتی ہے لیکن فوراً ہی دوسرے اقلیم سے مانوس ہو کر مسرور ہو جاتی ہے۔ دنیا میں انسان کی ترقی کے متعلق شاعر کا خیال ہے کہ اس کی عمر جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر زیادہ وہ دنیوی ہوتا جاتا ہے۔ اسے ٹھیک یاد نہیں کہ کب اس نے دبستانۂ عالم پر قدم رکھا تھا لیکن وہ ایک بات محسوس کرتا ہے جسقدر عمر بڑھتی ہے اسی قدر وہ اپنے آپ کو اصلیت سے دور پاتا ہے۔

"وہ جسے میں اپنے نام سے محصور کئے ہوئے ہوں قفس میں

کیطرح پھڑ رہا ہے۔ میں چاروں طرف سے دیواریں بنانے میں مصروف ہوں۔

یہ دیواریں آسمان کی طرف بلند ہوتی جاتی ہیں اتنا ہی میں اپنے وجود حقیقی کو

اس کے تاریک سایہ میں گم پاتا ہوں۔"

یہ خیال ورڈسورتھ کے اس خیال سے کس قدر مشابہ ہے۔

"لڑکے کی درازیٔ عمر کے ساتھ قفس عنصری کا سایہ بھی

بڑھتا جاتا ہے۔"

یہاں تک کہ آخر کار۔

"اس شان و شکوہ کو فراموش کر دیتا ہے اور اس قصر شہنشاہی

کو بھول جاتا ہے جہاں سے وہ آیا تھا۔"

ربندر ناتھ کے نزدیک جسقدر زیادہ ہم دنیا میں رہتے ہیں، اسیقدر زیادہ علائق دنیوی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ طویل زمانہ تک مبتلائے حرص و ہوس رہنے اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد انسان خود اپنے ہی بیت المال میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس پر ایک مشہور فلسفی کا مقولہ یاد آیا۔ وہ کہتا ہے "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ خود اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔"

گیتانجلی مذہبی شاعری کی ایک پرشوکت مثال ہے۔ اس میں کوئی خاص مذہبیت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک عام مذہب ہے جو "انسانیت کا مذہب" ہے۔ حقیقی مذہب میں تین جزو ہوتے ہیں۔ صفائی قلب، ہمدردی بنی نوع، اور خدا کا اعتقاد۔ ایک سچے بھگت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل صاف رہے۔ اسکی سوا یہ ہوتی ہے کہ اسے ایسی قدرت عطا ہو کہ اس کے کلام، خیال، اور عمل میں پاکیزگی ہو۔ سچا مذہبی آدمی بنی نوع کا عاشق ہوتا ہے۔ اس کی فراخ دلی امیر و غریب، حسین و کروہ سب پر حاوی ہوتی ہے وہ اس عظیم الشان طاقت کا معترف ہوتا ہے جسکے دست قدرت میں مخلوق کی قسمت ہے۔ اس کا علم کہیں عاجز نہیں ہے اور اسکی گرفت نظر سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔۔ وہ اپنی زندگی اس روح کی نظر کر دیتا ہے اور ہر وقت اس امر کا خواہاں رہتا ہے کہ جسقدر جلد ممکن ہو وہ (روح اعظم) اسے اپنے آغوش میں لے لے۔

"مجھ پر بار احسان بہت زیادہ ہے۔ میری ناکامیاں کثیر اور میری

شرمساری سخت اور جھنی"۔

لیکن اس کی التجا یہ ہے کہ معبود اپنے فضل سے

"مفلسی کو دل سے بیخ وبن سے دور کردے، مجھے طاقت دے کہ

میں غریبوں سے کبھی غافل نہ رہوں اور نہ مغروروں کے آگے سر جھکاؤں"۔

وہ دنیا سے الگ رہنے کو پسند نہیں کرتا۔ عموماً ہندو فلسفی یہ خیال کرتا ہے کہ دنیا میں رہنے سے تن من کثیف ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ گوشۂ تنہائی کو دنیا والوں کی ہنگامہ زا اور پرفساد زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن یہ نکتہ خیال ہندوستان کے اس ممتاز شاعر کے نزدیک قابل استحسان نہیں۔ اس کے نزدیک انسانیت کا مطالعہ سرچشمۂ مسرت ہے اور وہ اس میں اس عظیم الشان طاقت کے جلوے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہے کہ وہ دنیا کی "عظیم الشان مجلس" میں موجود ہے۔ اس بھگت کی مثال جو دنیا سے اسلئے الگ تھلگ رہتا ہے کہ اس کی آلائشوں میں نہ گرفتار ہو جائے بعینہ اس بچہ کی سی ہے جو شاہانہ ملبوس کی وجہ سے کھیل کود سے قاصر ہے۔

وہ کہتا ہے۔

"اے شفیق ماں! اس شاہانہ ملبوس سے کیا فائدہ، اگر اس کی

وجہ سے (انسان) زمین کی پرصحت خاک سے دور رہنے پر مجبور ہو۔ اور

حیات انسانی کی تماشاگاہ عام میں شریک ہونے سے باز رہے"۔

اس کے نزدیک معبود حقیقی عاجز، غریبوں اور بےکسوں کے ساتھ ہے۔

"وہ عاجز غریبوں اور بے کسوں کے جامہ میں پھرتا ہے"۔

"وہ عاجز مسکینوں اور بے سہارا یتیموں کے ساتھ رہتا ہے"۔

افضل حسین فاروقی

انکشاف!

برادرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپکا کارڈ مورخہ ندارد۔ مجھے کافی عرصہ کے بعد مل گیا۔ آپ نے اس کو جونپور کے پتے سے روانہ کیا اور مجھے اس میں لطف آیا کہ اس کو اچھا خاصہ طواف کرنا پڑا۔ میں جونپور سے دسمبر ۲۶ء میں مرادآباد ٹریننگ میں بھیجا گیا اور اس کو ختم کرکے مارچ ۲۷ء میں باندہ (بندیلکھنڈ) میں تعنیات ہوا جہاں ابتک موجود ہوں۔ آپ دسمبر ۲۷ء میں، دسمبر ۲۶ء کا پتہ تحریر فرماتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کارڈ جونپور، اور مرادآباد میری تلاش کرتا ہوا باندہ پونہچتا ہے اور اُس کو بھی وہ تمام سفر طے کرنا پڑتا ہے جو مجھ کو جونپور سے باندہ آنے میں کرنا پڑا۔

آج سے تقریباً دو سال پیشتر کئی احباب کے خطوط تقاضہ سے لبریز میرے پاس اس غرض سے پہنچے تھے کہ میں اولڈ بوائے کو مضمون دوں جو بھوپال سے نکلتا ہے اب جو اولڈ بوائے آپ بھیج رہے ہیں، یہ دکن سے سر نکالتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرحوم اولڈ بوائے کا نیا جنم کون سا ہے، وہ جو بھوپال میں لیا گیا، یا، یہ جو حیدرآباد میں لیا جاتا ہے؟ نہایت ضروری تھا کہ آپ اس ابہام کی تشریح پہلے ہی رسالہ میں کرتے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عمداً پہلو تہی کی گئی ہے۔ پھر کیا سمجھا جاوے؟

مضمون لکھنے کا مرض ایک کہنہ و ناقابل علاج مرض بن چکا ہے اور یقین تھا کہ اس سے شفا میسر نہ آسکیگی، مگر ڈپٹی کلکٹری کی ترقی نے بتا دیا کہ "ہر فرعونے راموسٰے" بالکل صحیح ہے۔ حالت یہ ہے کہ مہلت دم زدن میسر نہیں آتی لہذا وقت میسر آنے پر لامحالہ مضمون نگاری کا ازالہ ہو جائے گا۔ اب بتائیے اس

تنگ آ، سخت آ" کا کیا چارہ کار ہو سکتا ہے؟ ـــــــــ میری نگاہ میں تحصیلداری ایک چیز تھی اور ڈپٹی کلکٹری محض دماغ سوزی کا نام ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں دو تجربے ایسے ہوئے ہیں جو میرا جی چاہتا ہے کہ تمام نوجوان دنیا کی آگاہی کے لئے مشتہر کردوں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ اس کا نتیجہ کبھی ہرگز نہیں ہوگا۔

ان تجربات میں پہلا یہ ہے کہ ہر نوجوان اگر خدا توفیق دے، تو کبھی ہرگز کسی ایسی ہستی کو اپنی بیوی نہ بنائے جس سے وہ دراصل محبت کر سکتا ہو۔ فی الحقیقت شادی کرنا ہی اوّل درجہ کی نامعقول حرکت ہے، جو ہر نوجوان سے سرزد ہوتی ہے۔ پھر کسی ایسی شخصیت سے کرنا جس سے محبت ہو سکے ناقابل معافی گناہ ہے؛ بیوی اگر محض خدمت کرنے اور کھانا کھلا دینے کی خاطر کی جائے تو خیر ایک حد تک قابل برداشت ہو سکتی ہے، ورنہ قابل محبت بیوی ایک ایسی مصیبت ہے جو انسان کی تمام زندہ دلی خوشی اوقاتی، اور لطف صحبت احباب پر رفتہ رفتہ قابو حاصل کر کے انسان کو محض گھن چکر بنا دیتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ ہی اولاد بھی ہوتی رہی جو محبت کی صورت میں یقیناً ہوگی، تو بس غضب آ گیا، ایک اچھا خاصہ ہنسنے بولنے والا شخص افکار و مصائب کا شکار ہو کر تھوڑے ہی عرصہ میں جانور بن جائے گا۔

دوسرا تجربہ تحصیلداری سے ڈپٹی کلکٹری کی ترقی ہے۔ تحصیلداری میں ماتحتوں کا لشکر اور حکومت کا میدان، سب کچھ حاصل تھا۔ کچہری من مانی چیز تھی۔ جی چاہا تو ...... دن تک کسی وقت پہنچ کر "فلاں حاضر ہے" کی آوازیں لگوادیں اور ایک گھنٹہ میں سیاہ سفید کر ڈالا۔ اللہ اللہ خیر صلاح! میرا تجربہ یہ ہے کہ تحصیلداری کی مدت میں شاید تمام مقدمات میں سے ۵ فیصدی میں تجویز لکھنی پڑتی ہو، ورنہ سب صلحنامہ وغیرہ پر ختم ہوتے تھے۔ اب ڈپٹی کلکٹری میں "قیصر ہند اور ملزم" نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ قیصر ہند بہ نفس نفیس ہر مقدمہ میں غیر حاضر رہتے ہیں اور ملزم ہر مقدمہ میں بذات خود حاضر ہوتا ہے، اگر معاملہ برعکس ہوتا تو غالباً مصیبت ہو جاتی۔ بہر حال صبح سے لے کر شام تک قیصر ہند اور ملزم کے باہمی کشمکش میں مبتلا رہتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ جس طرح مادہ غیر فانی مانا جاتا ہے اسی طرح قیصر ہند اور ملزم کی باہمی نفرت و عناد بھی غالباً غیر فانی چیز ہے۔ مجھ سے اگر رائے لی جائے تو میں ضرور

کھونگا کہ تحصیلداری سے ڈپٹی کلکٹری پر آنا ایسی دلچسپ حماقت ہے جیسے آزادی غارت کرنے کے بعد ایک عدد بیوی اپنے سر منڈھ لینا۔ دونوں یکساں طور پر نامعقول حرکات ہیں اور دونوں کے حصول کیلئے ازبس تمنا و کوشش کی جاتی ہے۔ میں دونوں کو مثالاً بالکل ایسا سمجھتا ہوں جیسے ایک محصور قلعہ جس میں باہر والے اندر جانے کے متمنی ہوں اور اندر والے باہر نکلنے کے! ایسی حماقتوں میں بظاہر کچھ ایسی نظر فریبی اور دلگیری ہوتی ہے کہ اُن کا تاریک پہلو ہمیشہ ایک ناتجربہ کار سے نظر انداز ہو جاتا ہے اور تجربہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان خود پا بہ سلاسل ہو چکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک "درد لذت آمیز"۔ یا "لذت درد انگیز" سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ محض "حماقت نظر فریب"۔ یا۔ نظر فریبِ احمق شکار" سے زیادہ نہیں۔

اس تمام مرثیۂ عدیم الفرصتی کے بعد، فرمائیے کہ مضمون نگاری کس طرح ہو؟

جن سوالات کا جواب طلب ہے۔ وہ انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ موقعۂ فرصت پر دیا جائیگا۔ والسلام

اب تو آپ سمجھ گئے ہونگے کہ میرا پتہ کیا ہے۔؟۔ باندہ ــــ امید کرتا ہوں کہ آپ جغرافیہ کی امداد سے باندہ کے حدود اربعہ معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ جھانسی کمشنری میں ایک ضلع ہے دور جھانسی کی شہرت ایک عرصۂ دراز سے زبان زد خلائق ہے۔ بلکہ آپ بھی اس کو جانتے ہونگے۔ صحیح ہے نا؟ فقط

باندہ ۲۹ دسمبر ۲۷ء

سُلطان حیدر جوش

برادر مکرم مولوی سید ذوالفقار علی صاحب حقانی بی۔ اے۔ بی ٹی نے ازراہ کرم اولڈبوائے کی جانب توجہ فرمائی ہے۔ اور وہ اپنے وسیع حلقہ احباب میں سے برادران علیگڈہ کی فہرست مرتب فرما رہے ہیں۔ ڈائرکٹری کے باب میں ابتک "چہ کنم" میں ہیں اور تحریر فرماتے ہیں کہ

"اگر آپ میرا ذکر ضروری ہی سمجھتے ہیں تو صرف اتنا تحریر فرما دیجئے کہ میں ۱۹۰۸ء میں علیگڈہ میں شریک ہوا، اور ۱۹۱۴ء تک وہاں رہا۔ ایف اے اور بی اے وہیں سے پاس کیا۔ اب سررشتہ تعلیمات میں ہوں"!

دل لوٹ کے آتا ہے

دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
دل یہ جو ہمارا ہے
مانا کہ تمہارا ہے
چاہو تو یہ پیارا ہے
دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
اک بات میں ہٹ جائے
اک بات سے کٹ جائے
اک بات میں پھٹ جائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ بندا ہے
چاہو تو تمہارا ہے (۲)
چاہت کا یہ مارا ہے
چاہت کا ستارا ہے
دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
لہجہ یہ بہک جائے
تیور یہ بکھر جائے

اک حرف پہ مر جائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ پھندا ہے

(۳) کیا کھیل ہے دل داری؟
کھیل نہیں پیاری
یہ کام بڑا بھاری
دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
اک آن میں لڑ بیٹھے
اک پل میں اکڑ بیٹھے
اک دم میں بگڑ بیٹھے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ پھندا ہے

(۴) یہ دل کا لگانا ہے
یہ خود کو مٹانا ہے
دل ہاتھ میں لانا ہے
دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
آنسو سے اٹک جائے
نظروں سے کھٹک جائے
ہنسیوں سے بھٹک جائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ پھندا ہے

(۵) چاہت ہی صداقت ہے
چاہت ہی عبادت ہے
چاہت ہی شہادت ہے

دل لوٹ کے آتا ہے دل لوٹ بھی جاتا ہے
اک بھول پہ رک جائے
اک چوک جو بھک جائے
پھر قصہ ہی چک جائے
احساس کا دھندا ہے الفت کا یہ بندا ہے

عظمت اللہ خاں مرحوم

قومی ہفتہ میں شرکت کرنیکی غرض سے مدراس آتے جاتے ملک کے متعدد مشاہیر حیدر آباد
آئے تھے۔ آنریبل سر عبدالقادر ان کے منجملہ ہیں۔ شیخ صاحب کا قیام تو نواب صدر یار جنگ بہادر کے یہاں
تھا مگر ان کے اعزاز میں ہمارے برادر مکرم نواب فخر یار جنگ بہادر نے نظام کلب میں "کلو والشربو"
کا انتظام فرمایا تھا۔ ہمارے بھائیوں میں سے مولانا محمد علی اور قاضی بدر الحسن جلالی صاحبان کو
بھی برادران حیدر آباد کی محبت ادھر کھینچ لائی تھی۔ مولانا کو ان کے شریک درس مسٹر محمد اصغر نے
اپنے آغوش الفت میں لیا، اور مسٹر بدر جلالی جناب ترمذی کی شمع کاشانہ محبت بنے۔ احباب کی یہ
گھڑیاں بہت لطف کے ساتھ کٹیں۔ بھائی قاسم حسن صاحب کی صحبت سے تو تمام احباب ایک بار
اور اپنی سابقہ حالت پر عود کر آئے تھے۔ ان بزرگوار نے "ہمارا قل" بھی پڑھا تھا اور ساتھ ہی لڈوؤں
کے خزانہ کو بہت سے بھائیوں کی رقم سے بھر گئے۔

ولایت سے واپس آنیوالے بھائیوں میں سے ایک صاحب کا اور پتہ چلا ہے۔ یہ ہماری
عنایت فرما نواب عنایت جنگ بہادر کے بھانجے میر تجمل حسین خاں صاحب ہیں۔ انکی سیاحت یورپ
نواب سالار جنگ بہادر کی معیت میں بالکل تفریحی تھی۔ ہم اپنے بھائی کو خوش آمدید کہتے ہیں اور
نواب سالار جنگ بہادر کا خیر مقدم کرتے ہیں جو تین پشت سے ہماری علمی کشتی کو سہارا
دیتے رہتے ہیں۔

شرح دیوان غالب پر ایک نظر

(۱۵)

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

شعر صاف ہے اسلئے ہم کو شرح و شارح سے یہاں کوئی بحث نہیں۔ ہم صرف مرزا بیدل کے اُس شعر کو مکرر یاد دلانا چاہتے ہیں جو اوپر گزر چکا ہے یعنے ؎

شعلہ کاراں را بہ خاکستر قناعت کردنست
ہر کجا عشق است دہقاں سوختن ہم حاصل است

دیکھئے کہ مرزا غالب کے اس مطلب کو ادا کرنے کی یہ تیسری کوشش ہے اور چونکہ اس نقش ثالث کے تیاری میں انھوں نے صرف خیال بیدل کا لیا ہے اور ان کے الفاظ سے کوئی واسطہ نہیں رکھا ہے، جیسا کہ پہلے نقل شدہ دو شعروں میں ہے اسلئے انکی سعی مشکور رہی ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ " ناگزیر الفت ہستی" کہہ کر غالب نے اصل مضمون پر ترقی کی ہے۔

(۱۶)

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

شارح مدظلہ فرماتے ہیں "اس شعر میں ہائے یا تو علامت جمع و اضافت ہے یا کلمہ تاسف ہے۔ دونوں صورتیں صحیح ہیں"۔ میں عرض کرونگا کہ دونوں صورتیں بیشک صحیح ہو سکتی ہیں لیکن اگر مرزا غالب

جیسے استاد نے ہائے کو اس مقام پر بطور کلمہ تاسف داخل کر کے اچھے خاصے شعر میں بدنما تعقید اور اختلال بندش کو جایز رکھا ہے تو مقام تاسف ہے۔ فارسی علامت جمع کا استعمال مرزا غالب کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے پھر کیا مشوق نے تخیر پر ایک ہی نظر ڈالی تھی؟ اور کیا صفت "تیز تیز" کی تکرار اور مصرع ثانی میں فقرہ ہائے کرمن کے تقابل کے بعد بھی اس "ہائے" کے علامت جمع ہونے میں کوئی شبہ باقی رہتا ہے؟ فافہم۔

(۱۷۱)

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

حاصل شعر یہ ہے کہ "دل (گرفتہ) ناخن غم سے کاوش کا تقاضا (قرضخواہ کی طرح) کر رہا ہے اور یہ کہ "لفظ ہنوز اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ کاوش غم پہلے بھی ہو چکی ہے"!

مگر میں کہتا ہوں کہ دل کو گرہ یا گرہ نیم باز کہہ کر اس کے کھولنے کی خواہش ناخن سے کرنیکا مقصود کشادگی و انشراح دل ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ عقد دل کی گرہ کھولنے کی خواہش ہی اسبات کی دلیل ہے کہ دل منقبض و گرفتہ ہے۔ ایسی صورت میں شعر ان الفاظ اور چاہتا ہے "کاوش ناخن (غم) سے واشد دل ہوتی ہے اس لئے کاوش کا دل کرے ہے تقاضا الخ" کاوش ناخن سے واشد دل ہونے کی صراحت اس لئے درکار ہے کہ کاوش سے حقیقتاً صدمہ پہونچتا ہے اور صدمہ گرفتگی دل کا باعث ہوتا ہے پس یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قایل جو عاشق ہے اس کا دل کاوش سے گرفتہ ہونے کے بجائے شگفتہ ہوتا ہے۔ اسی مطلب کو مرزا بیدل نے کیا خوب ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں سے

غنچہ می گوید بہ بلبل کامد ریں گلزار داد عقدہ دل را ناخن آشفتگی وا می کند

بہر کیف بہ صورت موجودہ شعر کے الفاظ شاعر کے مقصود ذہنی کو ادا کرنے سے قاصر رہیگا۔

(۱۸)

نازش ایام خاکستر نشینی کیا کہوں پہلوے اندیشہ وقف بستر سنجاب تھا

شرح فرمائی ہے کہ "اگرچہ میں خاک نشین تھا لیکن میرا دل قناعت کے فخر و ناز کے سبب سے
فرش سنجاب پر لوٹ رہا تھا لیکن قناعت کا پہلو کسی لفظ سے نہیں نکلتا۔ ایک نازش کے لفظ
سے نازش قناعت کے معنی لینا محض تاویل اور تاویل محض ہے۔ پھر سوال یہی ہے کہ اگر پہلے
خاکستر نشینی تھی تو اب سنجاب گزینی کہاں سے حاصل ہوئی؟ پہلے قناعت تھی تو اب حرص کیوں
دامنگیر ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کی ردیف مخل معنی واقع ہوئی ہے۔ اگر تھا کی جگہ ردیف
ہے ہوتی تو مطلب حاصل ہو جاتا اور تقریر کے برمانہ حال ہونے سے قناعت کا مفہوم بھی نکل آتا۔

(۱۹)

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگزار تھا

شارح علامہ فرماتے ہیں کہ "رہگزر سے رہگزار معشوق مراد ہے" بیشک مراد تو یہی ہے لیکن
کوئی لفظی قرینہ رہگزار کے رہگزار معشوق ہونے کا نہیں ہے۔ فارسی میں ایسے مقام پر "سر رہگزارے"
یائے تنکیر کے ساتھ کہیں گے اور اردو میں بھی یوں کہیں گے کہ "میں کسی رہگزار کی ہوا کا جاں دادہ تھا"

(۲۰)

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

شرح "قاعدہ ہے کہ آئینہ میں ایک ہی عکس دکھائی دیتا ہے لیکن جب اسے توڑا تو
ہر ٹکڑے میں وہی پورا عکس معلوم ہونے لگتا ہے۔ تو یہاں ایک ایک عکس کو دیکھ کر ایک ایک آرزو
کا خون ہوتا ہے۔ غرضکہ جس آئینہ میں معشوق کے عکس و تمثال کا جلوہ تھا اس کے ٹوٹنے سے
یک شہر آرزو کا خون ہو گیا"۔ اور نظیراً یہ شعر پیش کیا گیا ہے ؎

نظر آئے کبھی کاہے کو اک جا خود نما اتنے
یہ حسن اتفاق آئینہ ان کے روبرو ٹوٹا

اس شرح سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ آئینہ حقیقی معنوں میں ہے لیکن اسی کے ساتھ شرح و متن میں کسی قدر ربط بھی ضروری ہے۔ اب حضرت شوکت میرٹھی کی سنیے وہ کچھ اور ہی راگ گاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "یہ شعر اہلِ فرنگ کے مذاق کے موافق لکھا ہے۔ انہیں یہ دستور ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کی تصویر منگا کر اپنے پاس رکھتے ہیں، شادی بیاہ وغیرہ کے لئے یہ رسم زیادہ مروج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے جو آئینہ یعنے جو شیشہ توڑ ڈالا جس میں میری تصویر تھی تو اب میں اپنی آرزو کا ماتم کرتا ہوں کیونکہ آئینہ کے قایم رہنے سے مجھے جس کی آرزو تھی یا یہ خیال تھا کہ تجھے مجھ سے محبت ہے" مگر شاداں بلگرامی شرح میں شوکت کے خلاف یہ لکھتے ہیں کہ "یار سے کہتے ہیں کہ میرے پاس جو تیری تصویر کا آئینہ تھا جب تو نے اسے توڑ ڈالا تو مجھے انتہا درجہ کا غم ہوا کیونکہ اپنے دل کی آرزو اسکے دیدار سے پوری کر لیتا تھا۔ ماتم یک شہر آرزو۔ انتہا درجہ کا ماتم یعنے اس غم میں میرے ساتھ ایک شہر آرزو ماتم کناں ہے"

مجھے حیرت ہے کہ ایک سامنے سے شعر کے کیا معنے بنا لیا گیا ہے۔ پہلا مصرع محض بیان واقعہ ہے تو شاعر کہتا ہے کہ اب میں ماتم دار آرزو ہوں یک شہر آرزو کثرت آرزو کے لئے ہے۔ چونکہ دل ہی آرزوؤں اور تمناؤں کا گھر یا شہر ہوتا ہے اس لئے ماتم دار آرزو ہونا اسکی دلیل ہے کہ شہر آرزو دل، ویران و برباد ہو گیا ہے (آرزوؤں کے مٹ جانے سے) دوسرا مصرع پھر اسی بیان کی توضیح میں ہے کہ یہ جو کچھ ہوا وہ تیری وجہ سے (یہ اشارہ ہے معشوق مخاطب کی طرف) کیونکہ تو نے میرے دل کو توڑا ہے، کیسا دل جو آئینہ تھا اور کیسا آئینہ جو تمثال دار تھا۔ یہ سب استعارات ہیں اور ان میں کوئی نیا استعارہ نہیں ہے۔ صرف اتنا بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے دل کو خالی آئینہ نہیں کہا بلکہ تمثال دار آئینہ کہا اسلئے کہ اس کا مقصود دل پُر آرزو تھا۔ مثال کتنی بدیع ہے۔ ظاہر ہے کہ آئینہ سادہ ہے تو ویران ہے اور اسمیں عکس یا تمثال ہے تو آباد ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ او ظالم جس آئینے کو تو نے توڑا وہ آباد (تمثال دار) آئینہ تھا۔ مدعا یہ کہ جس دل کو تو نے ویران کیا وہ دل بے مدعا نہ تھا بلکہ یک شہر آرزو تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

میں جو پہلے وابستہ آرزو تھا اب ناتمام دار آرزو ہوں یعنی جو تجھ سے امید رکھتا تھا۔ اب ناامید ہوں
اس شرح میں حضرت والد مرحوم (صاحب ذوق صاحب) ایک حد تک میرے ہمخیال ہیں۔ انکی شرح ہے کہ
میرے آئینہ دل میں تیری صورت تھی جس سے ہزاروں آرزوئیں زندہ تھیں۔ آئینہ دل جو ٹوٹ گیا تو وہ صورت مٹ گئی
آرزوئیں مردہ ہو گئیں "۔ جیسے مرحوم سے صرف استعداد استعارہ کا سبب الفاظ یا دقت الفاظ سے نکل آتے ہیں تو صورت
بنانے اور بگاڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا روزمرہ کا محاورہ ہے۔ دل توڑنا اور دل ٹوٹنا جب کوئی کسی کے خلاف
آرزو اور خلاف امید کام کر کے اُسے روحانی صدمہ والم پہنچاتا ہے تو کہتے ہیں کہ تو نے میرا دل توڑ دیا صورت
سورت کی ضرورت اسلئے بھی نہیں ہے کہ بیداد آرزو تمنا وغیرہ جذبات نفسانی کو یوں بھی بتوں سے تعبیر کیا گیا ہے
جو خانۂ خدا (دل) کو ناپاک کرنیوالے نقوش ہیں۔

(۱۴)

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مطلب واضح ہے مگر اعتراض یہ ہے کہ ہلال تشبیہ کی وزن سے نہ اسکا اور شعر کا مطلب ناتمام رہگیا۔ اسلئے کہ شمشیر کا
عریاں ہونا ہلال (عید نظارہ) کے دکھائی دینے سے مشابہت رکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عید کا لفظ آجانے
سے شمشیر کے عریاں ہونے میں ایک صورت استعارہ نمود ہلال کی خود ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز اگر ہلال عید نظارہ
اور شمشیر عریاں میں نسبت تشبیہہ فرض نہ کی جائے تو بھی کیا مضائقہ ہے۔ اس مصرعہ کو محض بیان واقعہ تصور
کر سکتے ہیں۔ معشوق قتل گاہ میں عاشقوں کے قتل کو برہنہ تلوار لیکر آیا۔ ان دیوانوں کو اپنے قتل کئے جانے کا
تو رنج نہ ہوا اور خوشی اسبات کی ہوئی کہ خیر اسی حیلہ سے ہم کو روئے معشوق کا نظارہ تو نصیب ہوا۔ لگے
اچھلنے کودنے اور عید منانے ع دیوانوں کی باتیں ہیں دیوانے کو کیا کہئے۔

ضامن کنتوری

شامِ غریباں

شوکتِ مسلم گئی نکبت کے ساماں دیکھیے
دیکھ لی صبحِ وطن شامِ غریباں دیکھیے

انقلابِ گردشِ گردونِ گرداں دیکھیے
صوم کی قینچی ہوئی تیغِ صفاہاں دیکھیے

جان و مال و جاہ و عزت کا نگہباں ہے خدا
سو رہے ہیں پاسبانِ دولت کو درباں دیکھیے

موج بڑھتی جا رہی ہے بحرِ طوفاں خیز ہے
ڈگمگاتی جاتی ہے کشتیٔ ایماں دیکھیے

پھول پھل کیا۔ خار و خس گیا خاک تک چھینی گئی
لٹ گیا کس طرح سے یہ گلستاں دیکھیے

اک سرِ شوریدہ ہے اور اس میں سودے ہیں ہزار
ایک دل ہے اور کئی ہیں دل کے خواہاں دیکھیے

پڑ گئی آنکھوں میں مٹی بادِ تند ایسی چلی
اڑ رہی ہے روئے زلف و حسنِ جاناں دیکھیے

شربتِ دولت ہوا ہے جرعۂ زہرِ فنا
دل میں دم۔ اور یہ حالِ طبیباں دیکھیے

مانگ کر بھی لے گیا جیسے چرا کر بھی لیا
اور پھر الٹا جتاتا ہے وہ احساں دیکھیے

ایسی غفلت ہے کہ کانٹوں پر بھی آتی ہمکو نیند
اب نظر آتے ہیں کیا خوابِ پریشاں دیکھیے

کاہلی بے ہمتی پابندیٔ رسمِ فضول
جمع ہیں سارے پریشانی کے ساماں دیکھیے

بے کفن لاشیں ہیں ہم زندہ ہمیں کہتا ہے کون
گھر نہ کہیے۔ حالتِ گورِ غریباں دیکھیے

انقلابِ دہر یہ ہے آج طفل نے سوار
زعم میں اپنے بنا ہے مردِ میداں دیکھیے

ہم وہ عالی فہم ہیں۔ شاگردِ استادِ ازل
بحث ہم سے کرتے ہیں طفلِ دبستاں دیکھیے

روشنی کچھ رہ گئی۔ کھو لٹ گیا سامانِ عیش
بن گیا تارا گلِ شمعِ شبستاں دیکھیے

مجھکو سیرِ داغہائے سینہ سے فرصت کہاں — آپ ہی رنگِ بہارِ باغ و بستاں دیکھیے
کیا ہوئی وہ آپ کی لطف و عنایت کی نظر — پھر اسی انداز سے سوئے غریباں دیکھیے
اک مجلد خوشنما تاریخ کا ناقص ورق — دیکھنا ہو تو زوالِ مسلماں دیکھیے

سربسر افسانۂ عبرت ہے شہرت حال پر
چاکِ داماں دیکھیے، تارِ گریباں دیکھیے

(شہرت)

گزشتہ حیدرآباد لیڈیز کانفرنس میں جو زیر صدارت لیڈی حیدری منعقد ہوئی تھی اجن خواتین نے عملی حصہ لیا، اُن میں مسز صوفی بی۔ اے بھی ہیں۔ اس مرتبہ بیگم صوفی نے شریک جلسہ ہونے کے فرائض انجام دے تھے۔ ان کے شوہر مسٹر صوفی ہمارے کالج کے فرزند اور سرکار آصفیہ کے محکمہ عدالت کے عہدہ دار ہیں۔ مسز صوفی نے انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے دونوں امتحانات مسلم یونیورسٹی سے کامیابی حاصل کی ہے۔

اس مرتبہ جشن نوروز کی خوشی میں جن شخصیتوں کو خطابات ملے ہیں ان میں اولڈ بوائز نے بھی نمایاں حصہ پایا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب رئیس جہانگیر پور، چودھری سید عبدالحسن صاحب سشن جج اعظم گڑھ، اور مولوی ظفر حسن صاحب خان بہادر ہوگئے۔ اول الذکر ہمارے نواب صدر یار جنگ بہادر کے خلف الرشید اور "الولد سرّ لابیہ" کے مصداق ہیں اور اوسط الذکر ہمارے کالج کی ادبی و قانونی ڈگریوں سے لیس ایک سرکاری سشن جج۔ مولوی ظفر حسن صاحب اب اولڈ بوائے کو بھول گئے، ورنہ وہی تھے کہ کبھی "آتش" اور کبھی "پنچے" پر اپنے اس رسالہ کے لیئے خامہ فرسائی کیا کرتے تھے۔ یہ بڑی بات ہوئی کہ خانصاحبی کے درجہ سے نکل کر اب بہادری کے طبقہ میں آگئے۔ انکی جگہ مسٹر کمال نے لی ہے جو میونسپل بورڈ فتح پور کے چیرمین ہیں۔ ہاں! یاد ش بخیر! بھائی محمد ذکی صاحب بی۔ اے ایل ایل بی وکیل سرکار گورکھپور بھی قابل ذکر ہیں کہ ایک جانب انھیں خاں بہادری کی سند حاصل ہوئی اور دوسری طرف پنڈت تیج نرائن ملا صاحب کی سعی سے ہمارے بھائی "گورنمنٹ ایڈوکیٹ" بنا دیے گئے۔ ان سب بھائیوں کو ہم مبارکباد دیتے ہیں۔

<<<<<<<<<<<

تائیس* کو دنیا بھول سی گئی تھی، کیونکہ صدیاں بیت گئی تھیں کہ یہ ساحری پھول کھل کر کملا گیا۔ بے شک کچھ
مصر و یونان کی اتنی پرانی باتیں کہ سکندر اعظم کی شہرت شباب پر ہو، بہت کم شاید ایسی ہوں، جو ہوں تو ہوں
جو چھتے سے اتری نہ ہونگی، ورنہ شہد سے ہاتھ لگی بات کہی۔ بہت ہوا تو انہوں نے اپنی مہربانی سے
تاریخ قدیم کے صفحات کی انھیں زینت بنا دیا جن سے بچ بچا کے وہ الماریوں میں زیادہ خوبصورتی سے
محفوظ ہیں۔ خیر یوں تو زمانہ کا ستم کہ آخر انہیں ہمیشہ ہے جو کبھی کسی کو نہیں کرتا۔ حضرت آدم کی گھٹی پیداوار پر نظر
دوڑائیے، کائنات کی اور چیزوں میں شاید ہی اتنی برکت ملے تو ملے۔ کاش اجزائے فانی کا اصل اتنا
بابرکت ہوا کرتا!! مگر اس "ترو فرو" کے معاملہ میں بھی حضرت گنتی کے ایسے نظریے نے جن سے یاد رہ جاتے ہیں اور
جیتے جی نہیں بھولتے، ورنہ باقی اور سب کیسے تو قسم کہ اگر یوں کہنا پڑتا ہے کہ پیدا ہوئے تھے۔

تائیس بھی اس آن اصول سے بے کام نہ گئی تھی۔ مگر اناطول فرانس کی دنیا دیکھی نظر نے پا لیا اور
اس میں پیچ بیان کی ایسی گرمائی ڈالی کہ پھر وہ تیار ہو گئی۔ اس بزرگ کی نظروں سے تائیس کو
دیکھئے گا تو ایسا معلوم دیگا، زندگی کی یہ بہار ہے جس پر ایک دلہن نئی لطف و انبساط کی کروٹیں بدل رہی ہے
جو اول اول آرائش و عشرت کی کفیل تھی تو بعد میں توبہ و استغفار کے آنسوؤں سے نکھر کر کچھ سے کچھ بن گئی۔ کیا
عجب نہیں جو اس پیارے منظر کی لطیف گنگا جمنی دیکھ کر قوس قزح کی طرح آپ بے تاب ہو جائیں مگر ساتھ ہی

---

* "تائیس" مصنفہ موسیو اناطول فرانس، مترجمہ جناب محمد عنایت اللہ خاں صاحب دہلوی بی۔ اے (علیگ)

منھ سے یہ بھی نکل جائے گا کہ اس سمجھ کے بیٹے کا سا انجام خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے!

انیسویں صدی عیسوی فرانس نہیں! یورپ بھر نے علم و ادب کی بڑی بڑی یادگاریں صدیوں گزر جانے پر باقی ہیں ہم سیوا ناطول اس کا نچوڑ تھا۔ اس لئے ہر رنگ میں رچا ہوا مگر بڑا سادہ و پرکار۔ خود ایک کیریکٹر تھا اسواسطے ایک خاص اسٹائل کا مالک بھی تھا۔ طبع خداداد کی جدت وجودت سے جو بات کہی انوکھی، چبھتی، تلی اور نڈر نبکر۔ ساتھ ہی اس اہتمام سے کہ سننے والے کے دل میں اتر جائے۔ تنقید بھی بلا کی گہری پائی تھی۔ ذہانت اور استعداد علمی کے کمال کا بھی یہ عالم ہے کہ جس مشکل سے مشکل بات کو لیا پانی کر دیا (Temps) کے نت نئے جواہر پارے اور اسکی دوسری چیزیں دعوے کی بیّن دلیل اور ایسے خوش آب موتی ہیں جنکی روشنی سے دل و دماغ جگمگا اٹھتا ہے! اسکی سنگت سدا بہار ہے جس سے جی اُکتاتا نہیں۔ اسکے انداز خصوصی میں کبھی کبھار تلخی بھی آجاتی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ شاید مٹھاس کی زیادتی ہو! اسکے شفاف اور خوش آیند اسٹائل کا روح کی بالیدگی پر ایسا لطیف مگر پائیدار اثر ہوتا ہے جیسے ساون ماس کی ہلکی ہلکی پھوار کا زمین کی قوت نامیہ پر! جو انجان کی گہرائیوں میں اتر کر گیان کے کنول کھلاتی ہے! اسکی روح ایک ایسا آبدار ہیرا ہے جس کے بے گنتی پہل ہیں اور ہر پہل اک نرالی جوت والا ہے!

تائیس مصر سے فرانس آکر ایسی خوبیوں والے مصنف کے پاس رہی جسکے فیض صحبت سے اچھے اچھوں کے کان کاٹنے لگی ہے! پفنوتوس اس کا روحانی چاہنے والا اپنے آپ کو بڑا عالم باعمل اور پہنچا ہوا جانتا ہے۔ ایکدفعہ بڑی ہمدردی جتا کر اسے پُربہار طرز زندگی سے روکنا چاہتا ہے۔ یہاں تائیس کا شستہ توڑ جواب سنکر اندازہ لگایئے کہ یہ کس تحمل اور حوصلہ کی عورت بن گئی ہے!

"کیا خوب! خدا کو کس نے مجبور کیا ہے کہ میری ہی خلوتگاہ کو ہمیشہ گھورتا رہے۔ اگر کوئی بات اُسے ناراض کرتی ہے تو نہ دیکھے ہٹ جائے! لیکن ناراض ہی کیوں ہو۔ اگر اُسنے ہمیں پیدا کیا ہے تو پھر جیسا بنا دیا اور جسطرح اسکی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہمارے اعمال ہیں اُنپر بگڑنے یا حیرت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہت سی باتیں اسکی طرف سے بنا کر کہہ دی جاتی ہیں اور بہت سے خیالات اسطرح بیان کئے جاتے ہیں گویا خدا سے قرض مانگ لائے ہیں حالانکہ وہ اسکے پاس کبھی تھے ہی نہیں! پہلے اسکی حقیقت تو پہچان لو۔

تم کون ہو؟ جو اسکے وکیل بنکر میرے پاس آئے ہو؟!

ذرا زور استدلال دیکھیے گا خیال کیسلئے ظالم نے کیا باقی رکھا!

خیر! تائیس کو یا تو یوں دراز یورپ میں رہتے سہتے دیکھا تھا یا ایکا ایکی دلّی میں نظر پڑی۔ آڑا پیجامہ، صوفیانی دوپٹہ اور زلف بدوش! حیرت سی حیرت تھی کہ الٰہی! ہمارے ہاں ایسا کون سا منچلا نکلا کہ خیالات سے مالا مال تائیس کو بہکا کر اناطول فرانس جیسی جید ہستی سے یوں چھین لے آیا لیکن معلوم ہوا یہ خوش صفات مترجم کی کارستانی ہے!

جناب مترجم ترجمہ کے مالک ہیں اور آج سے نہیں ایک زمانہ سے دنیائے اردو کے روشناس ہیں۔ اردو تو خیر گھر کی ہے۔ انگریزی کو بھی گھر میں ڈال لیا ہے! جب جی چاہا اسے دلی کا پہناوا پہنا دیا۔ پھر اس سلیقہ سے کہ دیسی بدیسی کا امتیاز باقی نہیں رہتا! آپ نے سر سیّد مغفور کی آنکھیں دیکھی ہیں پر سپرٹ آف اسلام کپلنگ کی جنگل بک والی دو کہانیاں وغیرہ بھی اردو کی ایسی نمایاں چیزیں ہیں جو بھلائے نہیں بھول سکتیں۔ غرض آپ علی گڑھ کی مادر علمی کے ایسے قابل قدر سپوتوں میں سے ہیں جو اچھے ادیب اچھے مترجم اور اس لئے اچھے علیگ ہیں جنہوں نے اپنے فطری ذوق ادب اور رنگ خاص کو ابھار کر اتنا اجاگر کیا کہ اس سے ایم۔ اے۔ او کالج کی عظمت قائم ہوئی۔ یہی وجہ ہے جو غالباً بی تائیس بھی ادھر آ نکلیں!

تائیس کا بڑا مزہ دار قصہ ہے جس میں انوکھے مصنف نے نئے نئے قرینے برتے ہیں۔ ایک تو یہی کہ سکندر اعظم والے اور دراز زمانہ تک بلا تامل آپ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ پھر اس بے تکلفی سے کہ اس زمانے کو عین میں سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ جو ظاہر ہے آسان کام نہیں کیوں کہ یہاں مصنف کی روح کو اتنا سکت شناور اور غواص ہونا پڑتا ہے کہ استداد کی تہیں کھنگولکر گوہر مقصود لے آئے گھبرائے نہیں۔ خیر! اسے بھی جانے دیجیے۔ کتاب کا موضوع خود ایک نئی نویلی، دبیج، وزنی اور اعلیٰ چیز ہے۔ جسے مصنف رہبانیت کی شکل کر دینے والے رنگ میں پیش کر کے اچھا خاصا ایک سنجیدہ مسلمان بن گیا ہے! سارے قصہ میں ٹیپ کا بند فلسفۂ عدم تکمیل خواہش ہے یعنی بالفاظ غیر قدرت کی پیدا کی ہوئی کوئی شے بیکار نہیں۔ اسلئے اُسے بے کار رکھنا یا قصداً بے کار کرنا قدرت سے کھلی جنگ ہے۔ جہاں وہ آنکھ بند کر کے ٹھکرا دیا کرتی ہے، وہ صاف ہے۔ انسان کی

بے گنتی خواہشات جو عجیب سے ڈھنگ لیتی چلی آتی ہیں، اور جو [illegible] [illegible] قوت کا مظہر ہوتی ہیں۔ قوت کو ٹھیک راہ لگا دینے ہی سونا اور جیرت؟ مگر اس کو دبا دبا کر یہ چاہنا کہ وہ مٹ جائے بہت حماقت ہے جس سے بجائے قابو میں آنے کے وہ اور بھی [illegible] ہے۔ اس صورت میں ایک راہب کا یہ چاہنا کہ خواہشات نفسانی مطلق مٹ دی جائیں، بالکل خلاف فطرت اور اس لئے فطرت سے خوفناک جنگ کا الٹیمیٹم ہے۔ یوں دیکھنے میں یہ خواہشات بڑی حد تک دبی ہوئی معلوم دیں گی لیکن اصل میں روئی کی آگ بن جاتی ہیں۔ جو اندر اندر سلگ کر اپنی [illegible] روح کو انتشار اور بے اطمینانی سے اتنا کھوکھلا کر دیتی ہے کہ ایکدن زہد و تقدس کا شاندار ایوان مبارک دھڑام سے قدموں پر آ رہتا ہے! **ایفنوتوس** بھی اسی بدتوفیقی کا شکار ہے!

تصویر کا دوسرا رخ **تائیس** ہے۔ قطع نظر اس کے کہ تائیس کا طریق تکمیل خواہش اعتراض کے قابل ہے۔ یہ قوای فطری کے ارتقاء میں روڑا نہیں اٹکاتی۔ بلکہ بقائے ذات کے لئے مشق کرنے دیتی ہے۔ چنانچہ کنٹھ نکلنے یا سینہ اُبھرنے کے بعد کے جو نفیس اور ضروری جذبات و خواہشات ہیں ان سے بتقاضائے فطرت سیر ہو کر **ایفنوتوس** کی نظروں میں گو یہ بدترین ہستی بن جاتی ہے مگر لطف یہ ہے انھیں قابل نفرین برائیوں اور ناقابل معافی زیادتیوں میں یکایک یہ ایسا رد عمل بھی محسوس کرتی ہے کہ ایک اشارہ میں رحمت الٰہی اسے ملاء اعلیٰ تک اٹھا لیتی ہے! صورت حال جب یہ ہو تو فرمائیے انجام کار کون جیت رہا؟! وہ بن باس راہب جو روتا آیا اور روتا ہی رہا یا خوش عیش **تائیس** جو ہنستے کھیلتے زندگی بسر کرکے ہنستی کھیلتی ہی سدھار گئی!

اصل تصنیف کی طرف میں اس سے زیادہ اشارہ نہیں کرونگا۔ تصنیف کا وقار چاہتا ہے کہ اناطول فرانس سا عالم و ادیب جس چیز کو بیسوں صفحوں میں پھیلائے جس میں **تائیس** سی لخلخہ کی عورت، **پولیوس** سے سیاح، **فیقرو** سے عالم، **ڈموس تھنیس** سے خطیب، **ابی قورا** اور **زخار فریوس** سے فلسفی اور **برنگلس** سے مدبر سے آپ دو چار ہوں جس میں زبان و خیال کا گلزار پڑا لہلہا رہا ہو اسے صحو ڈیڑھ صفحے میں گھونٹنا خاک میں ملا دینا ہے۔ اس کا مزہ تو اسی وقت پورا پورا ملیگا کہ آپ ہوں جناب مصنف و مترجم ہوں اور سب ملکر [illegible] کے

صحرا کی سیر کو نکلیں۔ دریائے نیل کے کنارے اتنی چہل قدمی ہو کہ وہاں ایک آدھ صبح شام بھی ہو جائے۔ راہب و راہبات سے ملئے، ان کی حرکات و سکنات دیکھئے جس سے یہ اندازہ ہو کہ دنیا میں کس کس روش کے لوگ آباد ہیں۔ اسکندریہ کی گلی کوچے بھی آپ خود چھانیں۔ تھیٹر کے تائیس والے تماشے گھر میں جا بیٹھیں جس میں نامور و حسین رقاصہ کی حیثیت سے وہ وینس لیدا اور تھیٹی کا بہروپ لے کر نغمۂ حیات میں کھو جاتی ہے! اسی ہنگام عیش میاں پفنوتوس بھی تھرتھرانے لگا، تب آپ کو نظر پڑیں جو وہاں خیر سے وعظ کہنے آئے ہیں! زبان پہ تو یہ وہ استغفار ہے مگر دل کا خدا حافظ ہے، اور آنکھیں یہ منظر دیکھ رہی ہیں کہ "تائیس لیدا ہی کی طرح سنبل کی سیج پر لیٹی ہے۔ منہ اونچا کئے ہوئے ہے، آنکھیں روشن اور نم ہیں، نتھنوں کو حرکت ہوتی ہے، چھاتیاں ابھری ہوئی ہیں، اور دونوں بازو اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے عشق و الفت کے دو چشمے رواں ہوں! جسے دیکھ کر پفنوتوس سینہ کوٹ لیتا ہے!" اسکے بعد اور بھی کوڑیوں خوشنما منظر آپ کی نظر سے گذریں گے جو ایک سے ایک بڑھا چڑھا ہوگا۔ ایک جگہ آپ کو دکھائی دیگا کہ میاں پفنوتوس کی گت بنائی جا رہی ہے، اور تائیس انھیں چٹکیوں میں اڑا رہی ہے۔

"کرم فرما! یہ تو بتائیے کہ جس عشق کا آپ ذکر کرتے ہیں، اس کا اتا پتا کیا ہے، یہ عیش کہاں ملتی ہے؟ ذرا جلد فرمائیے، تقریر کو طول دینے سے میرا جی میلا ہوتا ہے! وقت ضائع نہ کیجئے۔ جس عیش و نشاط کی خبر آپ لیکر آئے ہیں، میں اسکے معلوم کرنے کی بے حد مشتاق ہوں لیکن اگر آپ صاف کہلواتے ہیں تو سن لیجئے۔ میں ایسے عیش و نشاط سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ آپ کے یہ سب دعوے آپ کے فقروں ہی تک رہ گئے۔ آپ ایسے عشق کا وعدہ کرنا جو ہمیشہ رہے، آسان ہے مگر اس کا ایفا مشکل ہے۔ دنیا میں ہر شخص کوئی نہ کوئی وصف رکھتا ہے۔ آپ کا جوہر کشف ہے۔ آپ ایسے عشق کی خبر دینے آئے ہیں جس کا آج تک کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ سنئے یہاں تو بازار حسن میں بوسوں کا لین دین اتنی مدت سے جاری ہے کہ کسی قسم کا عشق بھی ایسا نہیں جس کا راز ہم پر نہ کھل گیا ہو! یہ باتیں عاشقوں سے پوچھئے۔ آپ جادو ٹونے کے آدمی ان باتوں کو کیا جانیں!"

تائیس کی یہ باتیں دل لگی ہی سہی مگر ایک رائے ہے۔ جو دکھا دے کہ "جبہ و دستار" اور اس زعم باطل کو ٹھکرا دیتی ہے کہ زہد و تقدس کی چار دیواری ہی میں فضلِ الٰہی محدود ہے!

انتہا یہ کہ اسکندریہ کے ساحل تک، اس خوبصورت نے پفنوتوس سے کہا کہ آپ رب
ہوا دیکھیں جب سے کشتی ... کی رفتار کا حال ... ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی
دیکھیں کہ بجائے یہاں کے وہ ... ہے تا جلد طلوع ہوا ہے مگر ہمیشہ کو غروب ہونے کے لئے! غرض
"صبح ازل کی روشنی" میں جوں جوں تائیس موت کی سیڑھی سے قریب تر ہوتی جائے تاکہ ارتقائی روحانی
کی ایک اور منزل طے کرے، تو پفنوتوس کے دل کی کلونس اور زیادہ اجاگر ہوتی نظر آئے حتیٰ کہ تائیس
کی پتلیاں پھریں اور لڑکھڑاتی زبان پر یہ وداعی الفاظ آپ کو سنائی دیں!

"عرش کے دریچے کھل گئے ہیں۔ ملائکہ، انبیا، اور خدا کے اولیا نظر آرہے ہیں۔ مقدس تھیوڈور شہید،
میرا ایک انس بھی اُن ہی میں ہے؛ اور اُس کے ہاتھوں میں پھول ہیں۔ وہ ہنستا ہے اور مجھے پکارتا ہے۔
دیکھو۔ وہ دو فرشتے بڑھے ہوئے میری طرف آرہے ہیں۔ لو۔ وہ آگئے۔ کیسے خوبصورت ہیں۔ ......
خدا کا دیدار شروع ہوگیا"!

ساتھ ہی منہ سے ایک خوشی کا نعرہ نکلے اور تائیس ہمیشہ کیلئے میٹھی نیند سو جائے! اگر پفنوتوس
سچائی کی اس روشنی سے چوندھیا کر "خفاش" بن جائے!! گویا!

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ
رند از رہِ نیاز بدارالسلام رفت

کی ہو بہو تصویر آپ کی نظروں میں پھر جائے!

ترجمہ کے متعلق لگے ہاتھ چند لفظ اور سُن لیجئے۔ پھر یہ طول کلامی ختم ہے۔ ترجمہ کرنے کو سب کر لیا کرتے ہیں۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ بچوں کا کھیل نہیں۔ چیدہ چیدہ ہستیاں ہی اس سے برآ سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ترجمہ کی بعض صورتیں اصل تصنیف سے زیادہ مشکل مانی جاتی ہیں، کیونکہ تصنیف میں آزاد روی ہوتی ہے۔ جیسا جی چاہا جسطرح بن پڑا، خیال ادا کر دیا گیا۔ برخلاف اسکے ترجمہ میں ایک چیز سامنے ہوتی ہے جس سے ہٹنا تو درکنار اسکے سایہ سایہ آپ کو چلنا اور سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ مشکل اردو کی کم مائگی سے اور بڑھ جاتی ہے؛ جہاں دوسری رودار زبانوں کے ایسے مالا مال خیالات اور نت نئی ترکیبوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

جس سے غریب اُردو مانوس نہیں۔ ادھر ترجمہ کی خوبی یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنی ساری موہنی نفاست کیساتھ اور صفائی سے بھیس بدلکر گھل مل جائیں کہ پہچانی نہ جائیں، جو ظاہر ہے آسان کام نہیں۔ موسیوانا طول فرانس کے ساتھ یہ مشکل بہت بڑھجاتی ہے کیونکہ یہ اپنے انداز تحریر میں سہل الممتنع ہے! اور ہر وقت خیال کے نور میں ڈوبا ہوا۔ ان خوبیوں والے مصنف کی بال سے باریک اور بلور سے نازک تحریر کو اردو میں لانا بڑا خون جگر چیتا ہے۔ جناب مترجم نے یہ کڑی جھیلی ہے۔ ایک جگہ مصنف و مترجم یوں زلف و شانہ ہیں کہ تائیس نگر ڈگر بنی ہیں اور میاں نقشوتوس باوجود جگر سوزی زیادہ سے زیادہ جادو گر بنے ہوئے ہیں۔ تائیس اس شخص پر بھی لوٹ کا وہ منتر پھونکنا چاہتی ہے جسکے آگے اچھے اچھے سورماؤں کے گھٹنے ٹیک گئے ہیں! القصہ۔ کے اس خوبصورت اٹھان پر ذرا اُن دونوں خوش مزاج ادبی سادہ کاروں کی بہار اور کاروبار دیکھئے گا۔

تائیس کچھ شرما کر تین چار قدم پیچھے ہٹی اور پھر جلدی سے اپنی زرنگار مسہری کی پٹی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھی۔ حجرم کو بڑے انداز سے درست کیا اور بالکل خاموش آنکھیں نیچی کئے انتظار کرنے لگی۔ خوبصورت آنکھوں کی بڑی بڑی پلکوں کا سایہ رخساروں پر پڑتا تھا۔ گورے گورے برہنہ پاؤں زمین سے اونچے تھے۔ چہرہ پر شرماہٹ تھی، اور صورت سے معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی بھولا بچہ دریا کے کنارے بیٹھا ہو!

تائیس کی وجہ سے اسے خوش صفات مترجم کی ہیں اشکوں بھری کیفیت سے بھی پڑھئے گا ترجمہ ہے!!

سید وزیر حسن

ہم جناب حکیم برہم صاحب کے بہت بہت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمارے برادر مکرم قاضی تلمذ حسین صاحب کی صحت کی جانب توجہ فرمائی ہے خوشی کی بات کی ہے کہ بھوک کھولنے کی دوائیاں تجویز کی گئی ہیں جس کے باب میں خود قاضی صاحب سے زیادہ انکے احباب فکرمند پائے گئے ہیں حکیم صاحب اپنے معالجہ میں کامیاب ہوگئے تو ہمیں موقعہ ملے گا کہ حضرت جوش اور جناب ہمدردی کو مبارکباد دیں۔

(۳)

یا بیخودیِ شوق کا شکوہ نہ کیجیے
یا مجھ کو اس نگاہ سے دیکھا نہ کیجیے

ہاں، عشق کر کے عشق کا چرچا نہ کیجیے
یہ زندگی کا راز ہے، افشا نہ کیجیے

میں کون تھا کہ عشق نے رسوا کیا مجھے؟
بے مجھ سے نفیِ ہستیِ عنقا نہ کیجیے

کہتا نہیں میں دل کی تمنا نکالیے
لیکن مجھے اسیرِ تمنا نہ کیجیے

رنگِ بہارِ لالہ و گل ہے فریب کار
ذوقِ نظر کو نذرِ تماشا نہ کیجیے

ضامن! ہا دم سفر ہو گر اتباعِ حسن صبح
سامان اس سفر کا مہیا نہ کیجیے

(۴)

شرط ہی تابِ نظر چشمِ تماشا کے لئے
پردہ جز حسن نہیں جلوہ پیدا کیلئے

تپ پہ اٹھانے نہیں آتشِ گویا کے لئے
شمع سے لو نگا زباں عرضِ تمنا کیلئے

کام جس سے ہو اسی سے ہو، گلوں سے کیا کام
ہم چمن میں بھی گئے تو چمن آرا کیلئے

مجھ سے جب ہو نہ سکی بیخودیِ شوق بیاں
حیرت، آئینہ بنی حسن خودآرا کیلئے

قید ہوتی نہیں جن کی ہے فطرت آزاد
بیڑیاں موج بناتی رہے دریا کیلئے

حسن بیباک حجابوں میں کہیں چھپتا ہے
لاکھ منظر ہیں کھلے چشمِ تماشا کیلئے

کچھ غرض اور نہیں نالہ کشی سے ضامن!
مشغلہ چاہیے کوئی دلِ شیدا کے لئے

ضامن کنتوری

یادِ ایّام

مکرم بھائی۔۔ اولڈ بوائے کی دو کاپیاں ملیں ممنون۔ آپکا تقاضہ اور میری سرگذشت قصہ دراز ہے۔ برسوں گذر گئے۔ زمانہ ہو گیا۔

بسکہ یادم بہ غریبی وطن از یادم رفت　　　بسکہ خاموش نشستم سخن از یادم رفت

اس سے پہلے کہ میرا خیال مصروف کار گراں ہو جائے، اس قصہ کو تمام اپنی تعلیم اور کالج کی زندگی کو ختم کروں گا بطوالت مضمون سے اکتا نہ جانا۔ سچ تو یہ ہے کہ معمولی سی سرگذشت میں بھی ایک نہ ایک سبق آموز نکتہ ہوتا ہے لیکن جس شخص کو مشکلات کا ہمیشہ سامنا رہا ہو، اسکی سرگذشت زیادہ دلچسپ ہوگی۔ میری سرگذشت دلچسپ نہیں تو کم از کم آپ کے لئے معلومات اور میرے چھوٹے بھائیوں کیلئے سبق آموز ہوگی۔

مشیت ایزدی کا شکر گذار ہوں کہ مجھے ایک اچھے گھرانے میں پیدا کیا، اور ایک قدیم خاندان اور اسکے بزرگوں کے اچھے کارناموں کی تاریخ کا ایک ورق میرے ہاتھ میں دیا۔ مسلمان پیدا کیا اور مسلمانوں میں افغان پیدا کیا، اور افغانوں میں درّانی پیدا کیا، اور درّانیوں میں ایسے گھر میں پیدا کیا جس کے کارناموں کا ورق تاریخ کا ایک ورق ہے۔ اچھے معتقد باپ کے گھر پیدا کیا، جو اپنے زمانہ کا چیدہ شخص تھا تعلیم یافتہ، اہل دل، اہل حال، مسلمان اور معتقد شخص تھا والدہ بھی تعلیم یافتہ غریب پرور مسکین پرست اور خدا دوست تھیں۔ میری پیدائش فاضلکا (پنجاب) کی ہے۔ میں اپنے پانچ بھائیوں میں سے تیسرا ہوں۔

ابتدائی تعلیم مسجد کے مکتب سے شروع ہوئی۔ قرآن شریف ختم کرنے کے بعد گلستان بوستان اور دوسری کتب درسیہ کے اختتام کے بعد مدرسہ گجرات میں تیسری جماعت میں شامل ہوا۔ ایام طالب علمی میں پنجاب کے مختلف شہروں، فاضلکا، فیروزپور، انبالہ، جالندھر، لودھیانہ میں رہا۔ تعلیم کی ابتدا گو قصبہ گجرات ہی میں ہوئی۔ چھوٹی جماعتوں میں گورنمنٹ اسکول میں رہا، اور مڈل کے بعد مشن اسکول میں تعلیم پائی۔ امتحان مڈل میں اپنے ضلع میں اوّل تھا، امتحان انٹرنس میں بھی اپنے ضلع میں اول تھا۔ ریاضی اور سائنس میرے دلچسپ مضامین تھے۔ انٹرنس کی ہر دو جماعتوں میں مسٹر [illegible] صاحب کا شاگرد تھا۔ وہ پادری تھے۔ انکی فرشتہ خصلت اور سیرت نے جو اثر میری طبیعت پر کیا اس نے میری آئندہ زندگی کا راستہ روشن کر دیا۔ انٹرنس کے بعد والد نے مجھے علیگڈھ کالج کو روانہ کر دیا۔ والد مرحوم سردار یار محمد خاں صاحب، سرسیّد کے دوستوں میں سے تھے اگرچہ انکو سرسیّد کے دینی عقائد سے کچھ اختلاف رہا۔ سرسید سے انکی پہلی ملاقات جالندھر میں ہوئی جہاں وہ [illegible] تھے۔

بتاریخ ۱۰ جون [illegible] دن کے ۱۱ بجے علیگڑھ پہنچا۔ میری جان پہچان کے کچھ لوگ وہاں موجود تھے لیکن چونکہ میاں احسان الحق صاحب کے والد بزرگوار سے والد مرحوم کے مراسم دوستانہ تھے، اور وہ خود میرے بھی ہمجولی دوست تھے، سیدھا ان کے پاس مشرقی پکی بارک کے [illegible] کمرے پر پہنچا، جہاں میاں احسان الحق اور چودھری خوشی محمد صاحب رہا کرتے تھے۔ چودھری خوشی محمد خاں صاحب بھی اہل گجرات اور میرے بزرگوں کے دوست ہونے کے باعث شناسا تھے۔ مجھے نئی جگہ میں آنے اور کالج کی نئی زندگی کے بارے میں چنداں تشویش نہ تھی۔

کالج میں چودھری خوشی محمد خاں صاحب کے علاوہ کافی تعداد پنجابی طلباء کی تھی۔ نیاز احمد صاحب (وکیل سہارنپور) مولوی نذیر احمد (جج کشمیر) دلی داد خاں (وکیل جالندھر) شیخ عبداللہ صاحب (وکیل علیگڈھ) مولوی ظفر علیخاں صاحب (لاہور) سپرنٹنڈنٹ بالمحمد خانصاحب (وکیل کمیلپور) اور بہت سے

دیگر طلبا کا اچھا مجمع تھا۔ کمال الدین (بمبئی) بھی تھے۔ قطب الدین (حیدرآباد) بھی تھے۔ قطب الدین بیگ سید زین الدین، شوکت علی مولانا بھی تھے۔ یہ سب مجھسے اوپر کی جماعت میں تھے۔ سال ۱۸۹۲ء میں اہل پنجاب کا ایک دریا امنڈ آیا تھا۔ اس سے پہلے پنجاب سے کبھی اتنے طلبا شامل کالج نہ ہوے تھے۔ میرے خیال میں یہی سال کالج کی ترقی کے آغاز کا تھا۔ محمد عبداللہ مرحوم کرکٹ کپتان (جن کے ماتحت کالج کرکٹ نے نام اور شہرت حاصل کی) اور ہم دونوں ایک ہی جماعت میں تھے۔ وہ بھی ۱۸۹۲ء میں شامل کالج ہوے۔ عبدالمجید خانصاحب (کشمیر) بھی میرے ساتھ ہی آئے۔ چونکہ والد بہت عرصہ جالندہر میں رہے تھے، اسلئے اہل جالندہر سے جان پہچان اور خلوص ومحبت بھی زیادہ تھی۔ محمد عبداللہ مرحوم۔ عبدالمجید خاں۔ شہاب الدین وغیرہ اہل جالندہر میرے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ مولوی نذیر احمد صاحب شیخ عبداللہ صاحب، ظفر علی خاں، ولی داد خاں، نور محمد خاں اور بہت سے دیگر طلبا ہم وطن ہونے کے باعث اکثر یکجا رہتے تھے۔ شیخ عبداللہ صاحب سے بھی ملاقات ہوی۔ انکی حالت اور روش سے مجھے انسے خلوص تھا اور ہم دونوں آپس میں جدا نہ ہونے والے دوست تھے۔

خوشی محمد خاں صاحب دوسرے دن مجھے بک صاحب کے پاس لیگئے۔ میرا لباس اسوقت پنجابی تھا، یعنے ڈھیلا پاجامہ سر پر پگڑ، اور پنجابی کوٹ۔ بک صاحب مسکرائے، کوٹ کو سامنے سے پکڑ کر خوب ہلایا اور چند نصائح کے بعد رخصت کیا۔ اسکے بعد محمد خاں صاحب سپرنٹنڈنٹ ڈائنگ ہال سے جو اسوقت بنگلہ میں رہتے تھے ملا۔ واپسی پر عصر کو چودہری صاحب نے شوکت علی صاحب سے تعارف کرایا۔ مجھے ہمیشہ اسکی تمنا رہے گی کہ پھر ۱۸۹۲ء کا زمانہ ہو، پھر میں کالج کو داخلہ کے لئے جاؤں، پھر مجھے شوکت علیصاحب سے انٹروڈیوس کیا جائے، اور پھر دوبارہ میں انکی وہ سچی نظر دیکھوں اور ہمدردانہ شفقت کے چست فقرے اور پھبتیاں سن کر آدمی بن جاؤں۔

شوکت علیصاحب نے فوراً میرا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے چلے۔ کالج میں سب کمروں میں جاتے، اور انوکھے اور دلچسپ طریقوں پر مجھے ہر جگہ انٹروڈیوس کرتے آگے چلے جاتے، حتیٰ کہ خواجہ کمال الدین صاحب سے ملاقات ہوی۔ کمال الدین صاحب (ہائے وہ زمانہ، اب کمال الدین وہ نہونگے، نہ وہ شوخی دل لگی

ہوگی، نہ وہ زندہ دلی) میں ایک خاص مادہ تھا جہاں کہیں نیا طالب علم ان کی نظر پڑا کہ انھوں نے فوراً ہی تاڑ کر اسکے واسطے نیا نام تجویز کر دیا۔ انکا تجویز کردہ نام ایسا موزوں ہوتا تھا کہ (بقول شوکت صاحب) فوراً چپکجاتا تھا، کسی کو بوم، کسی کو بوتل، کسی کو گیوڈا، کسی کو تمبا کو، کسی کو بلبلیک وغیرہ ایسے نام تجویز کرتے کہ فوراً مشہور ہو کر اٹل ہوجاتے تھے۔ کمال الدین صاحب نے مجھے دیکھکر سیکڑوں پھبتیاں اوڑائیں، سیکڑوں طرح بُرا بھلا کہا، غرضکہ اچھی طرح دل ٹھنڈا کر کے فرمانے لگے کہ جاؤ تم "پاشا" ہوگئے۔ شوکت صاحب فرمانے لگے کہ چلو تبسمہٗ ل گیا، مبارک ہو! آگے چلو۔ پکی بارک، ڈائننگ ہال، سب جگہ انھوں نے چکر لگایا حتیٰ کہ راہ میں کوئی بہشتی یا بھنگی بھی ملجاتا تو اس سے بھی انٹروڈیوس کراتے۔ آخرش ایک لمبے چکر کے بعد مجھے کمرے پر چھوڑ گئے، اور فرمائش کر گئے کہ کرکٹ کے لئے آنا۔ شوکت صاحب اسوقت کرکٹ کپتان تھے، اور سید زین الدین فٹ بال کپتان۔

کالج میں اسوقت اگرچہ جمنیسٹک کے بارس (ستون) وغیرہ بھی پکی بارک کے سامنے بڑے پیپل کے نیچے لگے ہوئے تھے (اب تو وہ دلکش پیپل بھی نہیں ہے) یا کم کم ٹینس ہوتا تھا، کرکٹ اور فٹبال کے سوا دوسرا کوئی کھیل نہ تھا۔ عصر کو حسب الحکم شوکت صاحب میں کرکٹ گراونڈ پر پہنچا۔ وہاں بھائی سرفراز خاں مرحوم، چچا ضیاء اللہ مرحوم، اور منی وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ شوکت صاحب نے پہلے ہی دن زور دیا اور کہا کہ کھیل کی پتلون پہنکر آیا کرو۔ میں اسوقت تک کھلاڑی نہ تھا، اور نہ کھلنڈروں میں شامل تھا۔ مجھے کتاب کے سوا کوئی دوسری دلچسپی نہ تھی۔ میری صحت اسقدر کمزور تھی کہ تھوڑا سا چلکر بھی ہانپ جاتا۔ شاید شوکت صاحب نے اس کو محسوس کر لیا تھا۔ کھیلائیں میں سب جگہ غیر حاضر تھا لیکن بورڈنگ میں ہمیشہ شوکت صاحب کا رفیق تھا۔ اکثر بورڈنگ میں میں اور محمد عبداللہ مرحوم شوکت صاحب کے ساتھ ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی ایک خوق العادۃ صحبت سے میری بہتری کے درپے تھے۔ قدم قدم پر ٹوکتے اور پھبتی کے پیرائے میں نصیحت کر جاتے۔ ایسی نصیحت مجھے یاد بھی رہتی۔ کم کم شہاب الدین صاحب اور دیگر دوستوں کے اصرار پر فٹ بال جانا شروع کیا، اور دواقفیت کا دائرہ بڑھنا شروع ہوا۔ اسلام محمد خان صاحب مولانا

سے ملاقات ہوئی اور بہت جلد انکے خاندان کے دوسرے افراد جمیل احمد صاحب، محمد احمد صاحب، اسلام حامد صاحب اور اسلام احمد صاحب سے ملاقات کا موقع ملا۔ مولانا سے مراسم نہایت گہرے برادرانہ تھے، اور محبت ابتک قائم ہے۔ سید عبدالحفیظ صاحب حیدرآباد ہی سے وہاں ملاقات ہوئی اور رفاقت اسقدر رہی کہ آخر تک ہم دونوں سچے بھائیوں کی طرح ہر میدان میں قدم زن رہے۔ سید صاحب اور رشید صاحب میرے پٹھان بھائی اسوقت چھوٹے تھے۔ اگرچہ کرکٹ میں سید صاحب بہت شوق سے جاتے اور بعد میں کپتان بھی ہوئے عظمت اللہ خاں صاحب کپتان (آگرہ حیدرآباد دکن) شفقت حنا علی حسن صاحب (کرکٹ کپتان) سجاد حیدر صاحب، ابوالحسن صاحب میرٹھ، محمد حامد صاحب (لاڑد) خواجہ غلام الثقلین صاحب، وغلام الثقلین صاحب، محمد حیات صاحب (گوالیار) سب سے کم کم ملاقات ہونے پر روابط بڑھتے گئے۔

میرے ہم جماعتوں کے گروہ میں اسلام محمد خاں صاحب مرحوم مشتہر ہشاز صاحب (لکھنؤ) محمد اظہر حسن صاحب (فتح پور ہسوہ) عبدالمجید خاں صاحب، ضیاء الحق صاحب (سہارنپور) بھائی جی ظفر علی خاں (حال مالیر کوٹلہ) سید عبداللہ خاں بہادر (مالیر کوٹلہ) علی اکبر حسن علی "بندر" کراچی بندر، محمد امین صاحب فقیہہ (بمبئی) کا مجمع ہر شام وسحر ایک نہ ایک کے کمرے میں رہتا تھا۔ خان بہادر سید عبداللہ صاحب کے بزرگوں سے میرے والد مرحوم کے برادرانہ مراسم تھے۔ ہم ایک ساتھ علیگڈھ گئے، پہلے ایک ہی کمرے میں رہے اور آخر میں بنگلہ میں ایک ایک کمرہ لیکر رہنے لگے۔ محمد امین صاحب فقیہہ میری کالج کی زندگی کے دوسرے سال مجھسے ملے۔ ایک روز عصر کے قریب میں کچی بارک میں ڈائننگ ہال کے پاس کے کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ گیٹ کی طرف سے ایک خوشرو جوان ایرانی چہرہ خوش سیرت سرعت سے چلا آرہا ہے اور صندوق سر پر رکھے ایک قلی اس کے نقش قدم پر ساتھ ساتھ ہے۔ مجھسے انھوں نے آتے ہی سوال کیا کہ "شوکت علی صاحب کہاں ملیں گے؟" میں نے کہا کہ "کوئی خاص کام ہو تو مجھے فرمادیں ورنہ اسوقت تو وہ کمیاب اور لاپتہ ہونگے"۔ فرمانے لگے کہ "میرا نام محمد امین ہے، میں بمبئی سے آرہا ہوں۔ کالج میں داخل ہونگا، بمبئی سے شوکت علی صاحب کے ایک دوست کا تعارفی خط میرے پاس ہے کہ میرے قیام وغیرہ کا انتظام

کرو ںگا۔ اسپر میں نے اُنسے کہا کہ قیام کا خیال ہے اور دل ساتھ ہے تو آئیے میرے کمرے میں اور یہاں آرام سے رہئے۔ چند ہی روز میں محمد امین صاحب ہم سے ایسے مل جل گئے کہ انکا چھوڑنا ناگوار تھا۔ بعد کے چھ سال میں میں اور وہ پکی بارک سے نکل کر دو سگے بھائیوں کی طرح بنگلہ کے ایک کمرے میں آخر وقت تک رہے۔ محمد امین صاحب کے اچھے سلوک کا ایک بار گراں میری گردن پر ہے۔ اور اسیطرح اور بیشمار دوستونکا یہ باری باری سے ادا کرنے کے لئے "اولڈ بوائے" کے صفحات میں آپکو تکلیف دونگا۔

مجھے ڈر ہے کہ داستان لمبی ہوتی جاتی ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ میری چوبیس سال کی داستاں بہت لمبی ہے۔ آپ نے ہمت دلائی کہ سب ہی بیان کروں لیکن میں اختصار کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ قرضہ جلدی ادا ہو۔ (باقی)

سیلانی

سر سید کے چشم و چراغ نواب مسعود جنگ قبل از وقت حیدر آباد کو خدا حافظ کہنے والے اور اپنے بہت سے برادران وطن سے جدا ہونے والے ہیں۔ مدت ملازمت تو اکتوبر ۲۸ء میں ختم ہوگی مگر ہمارے بھائی کی خواہش پر حضور پر نور نے آئندہ جولائی سے ہی بعطائے وظیفہ عزیمت سفر یورپ کی اجازت مرحمت فرمادی ہے۔ اس سفر کی بڑی غرض یہ ہے کہ مسعود جنگ اپنے دونوں بچوں کی آئندہ تعلیم کا انتظام کر سکیں۔ مسعود جنگ بہادر کی ذات سے جو فوائد سر رشتہ تعلیمات کو پہنچے ہیں انکی تفصیل تو سر رشتہ مذکور کی رپورٹوں میں موجود ہے لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ حیدر آباد کی سوسائٹی کی رونق ایک بڑی حد تک ان کی ذات سے ہے۔ وہ ڈرائنگ روم کی بولتی ہوئی تیلی ہیں۔ مسٹر راس مسعود کی صحبت میں کوئی دل کا مارا پہنچ جائے، تو اُن کے کمرے سے نکلتے نکلتے سارا مرض کافور! اور اسے مسٹر سروجنی نائڈو کے میاں مسٹر نائڈو کے پاس علاج کی غرض سے جانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اب سنتے ہیں کہ نواب مسعود جنگ ہماری یونیورسٹی کے انتظام کی ذمہ داری اپنے سر لینے والے ہیں! ایسا ہو گیا تو طلبہ میں زندہ دلی کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔

ہمارا کالج

گزشتہ اولڈ بوائز ڈنر کے حالات تو ہم نے نو نمبر ہی میں درج کر دیے تھے، اور جناب سکرٹری صاحب کی رپورٹ کو اپنے دسمبر نمبر کا سرنامہ بنایا تھا۔ میٹنگ کے ضروری رزولیوشن رہ گئے تھے، وہ بھی گزشتہ نمبر ہی میں درج ہو جاتے۔ مگر اللہ کو ایسا ہی منظور تھا کہ یہ باسی کڑھی بن کر ہمارے بھائیوں کی میز تک پہنچیں۔ ان رزولیوشنوں میں سے پہلا "وقف تعلیم اولاد" پر تھا اور دوسرا "اولڈ بوائز لاج" کے مکمل قبضہ پر، ان دونوں رزولیوشنوں کی تحریک و تائید پروفیسر خلیل احمد مراد صاحب اور خان بہادر مرزا قسیم بیگ چغتائی صاحب نے فرمائی تھی۔ آخری رزولیوشن "مسلم خواتین میں عربی و انگریزی تعلیم کی توسیع" پر تھا، اور یہ خود ہمارے سکرٹری صاحب نے پیش فرمایا تھا۔ پہلے رزولیوشن کے باب میں یہ عرض کرنا خلاف موقع نہ ہوگا کہ اولاد کی تعلیم لڑکا ہو یا لڑکی، ہمارے اوپر یکساں فرض ہے، اور بقدر طاقت ہم کو اس سے باز نہ آنا چاہیے۔ لیکن یہ امر کہاں تک قرین صواب ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے روپیہ، اپنی لڑکیوں کے وقت، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے دماغ کو تعلیم کے موجودہ غیر ضروری نظام کے اتباع میں صرف کر دیں۔ یہ باتیں سوچنے سمجھنے اور پھر عمل کرنے کی ہیں۔ زنانہ تعلیم سے متعلق ہمارا اپنا نظام ہونا چاہیے۔ "اولڈ بوائز لاج" کے مکمل قبضہ سے متعلق ہمارا ایک مختصر سا وفد جس میں مسٹر محمد یعقوب، مسٹر ظفر عمر، مسٹر عبد العزیز، اور مسٹر نیاز محمد خاں شریک تھے، نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ان بھائیوں کی سعی مشکور ہوئی، اور نواب صاحب معظم کی توجہ سے "لاج" اب ہمارا ہو چکا ہے۔ آخری مگر ضروری تحریک پر قال و قیل تو بہت ہوئی، مگر نتیجہ ہیچ۔ سوال یہ تھا کہ ایک معقول وظیفہ پر ہماری لڑکیوں میں سے ایک کو دو سال کے لئے

مصروانہ کیا جایا کرے، تاکہ تعلیم و تربیت سے بہرہ اندوز ہونے کے سوا ایک اسلامی ملک کی معاشرت کا بھی انھیں ذاتی تجربہ ہوتا رہے۔ اسپر ایک جانب مسٹر اختر عادل، سید حامد حسین خاں بہادر، اور مسٹر اے۔ ایم قریشی کے درمیان "پردہ" کا سوال زیر بحث رہا، اور دوسری طرف خان بہادر مرزا قسیم بیگ چغتائی، اور مسٹر عزیز پوری میں "مردانہ و زنانہ تعلیم" کا مسئلہ زیر بحث آگیا۔ اور اصل رزولیوشن "ہمالسنت کہ بود" پر ختم ہوگیا۔ ہمیں امید ہے کہ سال آئندہ یہ تحریک مکرر پیش کی جائے گی۔ اس موقعہ پر ۲۸-۱۹۲۷ء کا موازنہ (بجٹ) بھی شام کے اجلاس میں پیش ہوکر منظور فرمایا گیا۔

ایک زمانہ میں کالج اور اسکول دو ہی ہمارے تعلیمی ادارے تھے۔ اب یونیورسٹی اور اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ مگر ان میں قدیم زندہ دلی کہاں تک موجود رہے ہمیں اس کا تجربہ نہیں۔ طلبہ کی اتنی بڑی آبادی سے ہمارے کانوں تک عزیزی مسٹر سید علی جعفری (متعلم سینیر بی۔ اے) کے لہجہ میں یہ صدا آئی ہے کہ "خط ملا، دونوں رسالے وصول ہوئے۔ لکھائی چھپائی کے علاوہ مضامین بھی نہایت معقول و پسندیدہ تھے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپکا یہ پرچہ مقبول ہو اور تمام ہندوستان کے اولڈبوائز میں اسکی ہمیشہ مانگ رہے"۔ مسٹر سید علی، حکیم کے فرزند ہیں، اسلئے ہمیں امید ہے کہ وہ دعا کی بجائے دوا بھیجیں گے۔ یہ دوا ہمارے ریڈنگ روموں اور ایسوسی ایشنوں میں بکتی ہے جہاں پہلے اولڈبوائے کی ہر جگہ مانگ تھی۔

اولڈ بوائز

۱۔ برادرم قاضی امیر الدین احمد صاحب دیوان ریاست بجاور کی نظر سے "اولڈ بوائے"
کے ابتدائی دو نمبر گذرے، تو انھوں نے دستِ محبت ہماری جانب بڑھایا اور "ڈائرکٹری" کے لئے بھی چند سطر میں
لکھنے کی تکلیف گوارہ فرمائی۔ ہم بہت بہت ممنون ہوتے اگر قاضی صاحب ہمارے اس سوال کو بھی حل فرمادیتے،
جو تغیریچی مشاغل سے متعلق درج رسالہ ہے۔ اسیطرح فرزند کا نام بھی ہمیں مطلوب ہے (اگرچہ خردسال ہی کیوں نہو)
خط مورخہ ۲۸ر دسمبر ۲۷ء درج ذیل ہے۔

آپ کے ۲۲ ماہ حال کے یادنامہ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی عنایت تھی کہ مجھ کو یاد رکھا
اور اپنے رسالہ میں میرے تقرر کا ذکر کیا۔ ذریعہ منی آرڈر مبلغ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اولڈ بوائز کے اس رسالہ کے
سال تمام کے چندہ کے روانہ کئے جاتے ہیں۔ یہ امر قابل مسرت ہے کہ آپکو الحاظ سے اتفاقیہ بیچ ہے۔
"ڈائرکٹری" جس کی اشاعت کی تیاری علیگڈھیوں کے فائدہ کے مدنظر آپ کر رہے ہیں۔ اسمیں
یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں"۔

۱۔ قاضی امیر الدین احمد فرزند خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب سی۔ آئی۔ ای
او بی۔ ای۔ آئی۔ ایس۔ اور رئیس قصبہ بسواں ضلع سیتاپور (اودھ) ۲۸ر جنوری ۱۸۹۶ء کو بارہ بجے دن پیدا ہوا۔
۲۔ علیگڈھ میں مسٹر الیف کوپر کے ساتھ رہکر ۱۹۰۱ء میں تعلیم کی ابتدا کی اور ۱۹۰۳ء میں مدرسۃ العلوم علیگڈھ
میں شرکت کرکے ۱۹۱۴ء تک وہاں رہا۔ اسکے بعد ۱۹۱۷ء میں آگرہ کالج سے بی اے پاس کیا (اور سال مذکور
ہی میں) ملازمت مل گئی۔

۳ سنہ ۱۹۱۶ء میں شادی ہوئی۔ اب ایک لڑکا اور ایک لڑکی موجود ہے۔

۴۔ ہمارے مخدوم و مکرم اور ہمارے کالج کی انتظامی جماعت کے سابق اسٹنٹ سکریٹری لوی ابوالحسن صاحب صدر مہتمم تعلیمات (انسپکٹر آف اسکولس) قسمت گورکھپور ارقام فرماتے ہیں:

"سال نو آپ کو اور آپکے رسالہ کو مبارک ہو۔ آمین! میں خوشی سے رسالہ "اولڈبوائے" کی خریداری منظور کرتا ہوں۔ مہربانی فرماکر اگلا پرچہ سال بھر کی چندہ کیلئے ویلیو پی ایبل روانہ فرمائیے بہتر ہوگا کہ پرچہ میرے لڑکے حسن عبداللہ بی اے کے نام سے جاری فرمایا جائے، جو خود بھی اولڈبوائے ہے۔ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔"

مولوی صاحب کی توجہ ہمارے لئے قابل شکرگزاری اور "اولڈبوائے" کے میدان کو وسیع ترکرنے کے لئے دوسرے بھائیوں کی توجہ کے لائق ہے ہم خوش ہیں کہ ایک نام کے دو خریدار ہمارے رجسٹر پر آگئے! ایک تو ہمارے حیدرآباد ہی میں مسٹر عبداللہ حسن، اور دوسرے مسٹر حسن عبداللہ،

۳۔ برادر عزیز کپتان نظیر الاسلام صاحب اپنے محبت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

گرامی نامہ کا شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ کا وی پی غالباً میرے غیاب میں آئیگا، کیونکہ میں کل صبح پندرہ روز کیواسطے کیمپ کو جارہا ہوں۔ اسکے وصول کرلینے کیلئے گھر کے لوگوں سے کہدیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فوجی اولڈبوائز کی فہرست واپسی پر روانہ خدمت کروں گا۔"

ہم اپنے برادر عزیز کی توجہ فرمائی کے شکرگزار ہیں نظیر بیگم کی عنایت سے رقم ہمیں وصول ہوگئی، فوجی اولڈبوائز کی فہرست تیار کرتے وقت وہ اس امر کو ملحوظ رکھیں کہ ہماری برادری میں سے نواب نذیر جنگ بہادر، نواب صمد یار جنگ بہادر سابق و حال معتمد (سکرٹری) فوج سرکار آصفیہ کے سوا، کرنل مرزا قادر بیگ، کرنل عظمت اللہ، میجر عبدالجبار، میجر مرزا جیلانی بیگ، میجر عبدالصمد، میجر یاست علی مرزا، کپتان محمود حسین خاں، کپتان میاں محمد بشیر، لفٹننٹ سید محمد حسین، لفٹننٹ امیر احمد، اور سب لفٹننٹ قیصر مرزا بیگ "اولڈبوائے" کی قدر افزائی قبل ازقبل فرماچکے ہیں۔ معتمدی فوج میں بھی ہمارے بھائی مسٹر معزالدین بی اے "اولڈبوائے" کو خرید چکے ہیں۔ فوج باقاعدہ کے غیر اولڈبوائے حضرات میں سے صرف کپتان محمد اعجاز علی صاحب شہرت

اس رسالہ کے خریدار ہیں۔ فوج باقاعدہ میں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری برادری زیادہ نہیں ہے اس جماعت سے برادرم کپتان مرزا محسن بیگ اولڈبوائے کے قدرداں ہیں اور غیر اولڈبوائز میں بھی جمعدار ولی داد خان صاحب کے سوا میدان صاف ہے صیغہ طبابت فوج میں سے کپتان اشرف الحق اولڈبوائے کے قدرداں ہیں۔

۴ ہماری بھائیوں میں سے مسٹر محمد حنیف تحصیلدار اور مسٹر سید محمد موسےٰ کاظم تحصیلدار کے تبادلوں کی اطلاع ہمارے پاس آئی ہے اول الذکر تحصیل بروالہ سے حضور تحصیل اناؤ میں تشریف لے آئے ہیں اور آخرالذکر تحصیل مچھلی شہر سے تحصیل (بڈھانا) ضلع مظفرنگر کو تشریف لیگئے ہیں۔ کیا ہمارے یہ دونوں بھائی دوسرے بہت سے بھائیوں کیطرح ڈائرکٹری کیلئے اپنے حالات روانہ فرمادیں گے؟

۵ ریاست بہاولپور میں انتظامی جماعت نے حکومت پنجاب سے برادر عزیز مسٹر میاں محمد خاں بی۔ ایس۔ سی (گلاسگو) ایگزیکٹیو انجنیر کے خدمات حاصل فرماکر اپنے سررشتہ آبپاشی میں ایک مفید اضافہ فرمایا ہے۔ ہمارے بھائی کو عباسیہ ڈویژن کی آبپاشی کا کام سپرد ہوا ہے جہاں بہت سے جدید کاموں کا آغاز ہوا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ ریاست بہاولپور کی آبپاشی کی تاریخ کے ساتھ ہماری ایک بھائی کا نام ابدالآباد تک شریک رہیگا۔

۶ نواب عمادالملک مرحوم کا نام ہمارے بہت سے کاموں کے ساتھ یادگار رہیگا۔ اس "ہمارے" سے مراد ہمارے قومی اور ذاتی دونوں کاموں سے ہے۔ مرحوم کے دو بڑے فرزند نواب عابد نواز جنگ بہادر اور مولوی سید ہاشم صاحب بلگرامی مرحوم قرون اولیٰ میں ہماری برادری میں شرکت کی عزت حاصل کرچکے ہیں نواب صاحب مرحوم کے فرزند اصغر نواب مہدی یار جنگ بہادر کی تعلیم و تعلم سے متعلق ہمارے معلومات بالکل محدود ہیں۔ البتہ ان سے بڑے بھائی نواب عقیل جنگ بہادر کے باب میں ہم یقین کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انکی تعلیم حیدرآباد (اور نظام کالج) سے باہر کبھی نہیں ہوئی اور زیادہ تر اپنے والد ماجد کے آغوش شفقت میں تربیت حاصل فرماتے رہے انکی بڑی صاحبزادی کی شادی مدت ہوئی مولوی سید محمد مہدی صاحب معتمد باب حکومت سے ہوئی تھی اور اب ۱۳ رجب المرجب سال رواں کو انکی دوسری صاحبزادی کی شادی کے مراسم کی تکمیل ہماری برادری کے ایک فرد مسٹر سید محمد جواد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مہتمم تعلیمات ضلع محبوب نگر سے ہوئی ہے۔ مراسم سے

ہمارے دور افتادہ بھائی یہ خیال نہ کریں کہ اس شادی میں بھی اُن غیر ضروری رسموں کو برقرار رکھا گیا تھا جواب سے پہلے ہمارے ملک کے گوشہ گوشہ میں جاری تھے۔ ان فضولیات سے تو نواب عقیل جنگ بہادر بہت دور ہیں۔ عقد، ضروری جہیز، ولیمہ کا "اٹ ہوم" اور بس! "اٹ ہوم" میں حیدرآباد کے طبقۂ اعلیٰ سے لیکر ہر طبقہ و درجہ کے ضروری احباب شریک تھے۔ ہم ایک جانب نواب صاحب کو اس فرض سے سبکدوش ہونے پر ہدیہ مبارکباد بھیجتے ہیں اور دوسری طرف اپنے بھائی مسٹر سید محمد جواد کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ ہاں! اس موقعہ پر ہم محل مولوی سید امیر حسن صاحب کو مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے، جن کے دستِ شفقت نے دُلہن کی زندگی کے سنوارنے میں ایک مدت تک کام کیا ہے۔

۷۔ برادر عزیز مسٹر حضور عالم بدایونی "اولڈبوائے" کو انگلستان کے پتہ پر جاری کرنے کی فرمایش کر کے تحریر فرماتے ہیں۔

> میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۲ء تک کالج میں رہا۔ بی۔ اے میں ناکام ہو کر تعلیم ختم کردی۔ ۱۹۲۳ء کانپور میں تجارتی اور صنعتی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء میں اس فرم (یعنی ایشیاٹک لیدر کمپنی) کی ابتدا کی۔ اب گورنمنٹ کی طرف سے (Leather works) کی تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ جارہا ہوں"۔

ہمارے بھائی نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ برادران کانپور کی فہرست اور جملہ حالات سید احمد حسن صاحب تاجر چرم طلاق محل کانپور سے طلب کئے جائیں۔ ہم اپنے برادر عزیز کو خدا حافظ کہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انکا یہ سفر کامیاب ہو۔

۸۔ یہیں سیلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی، اور یقیناً ہماری برادری کے بہت سے احباب اس اطلاع سے مسرور ہونگے کہ مسٹر محمد عثمان وایس پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج کو اب ترقی کیساتھ یوروپین گریڈ میں لے لیا گیا ہے۔ ہمارے ناظرین حیرت فرمائیں گے ایک نیٹو گوروں میں کیسے مِلگیا، مگر یہاں رنگین چہرہ کا نہیں، بلکہ اچھے دل و دماغ کا سوال ہے۔ مسٹر عثمان اپنے فٹ بال کی بدولت نہیں بلکہ اور بہت سے کھیلوں کے باعث اپنے زمانہ میں مقبول و محبوب رہے، اور کھیلتے کودتے بی۔ اے بھی علیگڈھ ہی سے کرلیا۔ ولایت کی سند کی شرط تھی، وہ بھی تعلیمات کی ملازمت کے زمانہ میں لے آئے۔ ترقی کی خوشی میں احباب کی دعوت اور سہ منی نیاز کی تھی، جس میں احباب کے دل آئے، اور کھاپی کر چل دیئے۔ ایسی نیاز خدا کرے ہمارے بھائی بار بار کرتے رہیں۔

۹۔ برادرِ مکرم مسٹر مرزا محمد بہادر کے فرزند مسٹر یوسف مرزا (جو خود بھی ہماری کالج کے فرزند ہیں) انگلستان کی تعلیم سے فارغ ہوکر اور مکینیکل انجنیری کی اعلیٰ سند لیکر وطن واپس آگئے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی دارالضرب سرکار آصفیہ کے تعلیمی ادارہ میں کام بھی شروع کر دیا ہے۔ "اولڈبوائے" کے دورِ اوّل میں اپنی تازہ مسافر کے والد ماجد کی خاطر ہمیں کبھی کبھی ماریسن کورٹ جاکر انکی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی مسٹر یوسف کو ولایت کی ہوا کھانیکے بعد بھی وہ زمانہ یاد ہے اور اب ہماری اس فرض شناسی کا معاوضہ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے بچوں میں سے سید علی اصغر کو اپنے ڈھب کا پاکر اُسے لہار بنانے کی فکر کی ہے اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ نوخیز برادران کالج کی معلومات کی خاطر وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو "اولڈبوائے" کیلئے قلمبند کر دیں گے۔ ہم مرزا محمد بہادر صاحب کو اس فرض سے سبکدوش ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ناظرینِ رسالہ اطمینان رکھیں کہ یہ بھائی ان کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔

۱۰۔ غرہ ماہ رجب اعلیٰحضرت حضور نظام کا یوم سالگرہ ہے اور اس پورے مہینہ میں متوسلین دولت خوشیاں منایا کرتے ہیں۔ اس خوشی میں عمائد ملک کو اعزاز و خطابات سے سرفرازی عطا فرمائی جاتی ہے۔ اِس مرتبہ بارگاہ خسروی سے آغا محمد علی خاں صاحب، مرزا بشیر بیگ صاحب، مولوی شوق حسین خاں صاحب اور سید نثار احمد صاحب کو یہ عزت نصیب ہوئی اور یہ حضرات "یار جنگ" کے خطاب کے مستحق قرار پائے۔ آخرالذکر تین صاحبان ہماری کالج کے فرزند ہیں۔ ہم ان سب کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ ادبی ذوق رکھنے والے بھائی کہتے ہیں کہ مولوی شوق حسین خانصاحب کے نام پر خطاب خوب چپکا۔ کہ "شوق" کو "جنگ" کے ساتھ "یار" مل گیا۔ تلنگی بھائیوں کو اچار کھلانے کی عادت ہے اور اس خوشی کے موقعہ پر املی کے اچار کا تقاضہ کرکے ہمارا ناطقہ تنگ کر رہے ہیں۔ شائد انھیں اس کی خبر نہیں کہ برادر مکرم مولوی عبدالحق صاحب نے اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور کہتے ہیں کہ اس خطاب کے اعزاز میں "ہاشمی منزل" پر ایک مختصر سی دعوت کا اعلان فرما دیا۔ دعوت میں ایک آدھ صدرالمہام دو ایک معتمد اور تین چار ناظم صاحبان کے سوا ضرورت کے تقریباً تمام احباب شریک تھے۔ خود مولوی صاحب کو بھی تین سو روپیہ ماہانہ کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے اور سنتے ہیں کہ اس خوشی میں صرف ڈاکٹر...... یار جنگ بہادر کو سنترو کی دعوت میں شریک کیا گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہی ایک محفل سے کیا کم ہیں!

۱۱۔ یہ نمبر اولڈبوائے روانہ کرتے ہوے برادر مکرم مولوی مصطفےٰ خانصاحب بی اے۔ بی ٹی مہتمم تعلیمات

ضلع عادل آباد کو اولڈ بوائز ڈائرکٹری کی جانب توجہ دلائی تھی۔ ہماری ساری داستان کا پرلطف جواب ایک شعر میں دیتے ہیں۔ آپ بھی سن لیں ؎

کیا کہیں ہم تمسے کیا کارنمایاں کر گئے　　　　بی اے کیا، نوکر ہوے، پنشن ملی اور مر گئے

۱۲۔ عزیزی مسٹر ارشاد الحق (جنگاؤں) اسکی دعا کرتے ہیں کہ رسالہ کی عمر حبیب عیدروس صاحب سے بھی زیادہ ہو۔ اور اسکی اشاعت دکن کے شریفوں (سیتاپھلوں) کیطرح کثیر ہو جائے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے شریفوں نے اس جانب توجہ فرمائی تو اشاعت میں ترقی ہوگی اور عمر بھی بڑھ جائے گی۔

۱۳۔ ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوی کہ برادرم مسٹر ناظر حسن انصاری کی سعی سے گوالیار میں اسپورٹس کو بڑی ترقی ہوی ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ مسٹر انصاری میں علیگڈھ کی روح اب بھی بہت کچھ باقی ہے۔ اس کا ظہور گذشتہ سپورٹس ٹورنمنٹ کے موقعہ پر گوالیار میں ہوا تھا، جبکہ ہز ہائنس مہاراجہ بہادر، اور پرنسس کے سوا، آنریبل مسٹر کریپ (وزیڈنٹ) اور دوسرے عمائد موجود تھے۔ صاحب عالیشان گوالیار اسپورٹس ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ، اور ہمارے بھائی اسکے سکرٹری ہیں۔

۱۴۔ گذشتہ قومی ہفتہ میں بہت سی انجمنوں کے اجلاس مدراس میں ہوے تھے، ان کے منجملہ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" اور "آل انڈیا خلافت کانفرنس" کو کامیاب بنانے میں ہمارے بھائیوں میں سے مسٹر اے حمید حسن اور مسٹر یعقوب حسن نے بڑی کوشش فرمائی۔ ہمیں معلوم ہے کہ مسٹر اے حمید حسن پورے سنہ ۱۹۲۶ء میں توجہ کیساتھ اپنے فرائض قومی کو انجام دیتے رہے ہیں اور یہ تو ایک مدت کی بات ہے کہ سیٹھ یعقوب حسن سرتاپا "قوم" بن چکے تھے۔ "آل انڈیا تبلیغ کانفرنس" کے اجلاس زیر صدارت حاجی لارڈ ہیڈلی دہلی میں ہوے۔ انکی کامیابی کا سہرا بر ادر محترم مولوی غلام بھیک صاحب نیرنگ کے سر ہے۔

۱۵۔ ہمیں اتنی سی خبر ملی ہے کہ گذشتہ ماہ کے ختم ہوتے ہوتے ہمارے بھائیوں میں سے دو گھر ملو زندگی میں داخل ہوگئے یہ اتفاق ہے کہ دونوں اولڈ بوائز کے فرزند اور خود اولڈ بوائے ہیں۔ مسٹر خورشید احمد (فرزند صاحبزادہ آفتاب احمد خاں) کی شادی سنتے تھے کہ بریلی میں ہوئی ہے۔ دوسری شادی سے تعلق مسٹر اعجاز احمد (فرزند خانصاحب امتیاز محمد خاں) کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ تقریب بھی اسی زمانہ میں مسٹر ممنون حسن خاں (اولڈ بوائے) وظیفہ یاب

ڈپٹی کلکٹر کی دختر سے قرار پائی تھی، اور بفضلہ خیریت کے ساتھ انجام کو پہنچی۔

اسی سلسلہ میں ایک تیسری شادی پر بھی خوشیاں منائی گئیں۔ یہ شادی ہمارے برادر مکرم میجر سعید محمد خاں کی بھتیجی اور برادر عزیز مسٹر رشید محمد خاں کی دختر کی ہے۔ شادی خورجہ میں رچائی گئی تھی، اور سنا ہے کہ قدیم رسم کے مطابق بدایوں کے ایک اللہ مارے توبہ! ایک کبشیر نے موقعہ کے مناسب حال ایک کبت سے اہل محفل کو محفوظ کیا؛ جو یہ ہے؛

رشید میاں کی لڑکی رشید میاں کو بیاہی رشید میاں سسرے، رشید میاں جنوائی

مزہ اس میں ہے کہ نوشاہ کا نام عبدالرشید خاں ہے۔ دلھن کے باوا اور چچا دونوں ہماری مبارکباد قبول کریں۔

۱۶۔ دسمبر کے عشرۂ ثانی میں اعلیٰحضرت شاہ افغانستان کے تشریف فرمائے ہند ہونے کے موقع پر چمن، کوئٹہ، کراچی، اور بمبئی میں جس شادمانی کا اظہار عامۂ خلایق نے کیا اسکی نظیر ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک مدت سے نہیں ملتی بمبئی میں کافۃ الناس کیجانب سے شاہ امان اللہ کی پذیرائی ایک مدت تک یادگار رہے گی۔ اس پذیرائی کا انتظام خلافت کمیٹی اور مسلمانان بمبئی کیجانب سے ہمارے برادر اکبر مولانا شوکت علیصاحب اور انکے فدائیوں نے کیا تھا۔

۱۷۔ ناظرین اولڈبوائے کو یہ معلوم کرکے قلق ہوگا کہ برادر عزیز مسٹر صدیق حسن ایم اے پروفیسر سٹی کالج نے یکایک رحلت کی۔ مرحوم تعطیلات سرما بسر کرنیکی غرض سے عازم وطن ہوئے تھے، مگر وہاں پہنچے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ کپتان نظیر الاسلام کو خدا جزائے خیر دے کہ ایک غریب الوطن بھائی کی آخری راحت گاہ اپنے اعزہ کی قبرستان میں قرار دی۔

۱۸۔ نہایت رنج و افسوس کیساتھ ہم نے اس خبر کو سنا کہ ہمارے بھائی مولوی ولایت علی صاحب بی۔ اے صدر مدرس مدرسہ شاہ علی بنڈہ و اڈیٹر حیدرآباد ٹیچر نے تقریباً چودہ روز کی علالت کے بعد، ۱ رجب کی شام کو دواخانہ عثمانیہ میں بعارضہ نمونیا انتقال فرمایا۔ اس غم میں ہم مرحوم کے پسماندوں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ خداوند عالم برادر عزیز مولوی خیرات علیصاحب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جنوری کے آخر عشرہ میں باغ عامہ کی شرطیں معززین حیدرآباد و سکندرآباد کی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ پہلے سنگل فائنل Final ۔ میں دو بھائیوں مسٹر سید محمد ہادی (علیگڈھ) اور مسٹر سید محمد جواد کے نام آئے، اور اول الذکر نے آسانی کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی پر فتح حاصل کر لی۔ تین سیٹ کھیلے گئے۔ ان کے منجملہ

مسٹر سید محمد جواد نے صرف دو میں دو دو گیمس حاصل کئے۔ دو روز کے بعد ڈبلس کے آخری کھیل اسی کورٹ Court پر شروع ہوا۔ اسمیں ایک جانب مسٹر سید محمد ہادی (علیگ) اور لفٹننٹ سید محمد حسین (علیگ) کے مقابلہ میں مسٹر سید محمد جواد اور مسٹر قمر الدین کھیلے تھے۔ اس موقعہ پر تین ٹانگوں کا مقابلہ چار ٹانگوں سے تھا یعنی لفٹننٹ سید محمد حسین کو لنگ کی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ بہت سے شرفا اس کھیل کو دیکھنے کی غرض سے جمع ہوئے تھے اور حضور پرنور بہ نفس نفیس زینت افروز ہوئے تھے۔ چار سیٹ کھیلے گئے اور مسٹر سید محمد ہادی و لفٹننٹ سید محمد حسین نے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ فاتحین کو حضور پرنور نے "جام فتح" عطا فرمائے۔

۲۰ - ہماری بھائیوں میں سے مسٹر شاہ محمد خاں اور مسٹر شیر محمد خاں کو حال ہی میں ترقیاں ملی ہیں اول الذکر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے اب ضلع عادل آباد کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے ہیں۔ اور آخر الذکر نے مہتمی مدارس سے مددگار نظامت پر ترقی پائی ہے جنکی جگہہ عزیزی سید محمد جواد صاحب ضلع محبوب نگر کے مہتمم مقرر ہوئے ہیں۔ یہ سب بھائی ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ نواب مسعود جنگ بہادر نے ان دونوں کے انتخاب میں جس پختہ کاری اور حق شناسی سے کام لیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور قابل مبارکباد ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انکی نظر انتخاب اپنے وسیع حیطۂ اقتدار میں کسقدر بلند پایہ رکھتی ہے۔

مسٹر شیر محمد خاں صاحب بی اے کی جسقدر خوبیاں ہماری نظر کے سامنے آتی جاتی ہیں ہمارے قلب میں انکی عزت اتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہے ہم بلا شک و شبہ کہہ سکتے ہیں کہ یہہ ہر اعتبار سے اپنے پیشرو مسٹر عظمت اللہ خاں مرحوم سے کسیطرح کم نہیں اور ان کا انتخاب موزوں ہی نہیں بلکہ لاجواب ہوا ہے۔ انکی ہر دلعزیزی اور زندہ دلی کے قطع نظر انکے ایثار سے غالباً یاران طریقت واقف نہونگے۔ مگر ہمیں پورا پورا اعتراف ہے کہ انکے خیر جاریہ کے تھپیڑے نے آخر دفتر اولڈبوائے کو بھی محفوظ نہ چھوڑا۔ چنانچہ حال ہی میں آپ نے اُسے Book of knowledge کے مجلدات کا ایک گٹھڑ عنایت فرمایا ہے جو چوبیس حصوں پر مشتمل ہے جسکے لئے ہم انکے شکر گزار ہیں لیکن اگر ہم پیر صاحب ہوتے تو اس فیاضی کی بڑی قدر کرتے اور دوسروں کو بھی انکی پیروی کی بڑے شد و مد سے تلقین کرتے مگر بحالت موجودہ اتنا تو اب بھی جانتے ہیں کہ ہمارے رفیق کار مسٹر خوشنگی اس کتاب سے بہت کام لیں گے۔

جن حضرات نے کتاب زیر بحث کا مطالعہ فرمایا ہے انھیں معلومات مفیدہ کو ساتھ ساتھ اکثر جگہہ شیر اور بیل شیر اور گیدڑ، شیر اور لومڑی وغیرہ وغیرہ کے قصوں سے دو چار ہونا پڑا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اُن کو

Cock & Bull کی Stories سے پیچھا چھڑانے کیلئے اکثر لمبی لمبی قلانچیں بھرنی پڑی ہوں مگر ہمارے نادیدہ مشتاق مولوی عبدالحفیظ خانصاحب تحسین کوئیل محبوب نگر نے ایک جگہہ جس پر لطف پیرائے میں "شیر او رچوہے" کا مسئلہ باندھا ہے اسپر تو ساری یک آف ایج کو قربان کردینا پڑتا ہے ایسے موقعہ پر ہمیں خاموش رہنے کی بہت سی ٹیپیاں پرانی کتابی وزن اور اخلاق یاد تو آگئے لیکن ہم چونکہ ایک بیش قیمت اور وزنی کتاب ہڑپ کر چکے تھے اسلئے نزاکت وقت کا لحاظ کرتے ہوئے آخرکار گھتی سادھنے پر آمادہ ہو گئے مگر کیا کریں کہ روایتی تحقیق ولولوں اور وعدوں نے یاد گوے نے ہمیں نچلا نہیں بیٹھنے دیا اسلئے اب ہم مجبور ہوگئے ہیں کہ "بلی کو تھیلے سے نکالدیں"۔

محبوب نگر میں ایک دفعہ طاعون پھیل رہا تھا۔ گھر گھر "ہوشیاری" ہو رہی تھی آخر لوگوں نے جنگل میں منگل منانے کی ٹھان کر جنرل اکسوڈس General Exodus شروع کردیا۔ ملیگ بھر کے کھلنڈرے بالطبع لیڈر واقع ہوے ہیں اور ہر معاملے میں تنہا اوسے پیش پیش رہا کرتے ہیں لہذا ہمارے "خان بابا" نے قدرتاً اس زریں قعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس قدیم روایت پر عمل کرتے ہوئے لذتوں میں خود بخود سب کی پیشوائی منظور کرلی اور سب کے مقدمتہ الجیش بنکر وہاں سے بگٹٹ روانہ ہوکر قریب کے پہاڑوں میں ڈیرے ڈنڈے جاڈالے اور جب تک اطمینان کا سانس نہ لیا اپنی عنبری سونچھوں کی نوک پلک تک درست کرنیکی ہمت نہ کی۔ سوء اتفاق سے حضرت عیش ادھر جا نکلے۔ ہمیں انکی واردات قلبی کی تو کوئی اطلاع نہیں مگر خان شیر محمد خاں کو پہاڑوں میں براجتے دیکھکر فوراً مصرعہ ذیل چست کردیا جو کسی طرح ہم تک پہنچ ہی گیا ہے وھو ہذا :-

چوہے کے ڈر سے شیر چھپا ہے پہاڑ میں!!

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۱۲۔۱۰۔۴ سلطانپورہ حیدرآباد دکن سے شایع کیا

قیمت سالانہ صہ قیمت ششماہی ؎ نمونہ ۱۲

قطعہ

اے منظر گرامی و اے اشہر جلیل — اُلفت نے تیری دلکو تونگر بنا دیا
بھیجا عجیب نسخہ جاں بخش و جانفزا — بیمار کو مسیح کا ہمسر بنا دیا

قلمی کتاب بے بدل منظر الکرام — اہل نظر کے واسطے منظر بنا دیا
ارباب ذی شرف کی سنائی ہے داستاں — کانوں کو رشک معدن گوہر بنا دیا
کس حسن سے سجائی ہے یہ بزم منتخب — جس نے فلک کی بزم کو ششدر بنا دیا
دی مٹنے والی ہستیوں کو عمر جاوداں — حرفوں کو آب خضر کا ساغر بنا دیا
پھولوں کے ساتھ پتے بھی دینے لگے بہار — گلدستہ ایسا باصرہ پرور بنا دیا

اللہ رے تیری خامہ کی جادو نگاریاں — اک پر تھا جس کو تو نے کبوتر بنا دیا
ضامن کو دی جگہ فضلا کی قطار میں
ایسے حقیر کو بھی موقر بنا دیا

۲ جمادی الآخر ۱۳۴۵

ضامن کنتوری

دنیا کی آبادی کا سرعت کیساتھ بڑہنا اور زمین کی قابلیت پیداوار کا دن بدن گھٹنا کیا یہ دونوں باتیں عالمگیر قحط کا باعث ہونگی یا سائنس نئے زرعی طریقوں کے ذریعہ نوع انسانی کے مدد کو پہنچے گی۔

انگلستان اور جرمنی کے علماء سائنس کی کانفرنس حال ہی میں منعقد ہوئی تھی جس میں اہم ترین مسئلہ یہ زیر بحث تھا کہ مصنوعی نیٹروجن کسطرح پیدا کیجائے۔ مضمون ذیل میں یہ بتانے کی کوشش کیگئی ہے کہ سر ولیم کروکس نے تیس سال پہلے جو خیالی خواب دیکھا تھا اسکی تعبیر کسطرح ہوئی اور یہ کہ مصنوعی نیٹروجن پیدا کر کے کسطرح دنیا کی موجودہ آبادی سے دگنی آبادی کو خوراک بہم پہنچائی جاسکتی ہے ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ انسان اس گیس سے پوری طرح فائدہ اٹھائے

ہم جناب مولوی نذیر الدینصاحب کی اس تکلیف فرمائی کے ممنون ہیں۔

اولڈ بوائے

ورلڈ پاپولیشن کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر جے۔ او۔ پی۔ بلانڈ، جان اسٹورٹ مل کے اس خیال کی پرزور تائید کرتا ہے کہ قوائے فطرت پر سائنس کی فتحیابی گو کتنے ہی شاندار نتائج پیدا کرے عام خوشحالی کی ضامن نہیں ہوسکتی؛ بلکہ اسکے ساتھ ساتھ اس بات کی ضرورت ہے کہ شرح پیدائش کو باقاعدہ طور پر گھٹانے کی کوشش کیجائے اور اسپر قابو حاصل کرنے کے تدابیر سوچی جائیں۔ ہمیں فی الحال اس خیال کی صحت یا عدم صحت سے بحث نہیں لیکن بہتر یہ ہوتا کہ سائنس کے موجودہ شاندار کارناموں کا کچھ علم پہلے ہوجاتا۔ ہم زیادہ تر غذائی پیداوار کے مسئلہ پر غور کرینگے۔ اس مسئلہ نے متذکرہ بالا کانفرنس میں بہت کچھ ہیجان پیدا کردیا تھا اور عام خیال یہ تھا کہ مستقبل قریب میں عالم گیر قحط کے حملہ سے چھٹکارا نہیں۔

یہ پہلی دفعہ ہی نہیں کہ اس قسم کے خطرے کی پیشین گوئی کی گئی ہو۔ تقریباً ۵۰ سال پہلے سر ولیم کروکس نے برٹش ایسوسی ایشن کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہکر سنسنی سی پیدا کر دی تھی کہ گیہوں پیدا کرنیوالی زمین کی قابلیت پیداوار دن بدن گھٹ رہی ہے اور اگر وہ سب زمین جو کاشت کیلئے موزوں قرار پا سکتی ہے کام میں لائیجائے تو سال ۱۹۳۱ء کے بعد اتنی پیداوار نہو سکیگی کہ دنیا کی آبادی کے لئے کافی ہو سکے۔

اس زمانہ میں عالمگیر قحط سے بچنے کی کوئی تدبیر معلوم نہیں اور زمانہ مابعد میں اگر سائنس ایک بہت اہم انکشاف کے ذریعہ بنی نوع انسان کے مدد کو نہ پہنچتی تو ہمارے حشر کا دن متعین ہو جاتا۔ اس انکشاف کی نوعیت پر کروکس کی دوربین نظر پڑ چکی تھی چنانچہ اسکے الفاظ میں "نیٹروجن کا انجماد (نیٹروجن گیس کو ٹھوس بنانا) ایک اہم ترین انکشاف ہوگا جو علما کیمیا کی ذہانت و ہوشیاری کا منتظر ہے اور خدانخواستہ مستقبل قریب میں اس کا انکشاف نہوا تو سفید اقوام کا نیست و نابود ہو جانا یقینی ہے"۔

اگرچہ اب نیٹروجن کا انجماد ممکن ہے ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ قحط کا خطرہ ابھی موجود نہیں۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے خطرہ کی مدافعت ہو سکتی ہے۔ آیا یہ روکا بھی جائیگا یا نہیں بالکلیہ انسان کی عقل اور اسکی کوشش و محنت کی مقدار پر منحصر ہے اس باب میں جو کچھ ہوا اس کا اجمالی خلاصہ دینے کے پیشتر نیٹروجن کی خاصیت اور اسکی اہمیت بتا دینا مناسب ہوگا۔ نیٹروجن گیس زندگی کی روح ہے لیکن یہ موت کا فرشتہ بھی بن سکتی ہے۔ کرہ ہوائی میں ۴/۵ حصہ نیٹروجن کا ہے اس کا اندازہ اسطرح ہو سکتا ہے کہ زمین کی سطح کے ہر مربع میٹر پر کی ہوا میں ۸ ٹن نیٹروجن موجود ہوتی ہے۔ زمین کو زرخیز کرتی ہے اور اسطرح انسانی وجود کا سہارا ہے ہر قسم کے رنگ میں اسکا وجود لازمی ہے اور اسطرح انسانی زندگی کی رنگینی بھی اسی سے قائم ہے لیکن ان قوائے تعمیری کے ساتھ ساتھ ہلاکت کا مادہ بھی اس میں بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ دھماکون اور پھوٹ پڑنے والے مادوں کی بنیاد اسی پر قائم ہے اور اسلئے خود جنگ کی بنیاد بھی۔

کروکس نے جس وقت متذکرہ بالا تقریر کی تھی اس زمانہ میں منجملہ نیٹروجن کے ذخیرے چائل کے قدرتی حوض تھے یا سلفیٹ آف امونیا جو کوئلہ سے اخذ کیا جاتا تھا لیکن اس قسم کے ذخیرے قحط کو روکنے کیلئے ناکافی تھے۔ یہ سچ ہے کہ فطرت خود اپنے میکانیکی طریقوں سے زمین کو نیٹروجن مہیا کرتی ہے لیکن

اسکی رسد بمقابلہ اسکے طلب کے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ چند پودے (مثلاً کلور گھانس اور لوبئے کی پھلی) ایسے ہیں جن کے جڑوں کے قریب چھوٹے چھوٹے فطرتی کارخانے ہوتے ہیں جن میں محنتی و جفاکش بیاکٹیریا (جو نہایت خفیف الجثہ جراثیم ہے) ہوائی نیٹروجن کو زمین کیساتھ آمیز کرتا ہے۔ نیز جب کبھی بادل کڑکتے ہوں بجلی چمکتی ہو تو نیٹروجن گیس کی کچھ مقدار منجمد ہو جاتی ہے کیونکہ شدید برقی بار (Electrical charge) اس کو اوکسیجن کے ساتھ مرکب کرتا ہے۔

فطرت کے اس دوسرے طریقہ نے سائنس کی رہبری کی اور ایجاد و انکشاف کے جذبہ کو تحریک دی گئی جرمنی نے جب یہہ دیکھا کہ چائل کے خزانوں سے وہ مستفید نہیں ہوسکتا تو اُس نے فوراً اپنی قوت مصنوعی نیٹروجن کو عظیم الشان پیمانہ پر تیار کرنے میں صرف کردی۔ اس صنعت کی ترقی کس سرعت سے ہوی ہے اس کا اندازہ اس واقعہ کو پیش نظر رکھہ کر لگا دیا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء تک کرہ ہوای سے کچھہ بھی نیٹروجن اخذ نہیں کیگئی لیکن صرف سنہ ۱۹۲۵ء میں اسکی محصلہ مقدار ۵۰۰۰۰۰ ٹن تھی۔ آج یہہ حال ہے کہ تمام ممالک متمدنہ میں اسقسم کے کارخانے قائم ہوچکے ہیں۔ اسطرح سرولیم کروکس کے خواب کی تعبیر صحیح نکلی اور نیٹروجن گیس کا انجماد (جو تقریباً ساٹھہ سال پہلے دارالتجربہ میں منجمد کی گئی تھی) اب ایک وسیع تجارتی مہم بن چکا ہے۔

سرڈانیل ہال جو اس زمانہ کا بلند پایہ ماہر مزروعات ہے کہتا ہے کہ سفید اقوام کی آبادی میں سالانہ پچاس لاکھہ کا اضافہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ہر سال ایک کروڑ بیس لاکھہ ایکڑ نئی زمین زیر کاشت لائیجائے۔ لیکن جنگ عظمیٰ کے بعد سے یورپی اقوام کا میلان طبع کچھہ اور ہوگیا ہے۔ زیر کاشت زمین میں پھیلاؤ کی جگہ سکیڑ واقع ہو رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا نعم البدل تلاش کرلیا جائے لیکن ابتک یہہ بات کسی کے ذہن میں نہیں آئی کہ پھیلاؤ کی گنجایش کہاں ہے۔

ہماری خیال میں کوئی حل ممکن نہیں سوائے اسکے کہ زیر کاشت زمین کی قوت پیداوار کو تقویت دیجائے جواب علمی سائنس کی مدد سے ممکن ہے۔ یہاں نیٹروجن کا حصۂ عمل اہم ترین ہے۔ فی الحال ہم زمین کی طاقت کو چوس رہے ہیں یعنے ہم زمین سے زیادہ حاصل کرتے ہیں اور اس میں (اسکی زرخیزی کو بڑھانیوالی اشیاء) کم داخل کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، ہم فطرت کے بنک سے قرض پر کام چلا رہے ہیں۔ توپھر یہ کونسی تعجب کی

بات ہی کہ یہہ بنک جو خدا جانے کس زمانے سے فیاضانہ قرضے دیتا چلا آرہا ہے۔ دیوالیہ کے قریب پہنچ گیا ہے اور اسکے احسان فراموش بچے عجیب صورت سے پریشان حال ہیں۔

دنیا کے روزافزوں بڑہنے والے منہ کیلئے کافی خوراک مہیا کرنے کا سوال غالباً موجودہ نوجوان نسل کی زندگی ہی میں حل کر لیا جائیگا۔ یاد ہوگا کہ کروکس نے سال ۱۹۳۱ء کے بعد قحط پڑنے کا خوف ظاہر کیا تھا، یعنے صرف چار سال بعد۔ لیکن اب ہوا زمین کو بچا سکتی ہے کیونکہ نیٹروجن کی لازوال [illegible] سے نکالنا ممکن ہو گیا ہے جو کرہ ہوائی میں آزادانہ موجود ہے۔ اس قسم کا عمل جاری ہو چکا ہے لیکن ترقی کی رفتار آنیوالے خطرہ کی تیز رفتار سے بہت سست ہے۔ پس اسکو بالکلیہ روک نہیں دیا گیا، بلکہ صرف ذرا دور ہٹا دیا گیا ہے۔ اسکی مہیب شکل اب بھی نظر کے سامنے ہے۔ اکثر ماہرین فن کا یہی فتوی ہے۔

حفاظت وسلامتی کے حدود میں داخل ہونے کے لئے مصنوعی نیٹروجن کی پیداوار موجودہ پیداوار سے کم از کم چھ گنی ہونی چاہئے، تاکہ فی ایکڑ ۲۰ بشل گیہوں ہر سال نکل سکیں، یعنے ۵ لاکھہ ٹن نیٹروجن کی بجائے ہر سال ۳۰ لاکھہ ٹن نیٹروجن تیار ہونی چاہیے۔

ابتک ہم نے صرف یہہ بحث کی کہ موجودہ شرح سے بڑہنے والی آبادی کے لئے خوراک کی قلت کو روکنے کی تدبیریں ممکن ہیں، لیکن ارباب فن کا یہہ خیال ہے کہ اگر سائنس زراعت کی معاون ہو جائے (اور اسکے لئے خاص کر نیٹروجن کی کثیر مقدار کا استعمال لابدی ہے) تو موجودہ آبادی کی دوگنی آبادی کو کافی خوراک مل سکتی ہے کیونکہ جب زمین کو نیٹروجن کی مدد سے زرخیز بنا دیا جائے، تو فی ایکڑ ۳۶ بشل گیہوں اور اس سے زیادہ بھی نکلنے کا امکان ہے۔ دوسری فصلوں کا بھی یہی حال ہوگا۔ مثلاً تجربہ سے یہہ معلوم کیا گیا کہ ایک ٹن نیٹروجن سے آلو کی فصل میں ۱۰۰ ٹن کا اضافہ رونما ہوتا ہے۔

متذکرۂ بالا امور سے یہہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر دنیا کی آبادی بہت سرعت سے بھی بڑہنے لگے تو غالباً فاقہ کشی کی ضرورت پیش نہ آئیگی۔ لیکن ایسا کہنے کے یہہ معنے نہیں کہ قحط وقوع پذیر نہ ہوں سکے۔ ہم نے ابتدا میں بتا دیا تھا کہ ہر چیز کا انحصار اسی کوشش و توانائی (Energy) کی مقدار پر منحصر ہے جو ہوا سے نیٹروجن اخذ کرنے میں اور اس کو زمین کے ساتھ آمیز کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس باب میں جو سعی کا قدم

سب سے آگے ہے۔ انگلستان بھی ہاتھ پیر مار رہا ہے لیکن منزل مقصود ابھی کوسوں دور ہے ۔

سائنس کی روشنی میں نہایت یہہ صاف نظر آرہا ہے کہ خوراک اور آبادی کے پورے مسئلہ نے ایک نئی صورت اختیار کرلی ہے اور ہم ایک ایسے دور کے قریب ہوتے جارہے ہیں جس میں ہر ملک اپنے باشندوں اور جانوروں کی خوراک خود فراہم کریگا اور دوسرے ممالک کی دستگیری کا محتاج نہ ہوگا۔ اسلئے اگر کسی جگہ قحط پڑے تو یہہ صرف وہاں کے افراد کی نادانی کا ثبوت ہوگا۔ ہمیں ہرگز یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ایام گزشتہ میں بلا لحاظ آبادی قحط واقع ہوئے ہیں اور آئندہ بھی بلا لحاظ آبادی واقع ہونگے کیونکہ قحط کا مشترک سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ انسان کی بیوقوفی اور نادانی ۔

یہہ امر بالکل یقینی ہے کہ وہی ملک طاقتور اور محفوظ ہونگے جو نیٹروجن کی صنعت کو ترقی دینگے۔ سب سے پہلے وہ قحط کی مہلک زد سے محفوظ و مامون رہ سکیں گے، جو ایسے ملک کو ہی اپنا نشانہ بنائیگا، جہاں زمین کو نیٹروجن سے پرورش نہیں کیا جاتا، اور اسلئے ایسی زمین کا بانجھ ہوجانا یقینی ہے، جو اسکی موت کے مترادف ہے۔ شاید یہہ کہنا مبالغہ ہو کہ نیٹروجن کی صنعت کو ترقی دینے والے ملکوں میں فاقہ کشی کا وجود معدوم ہوجائیگا۔ لیکن ہم بلا خوف تردید اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جب فصل کی افراط ہو تو اسوقت صرف تقسیم کا سوال درپیش ہوگا جسکا حل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ۔

دن بدن دنیا پہ یہہ حقیقت کھلتی جارہی ہے کہ زراعت کی عام پست حالت گھٹیا زمین کی باعث ہے۔ زمین کی یہہ خرابی طویل غفلت اور زمین کی نوعیت سے عام ناواقفیت کا نتیجہ ہے زمین بھی زندہ چیز ہے جو اُن تمام قوانین کے تابع ہے جو زندگی سے متعلق ہیں ضرورت اسبات کی ہے کہ انکو بھی مثل دوسرے زندہ جواہر Atoms کے مستقل طور پر پرورش کیا جائے، اور اسکو غذا پہنچائی جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ نیٹروجن کے انجماد کا انکشاف بروقت ہوا، ورنہ یہہ پیرزال دنیا اب تک نزع کی حالت میں سسکیاں لے رہی ہوتی۔ اب کسانوں کی مالی حالت کو اس قابل بنا دیا کہ وہ زرخیز کرنیوالی اشیاء کو بکثرت خرید سکیں، ان لوگوں کا کام ہے، جو انکی محنت ومشقت پر پلتے، اور انکے سہارے جیتے ہیں۔ شہر کا رہنے والا، جسکے سامنے کھانے کی پلیٹ طلسمی طور پر آموجود ہوتی ہے، اس کا تصور نہیں کرسکتا۔

فاقہ کشی ممکن ہے۔ دیہات انکی دلچسپی کا مرکز نہیں سوائے اسکے کہ وہ کبھی کبھی شہر کے شور و شغل سے اکتا کر موٹر میں تفریح کرنے نکلے۔

ممالک متحدہ امریکہ میں واقعات کا رنگ کچھ اور ہے جہاں ۹۰ لاکھ ٹن نیٹروجن کی ضرورت ہے صرف ۴۵ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن نیٹروجن استعمال ہوتی ہے۔ اسطرح ۴۰ فیصدی کی کمی رہجاتی ہے۔ وہاں کے کسان اس سے زیادہ نیٹروجن کے استعمال کے مخالف ہیں صرف اس خود غرضی کی بناء پر کہ کثرت پیداوار سے موثر طلب کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔

زمین کے اس ضعف کے باعث خدا جانے کس قسم کا معاشی ہیجان پیدا ہو سکین اگی صورت یقیناً مہیب ہوجاتی اگر خدانخواستہ نیٹروجن کے انجماد کا معجزہ ظہور پذیر نہوجاتا۔

اس مضمون کے دوسرے ہلاکت آفریں رخ کو ابتک ہم نے بیان نہیں کیا نہ یہاں اسکی گنجایش ہے۔ صرف اختصاراً اسکا اشارہ کرتے ہوے کہ عقلمند را ایں ہم کافی است جس ملک میں زیادہ سے زیادہ نیٹروجن کے کارخانے ہونگے وہ ملک سب سے زیادہ جنگ کیلئے تیار ہوگا نیٹروجن کی فیکٹری گویا ایک جدید میگزین ہے کیونکہ بہت تھوڑے وقفہ میں اسکو ایسی فیکٹری میں بدلدیا جاسکتا ہے کہ اس سے زہریلی گیسیں اور شدید دہماکہ کی اشیا تیار ہوسکیں۔ اب یہہ ایک کھلی ہوی بات ہے کہ کوئی ملک زمین کو زرخیز کرنیوالی شئے نیٹروجن کی تیاری سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ اسطرح تخفیف اسلحہ کا مسئلہ ایک خوشگوار خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا حقیقی و مادی تخفیف اسلحہ کا شور و غل ایک دہوکہ ہے اور ایک فریب۔ (ترجمہ)

محمد نذیر الدین

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ برادرم مولوی حامد علی خانصاحب تحصیلدار کا تبادلہ چنچولی ضلع گلبرگہ سے تحصیل میدک کا ہوگیا ہے۔ دوسرے بھائی بھی اپنی نقل و حرکت کی اطلاع دیتے رہیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہندوستاں ہمارا!

زیبِ نگیں رہا ہے ہندوستاں ہمارا — صدیوں رہا ہے اس پر سکہ رواں ہمارا
تھا راحتوں کا مسکن دارالاماں ہمارا — اپنا جواب خود تھا یہ گلستاں ہمارا

قسمت چمک اٹھی تھی اس عالمِ کہن کی
روشن جبیں پہ جیسے ابھری تھی مادرِ وطن کی

اس انجمن کا چرچا عالم میں جا بجا تھا — ہر ذرہ اس زمیں کا سورج بنا ہوا تھا
جس سمت دیکھتے تھے منظر بہار کا تھا — دنیا میں بھی یہی اک فردوس پُر فضا تھا

سیراب اسی سے ہوتی عالم کی سرزمیں تھی
چشم و چراغ سب کی یہ خاکِ دلنشیں تھی

ہے روشنی جہاں میں اس شمعِ انجمن کی — پھولوں میں تازگی ہے ساری اسی چمن کی
دنیا ابھی ہے ممنون اس کشورِ کہن کی — پر اب کہاں وہ باقی رنگینیاں وطن کی

یورش ہے اب خزاں کی اس کنجِ دلنشیں پر
شاید کہ آسماں اب ٹوٹے گا اس زمیں پر

علم و ہنر کا معدن ہندوستاں کبھی تھا — گیتی فروز اپنا نام و نشاں کبھی تھا
سارے جہاں سے دلکش یہ گلستاں کبھی تھا — مرغانِ نغمہ خواں کا یہ آشیاں کبھی تھا

گو اب فلک زدہ ہے پر یادِ رفتگاں ہے
دھندلا سا اس فضا میں ماضی کا اک نشاں ہے

ترمذی

"شوکت علی پنشنیا"

(ایک سبق آموز لطیفہ)

سنہ ۱۹۱۲ء میں جبکہ میں مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں گورنمنٹ کے محکمہ امین سے رخصت لیکر اپنے
پرانے کالج علی گڈھ کی ذمہ دار کارکنوں کی استدعا پر ہز ہائینس آغا خان کے سکرٹری کی حیثیت سے اُنکے
ہمراہ تنہا سارے ہندوستان کا دورہ کرچکا تھا اور خدا کے فضل وکرم سے ہندوستان کے مسلمانوں نے گورنمنٹ
کے توقعات کے خلاف ۶ مہینہ کے اندر مطلوبہ سرمایہ مسلم یونیورسٹی کیلئے جمع کردیا تھا۔ اسوقت میں نے محسوس
کیا کہ میرا انگریزی نوکری میں زیادہ رہنا بیکار تھا بلکہ اس سے علٰحدہ ہوکر مسلمانوں کی خدمت کے لئے اپنی
باقی ماندہ قوتوں کو وقف کردوں۔ گورنمنٹ ہند نے اوّل مسلمانوں کو اطلاع کیا کہ بیس لاکھ روپیہ جمع کردیں تو
جیسی مسلم یونیورسٹی وہ چاہتے ہیں بنجائیگی۔ سرہارکورٹ بٹلر جو یوپی کے گورنر رہے پھر برہما کے گورنر ہوئے اور اب
بھی ریاستوں کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئے ہیں، انھوں نے دہلی کے جلسہ میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے اردو میں
تقریر کی تھی اور کہا تھا "روپیہ لاؤ یونیورسٹی لو" جب ۲۰ لاکھ آناً فاناً جمع ہوگئے تو مطالبہ کیا کہ پچیس لاکھ چاہیئے۔
جب یہ بھی ہوگیا تو کہا تیس لاکھ لاؤ۔ بالآخر پینتیس لاکھ پر سودا طے ہوا۔ اور مسلمانوں نے یہ رقم بھی جمع کرکے اپنی
زندگی کا ثبوت دیا جس سے انگریز بھی چوکنا ہوئے اور انھوں نے خطرہ محسوس کیا کہ جب اس غریب قوم میں اس
درجہ احساس موجود تھا تو یہ قوم بہت دنوں تک سوتی ہوئی نہ رہیگی بلکہ اسلام اور اپنے حقوق کیلئے پوری طرح مقابلہ
کریگی اس لئے مسلمانوں کے دبانے کے آثار دکھائی دینے اور گورنمنٹ کی پالیسی میں ایک بڑا فرق نمودار ہونے لگا
میں نے انگریزی کی نوکری چھوڑنے کا ارادہ کرلیا۔ مگر میری سترہ (۱۷) سالہ خدمات اسقدر اچھی تھیں کہ مجھ کو

پنشن بھی دیدیگئی۔ اگرچہ میں استعفیٰ دینے کیلئے تیار تھا۔ نوکری چھوڑ کر میں خدام کعبہ اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڈھ کے کاموں میں مصروف ہوگیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے وطن میں جننگ و پریس اپنی گذر اوقات کیلئے بنوایا۔ اولڈ بوائز لاج میں میں رہتا تھا اور ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو پنشن لینے سڑک کے اس پار کلکٹری کے خزانہ میں جاتا تھا اور افسر خزانہ مجھ کو زندہ پاکر اسی وقت پنشن کا روپیہ دیدیتے تھے۔ میرے دفتر کے کلارک پہلے ہی سے کاغذ بھیجدیتے تھے اور محکمہ کے سب لوگ خاطر کرکے ٹھیک وقت پر بلا لیتے تھے۔ اس زمانہ میں میں انگریزی لباس پہنتا تھا اور اچھا پہنتا تھا۔ ڈاڑھی بھی نہیں تھی۔ جسم بھی بھاری نہیں ہوا تھا۔ کرکیٹ ٹینس اور دیگر ورزشیں بھی جاری تھیں۔

حسب معمول ایک اچھا اسکوتھ اینڈ لارڈ کے یہاں کا سوٹ پہنے ہوئے فلٹ کی ہیٹ سر پر رکھے ہوئے ٹینس بوٹ پہنے ہوئے میں اولڈ بوائز لاج سے سو قدم چل کر کچہری میں اسوقت آیا جس وقت ایک چپراسی جو مجھ کو نہیں جانتا تھا اور جہاں اور پنشن لینے والے بڈھوں کو نام بنام پکار رہا تھا۔ میں میرے پہنچنے کے وقت بلا میری طرف دیکھے ہوئے اُس نے چلا کر آواز لگائی "شوکت علی پنشنیا حاضر ہے"۔ میں قریب تھا چلا کر ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور حاضر ہوں"! میری آواز پر چپراسی نے مڑکر مجھ کو دیکھا اور دیکھکر غریب گھبرایا، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا کہ اس کو نہیں معلوم تھا کہ میرا یہی نام تھا ورنہ وہ اسطرح بے التفاتی کے ساتھ نہ پکارتا۔ میں ہنستا ہوا افسر خزانہ کے پاس چلا گیا جو میرے کالج کے ہمدرجہ تھے اور دوست تھے۔ کاغذ پر دستخط کرکے روپیہ لیکر چلا آیا۔

کالج میں بہت سے اولڈ بوائے احباب "شوکت علی پنشنیا" کہکر بعض اوقات مجھے پکارتے تھے میں نے اس چھوٹے واقعہ کو اس لئے اب درج کیا ہے کہ ۱۶ برس پہلے مجھ کو قبل از وقت پنشن ملگئی تھی۔ مگر اب ۱۰ مارچ کو پچپن برس عمر کے پورے ہوجائیں گے، اور وقت آگیا تھا کہ میں پنشنیا بن کر سب کام کو چھوڑکر اب گھر رہتا، بچوں و عزیزوں میں ہنسی خوشی کی زندگی کاٹ کر آرام سے وقت گذارتا۔ میں نے ایک دوست کے مشورہ سے زندگی کا بیمہ بھی کرایا تھا اور اسی طریقہ سے تھوڑا سا روپیہ جمع کرنے کا طریقہ نکالا تھا۔ چنانچہ اس جنوری میں بیمہ کا روپیہ بھی بیمہ کمپنی نے ادا کردیا اور ساتھ ہی ساتھ مجھکو پچپن سالہ ہونے کی یاد دہانی کی۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ نے خوب کہا ہے ؎

چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو
رندی و خراباتی در عہد شباب اولیٰ

پچپن برس سمجھو کہ پچپن سال ہوتے تھے کہ گزشتہ ۱۵ برس میں کسی صاحب دل مسلمان کو چین آرام سے زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ حوادث پر حوادث مصائب پر مصائب اسلام و مسلمانوں پر آتے رہے اور ان سب کے مقابلہ میں بفضلہ تعالیٰ ہم اپنی بساط کے مطابق سینہ سپر رہے۔ کم از کم ان تکالیف کے لحاظ سے جو ہم پر آئیں اس پچپن برس کی عمر میں دس برس کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ نظر بندی تھی۔ قید بھی تھی۔ کام بھی بہت تھا اپنوں کی طرف سے برا بھلا بھی سننا پڑا غرضیکہ وقت کٹ گیا اور خدا کا شکر ہے آج بھی اسلام کا ایک ادنیٰ سپاہی بکمال [illegible] میدان میں کھڑا ہے۔ قدم سب سے [illegible] ملتا ہے، آگے بڑھتا ہے پیچھے ہٹنا مسلمانوں کی کسر شان ہے۔ اگر آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں تو کمزور پاؤں کو آرام لیکر زمین ہی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اسلامی علم کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے دشمنان اسلام کے سامنے اسلامی شان سے اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔ (خلافت)

شوکت علی

غزل

کوئی امید نہ رکھ اے دل ناداں مجھ سے
غیر ممکن ہے ترے درد کا درماں مجھ سے

ستم یار سے شکوہ ہے اگر مجھ کو یہ ہے
روٹھ جاتے ہیں بے سبب [illegible] مجھ سے

وحشت عشق میں پھر تازہ ہوئی رسم کہن
قیس کے بعد ہیں آباد بیاباں مجھ سے

حسن پیدا ہوا عشق حسن پہ قربان رہا
للہ الحمد ہوا کار نمایاں مجھ سے

بڑھا جاتا ہے حسن پرستش اپنی
عشق کو ضد ہے رہے پرسش پنہاں مجھ سے

دست نازک بھی ہے خنجر بھی ہے وہ جوش بھی ہے
اب اٹھائے نہیں اٹھتے ہیں یہ احساں مجھ سے

میں نے بتخانہ میں دیکھے ہیں وہ جلوے بسمل
کافری سیکھنے آئیں گے مسلماں مجھ سے

(بسمل)

فریب نظر

از جناب مولوی شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی

زمیں پہ روندی ہوئی پڑی ہے ، جو دل کا غنچہ کھلا رہی تھی
ارے کلی کو یہ ہو گیا کیا ، ابھی تو یہ مسکرا رہی تھی
ورق یہ کیسا الٹ گیا ہے ، خود آج مجروح و بے نوا ہے
وہ جسکی ترچھی نگاہ کل تک ، دلوں پہ نشتر چلا رہی تھی
یہ کیسی کایا پلٹ ہوئی ہے ، چمن میں کیوں خاک اڑا رہی ہے
ابھی تو یاں باد صبح گاہی ، گلوں کو جھولے جھلا رہی تھی
نگاہ اٹھی، تو پھول دیکھا ، پلک جو جھپکی تو خار پایا
سنا کہ فصل گل آ رہی ہے ، چمن میں پہنچے تو جا رہی تھی
بڑھے جھپٹتے ہوئے خوشی میں ، دکھایا لب تشنگی نے دریا
قریب پہنچے، تو ریگ صحرا ، شعاعوں سی جگمگا رہی تھی
اٹھی جو صحرا میں گرد پیہم ، اٹھے کہ لیلیٰ کی ہے سواری
گئے امیدیں لئے تو دیکھا ، ہوا بگولے اڑا رہی ہے
اٹھا جو پردے کا ایک گوشہ ، نظر پڑا در پہ اُن کا جلوہ
جو گھر سے باہر نکل کے دیکھا ، ہوا دریچے ہلا رہی تھی

ٹیگور بھکتوں کو صلاح دیتا ہے کہ "بھجن گانا اور مالا جپنا چھوڑ دو۔ بند در کے گوشہ تنہائی میں پھول اور خوشبو
لیئے بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں، اگر حق کی تلاش ہے تو اسے اس کسان کے ساتھ جو زمین پر ہل چلا رہا ہے
یا اس جفاکش مزدور کیساتھ جو سڑک بنانے کیلئے پتھر پھوڑ رہا ہے پاؤ گے۔ سچا خدائی اسے اپنی محنت
جفاکشی اور عرق ریزی سے پالیتا ہے پس اُسے ہر چیز میں کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو اس ہستی اعظم کا جلوہ
نظر آتا ہے اور اسکی ہر وقت یہی دُعا رہتی ہے کہ "کل کے تماشہ کی سیر میں اس" ایک" ہستی اعظم کا خیال
محو ہونے پائے"۔

"محبت" ٹیگور کی تعلیم کا اصل اصول ہے۔ اور "اتحاد" اسکا پیغام ہے۔ اس کا مذہب حقیقی اسکے بربطی
نغموں میں نمایاں ہے۔ اسکی محبت بنی نوع انسان، عاجز و خستہ حال افراد کے ساتھ قابل ستائش ہے۔
اس کا دل سمندر کی طرح وسیع اور عمیق ہے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر گیتانجلی انگریزی شاعری میں
مذہبی رنگ میں یگانہ ہے۔ گو یہ نغمے دراصل بنگالی زبان میں لکھے گئے تھے لیکن اب وہ انگریزی ادب کا
جزو بن گئے ہیں، اور درحقیقت انگریزی زبان کی ترجمانی ہی سے شاعر کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔

اگر ٹیگور بنگالی لٹریچر میں ایک ممتاز شخصیت رکھتا ہے تو انگریزی ادب میں بھی اسکا رتبہ کچھ کم نہیں۔
اسکی نثر اور نظم، فسانے اور خطوط، مضامین، تبصرے انگریزی زبان میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ پس انگریزی
ادب کی عالمگیر حیثیت پر نظر کرتے ہوئے ہم گیتانجلی کو ایک بےنظیر کارنامہ کہہ سکتے ہیں

یہ سچ ہے کہ انگلستان کے بعض مشہور شعراء میں مذہبی رنگ پایا جاتا ہے لیکن ہر ایسا کلام جس میں

برلطبی رنگ اس قدرت کیساتھ ادا کیا گیا ہے اور جو بالکلیہ ”ہستی اعظم“ کی پرستش کے لئے وقف ہو ،
مغربی رنگ کے بنسبت مشرقی رنگ میں رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔

ملٹن جو مذہبی شاعری میں سب سے نمایاں شخصیت رکھتا ہے۔ اسکی شاعری ہی زیادہ تر خارجی
ہے۔ توضیح اور بیان بہت زیادہ ہے لیکن نغمہ آسا رنگ بہت کم ہے ۔ انگلستان کا بلند پایہ شاعر
ولیم شکسپیر ڈرامائی ادب میں فرد واحد کی حیثیت رکھتا ہے وہ حیات انسانی کے رموز
سے کماحقہ آگاہ ہے اور دلی کیفیات اور حیات کی تہہ تک اسکی نظر پہونچی ہوئی ہے ۔ اس کے
کلام میں حیات انسانی کا ہر رُخ پیش نظر ہے ۔ مسئلہ محبت والفت اور اسکی تمام دقیتیں اور کاوشیں
نہایت ہی خوبی کے ساتھ نظم میں بیان کی گئی ہیں ۔ اس نے نہایت حسن وخوبی کے ساتھ جوانی کی امنگ
اور بڑھاپے کی پژمردگی کو منعکس کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اسکے بیان میں بھی ہندی شاعر کا گہرا
صوفیانہ رنگ مفقود ہے ۔ انسان کے متعلق اس نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن مسئلہ وجود باری مفقود ہے ۔
ہم تسلیم کرتے ہیں کہ شکپیر کا کلام تفریح کا معقول سرمایہ ہے ۔ ہم یاد کرتے ہیں کہ اسکے بہادروں نے
بادِ مخالفت کا نہایت دلیری کیساتھ مقابلہ کیا ہے ۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اسکے بعض سورماؤں نے یہ
جان لیا کہ یہ تمام جلوس ظاہری (نمائش عالم) ایک دن نیست و نابود ہو جائے گا لیکن اسکے کسی سورما
کو ان مسائل کا سامنا کرنا پڑا جو ہمیں گیتان جلی میں ملتے ہیں ۔ وہ عقیدت اور عبودیت کی پاک اور خالص نظم
ہے ۔ اس میں خارجی عنصر کا شائبہ تک نہیں ۔ انسان کو خدائے برحق کی لو روح کی ”روح اعلیٰ“ میں سما
جانے کی خواہش و بیقراری ، امید و یاس ، حالت رنج و راحت ، یہ سب اس نظم کا موضوع ہیں ۔ یہ وہ اصل
ہندی تصوف کی انگریزی زبانیں ترجمانی ہے ۔ یا مغرب سے مشرق کا تعارف ۔

باغبان میں جو برلطبی نغموں کا مجموعہ ہے شاعر یہی پیام دیتا ہے وہ بنی نوع انسان کو صلاح دیتا ہے ۔

”ہمت پر یقین کرو گو اسکے لئے رنج کا سامنا ہی کیوں نکرنا پڑے اپنے دلکو کڑا ہ و مت“

فلسفیوں کا یہ خاص مقولہ ہے کہ دنیا چونکہ خالی ہے اسلئے محبت اور راز دنیا کے معاملوں پر نظر
غائر ڈالنا فضول ہے ۔ رابندر ناتھ محسوس کرتا ہے کہ حیات کی مثال کنول پر شبنم کے قطرہ کی سی ہے لیکن

اسکے نزدیک محبت کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کی قلیل المیعاد زندگی کو خوشگوار بنایا جائے۔ وہ التجا کرتا ہے

"دیتا۔ زندگی کو فضول نہ جانئے ہم دونوں ہی چند لمحوں کیلئے غیر فانی رہ چکے ہیں۔
زندگی سورج کے ساتھ ڈھلتی ہے۔ ہماری زندگی تھوڑی ہے۔۔۔۔ اس میں محبت کے
صرف چند لمحے میسر آتے ہیں"۔

اس کا تخیل "محبت" روحانی ہے نہ کہ مادی۔ "لامتناہی" کی خواہش ہے اسلئے وہ بالاتر ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"میں وہ چاہتا ہوں جو مجھے ملتا نہیں اور وہ ملتا ہے جو مجھے درکار نہیں"۔

وہ محبت یہی ہے جسکی جبیں پر خدائی کا راز منکشف ہے اس نظم میں وہ جذبہ شوق سے بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

"میں بیقرار ہوں۔۔۔۔ میں بعید ترین چیزوں کا طالب ہوں۔
اے عظیم الشان! اے کہ تجھ تک رسائی عقل ناممکن ہے۔۔۔۔ میں بھولتا ہوں۔
میں ہمیشہ بھولتا ہوں کہ میرے پاس طاقت پرواز نہیں کہ اڑ سکوں۔۔۔۔۔ میں اس
جگہ مقید کر دیا گیا ہوں"۔

پس یہ درجہ کمال تک پہونچنے کی خواہش اور روح اعلیٰ سے ملجانے کی تمنا ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں "محبت" دنیا کی مقبول شاعری کیطرح ٹیگور کی شاعری کی بھی اصل اور روح رواں ہے۔ انگلستان کے ایک مشہور پیغام بر نے سچ کہا ہے کہ شاعری بغیر محبت کے ناممکن اور بعید از قیاس ہے۔

ٹیگور کا ادب پر ایک دوسرا احسان اسکی وہ شاعری ہے جس میں اُس نے عالم طفولیت پر خامہ فرسائی کی ہے۔ بہتوں کو تعجب ہوگا کہ ایک ننھا سا بچہ کسطرح شاعرانہ مسرت اور علائے تخیل کا باعث ہو سکتا ہے لیکن اسی ننھے بچے کی زندگی کے مطالعہ سے فلسفیوں نے کلام میں تاثیر پیدا کرلی۔

انگریزی شاعری میں بلیک اور ورڈسورتھ سے پہلے بمشکل کوئی ایسی نظم ملے گی جس پر عہد طفولیت کا کما حقہ اطلاق ہو سکے۔ عالم طفلی کی جانب اشارات تو جابجا پائے جاتے ہیں لیکن معصوم کا شاعرانہ نقطہ نظر سے غائر مطالعہ اور اسکی زندگی کا ماضی اور مستقبل سے تعلق پیدا کرنا انگریزی ادب میں ایک جدید

اضافہ ہے۔ ورڈسورتھ کے زمانے اور اسکے بعد کے عہد نے شاعر کے مطمح نظر پر بہت گہرا اثر کیا، اور وہ زندگی کا اور ہی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے لگا۔

ورڈسورتھ کی نظم (Ode on Immortality) اس قسم کی بہترین نظم ہے جو اب تک انگلستان میں لکھی گئی۔ "معصوم" ٹیگور کے "لال" کا ہیرو ہے۔ اسکی زندگی کی طرف گیتان جلی میں بھی اشارات ہیں اور وہ چھوٹے قصوں میں بھی ایک نمایاں حصہ لیتا ہے۔ ٹیگور کے نزدیک معصوم ایک موہنی ہستی ہے۔ اگر کوئی اس کو بُرا کہے تو وہ برافروختہ ہو کر پوچھتا ہے۔

"کیا تم ماں کا ل کو اسلئے کہ اسنے اپنے چہرہ پر سیاہی پھینک لی ہے گندہ کہوگے؟"

وہ دنیا جس میں معصوم رہنا چاہتا ہے وہ عالم فطرت ہے اور جس غذا پر وہ جیتا ہے وہ تخیل ہے۔ چھوٹے بچے سڑک کی قندیلوں اور آسمان کے چمکتے تاروں میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ ٹیگور کا ننھا سورما، اس عالم کی سیر کرنا چاہتا ہے جسکی نسبت کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ وہ چاہتا ہے کہ سات سمندر پار کی سیر کر کے آئے۔ اس عالم میں مسرور ہے جہاں عقل و شعور کا پتہ نہو۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے انسانوں کے علاوہ دوسری طاقتوں سے بھی کچھ تعلق ہے۔

"دریا کی شریر پریوں کی آوازیں گویا اسکو اپنے گنگریا خانہ کی طرف بلاتی ہیں"۔

جان لینے والی موجیں! جو ہمارے لئے باعث وحشت ہیں چھوٹے بچوں کو اسطرح بے معنی لوریاں دیتی ہیں جیسے ماں جھولا جھلاتے وقت۔ شاعر کے نزدیک "معصوم" محبت کا مرادف ہے وہ اپنی ماں کیلئے آرام جان اور لخت جگر ہے۔ "لال" میں معصوم ماں سے اپنی پیدائش کے متعلق پوچھتا ہے جنکے جواب میں ماں کہتی ہے

تو میرے دل میں خواہش بنکر چھپا ہوا تھا۔۔۔۔۔ میرے بچپن کے کھیلوں میں تو میرا کھلونا تھا

۔۔۔۔۔ غیر فانی روحوں کے عالم میں تو وقت کے بحر میں پھرتا ہوا میرے ہاتھ لگا۔

جب میں تیرے چہرہ کو دیکھتی ہوں سب راز سربستہ افشا ہو جاتا ہے۔ تو جو سب کی ملکیت ہے میرا ہو گیا۔ اس ڈر سے کہ تو کھو نہ جائے میں تجھے اپنے سینہ سے لگائے رکھتی ہوں۔ کس طلسم نے کائنات کی بہترین نعمت مجھے سونپ دی ہے!

یہ عالم طفولیت کا ایک نرالا تصور رحانہ خیال ہے۔ شاعر کے نزدیک معصوم کا پیغام محبت ہے۔ وہ عالم انسانی کو نصیحت کرتا ہے کہ "معصوم" کی زندگی سے متاثر ہوں۔ یہ وہی خیال ہے جس کو دنیا کے ایک زبردست پیغمبر نے اسطرح ادا کیا ہے۔

"اگر تم معصوم نہ ہوگے تو بہشت میں داخل نہ ہوسکوگے۔"

عالم طفولیت کی شاعری ہند کی شاعری کا ایک خاص شعبہ ہے۔ زمانہ قدیم سے ہندوستان کی شاعری کا مبحث ننھے بچے کی زندگی کا مطالعہ رہا ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی قصوں میں سری کرشن جی کو بچے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور انکے طفلانہ رجحانات پر مختلف رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں۔ (باقی)

افضل حسین فاروقی

دوا معلوم!

وہ کریں گے علاج کیا معلوم	درد معلوم ہے، دوا معلوم
سُن کے افسانۂ محبت کو	کیوں وہ بُت بن گئے، خدا معلوم
کوئی ہوتی ہے فرطِ اُلفت میں	بیوفائی بھی ہے وفا معلوم
ہم نے کاٹی جنوں میں ساری عمر	نہوا کچھ بُرا بھلا معلوم
میرے کمبخت دردِ دل کی بھی	ہے کوئی آپ کو دوا معلوم
رہتے ہیں شوق سے مرے دل میں	اُن کو ہے خانۂ خدا معلوم
مغفرت کی دُعا بلند ہوئی	لب مینائی ہے صدا معلوم
کوئی آیا نہ کام مشکل میں	ہوگئے یار آشنا معلوم
زندگی کاٹے کوئی کٹتی ہے	حال اپنا کسی کو کیا معلوم

پوچھئے آپ کچھ نہ اصغر سے
ہوگیا راز ہوگیا معلوم

(اصغر)

شرحِ دیوانِ غالب پر ایک نظر

(۲۲)

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

ماحصل شرح یہ ہے "ہم داغ لے کے چلے اب تجھی باغ باغ ہونا مبارک ہو" اور اعتراض ہے کہ "گلستاں ہونا باغ باغ ہونے کی جگہ محاورے میں تصرف ہے" لیکن میں کہتا ہوں کہ زہت باغ حُسن سے فروغ حسن کیوں نہ مُراد لیں اور شعر کے معنے یوں کریں کہ "ہم تو داغ تمنا لے کر چلے اب تم اپنے حُسن کو بصد رنگ چمکاتے پھرو" اور اس کہنے کا منشا ہو طنز کرنا جیسے خواجہ وزیر کہتے ہیں سہ اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے + اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہوکر"۔ اسکے بعد محاورے میں تصرف کا اعتراض اُٹھ جاتا ہے اور کیا عجب ہے کہ شاعر کا یہی منشا ہو۔

(۲۳)

شب خمارِ شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورتخانۂ خمیازہ تھا

شرح "رات کو میرے شوق نے قیامت برپا کر رکھی تھی" شارح نے رستخیز اندازہ کے معنے رستخیز اندازہ کے لئے ہیں جس سے طالب لفظی مغالطے میں پڑ سکتا ہے۔ کہہ سکتے تھے کہ "خمار شوق بہ اندازہ رستخیز تھا" گر اس سے معنوں میں کوئی اختلال نہیں پیدا ہوتا۔ آگے فرماتے ہیں "اور شوق میں بے لطفی و بے مزگی جو تھی اسوجہ سے اُسے خمار سے تشبیہ دی، اور کہتا ہے یہاں سے لیکر دریائے بادہ تک میرے خمیازہ کا صورت خانہ بنا ہوا تھا" یہ

درحقیقت شارح نے نظم کی نثر بنائی ہے گر شوق میں بے مزگی وبے ربطی کا ہونا بے ربط سی بات ہے شوق کے لغوی معنے آرزومندی کے ہیں اور اردو میں اس محل پر زیادہ تر اشتیاق کہتے ہیں خمار شوق ساقی سے مراد میرے خیال میں ساقی کی یاد بحالت خمار ہے. صاف لفظوں میں اسطرح شرح کی جاسکتی تھی. "ساقی کے اشتیاق (یاد) کی جھانجھ (خمار) بہ قدر قیامت تھی (قیامت کا نمونہ تھی)... اس حالت (خمار) میں میں جو انگڑائیاں لیتا تھا (انکی لہریں) محیط بادہ (میخانہ) تک پہونچتی تھیں". اسکے بعد شارح نے جو شعر کا حاصل مطلب تحریر فرمایا ہے وہ بالکل درست ہے یعنے "غرض مصرع کی یہ ہے کہ انگڑائی لینے میں جو ہاتھ پاؤں پھیلتے تھے، وہ گویا شراب کو ڈھونڈھتے تھے".

یہ تو شعر کے ظاہری معنے ہیں جو مولانا مدظلہٗ نے بیان فرمائے. ہمنے جو اس شرح کے متعلق لفظی اختلاف کیا ہے وہ محض لفظی ہے مگر یہ شعر اشعار بلیغہ میں سے ہے. بلاغت کی تعریف یہی ہے کہ کوئی بیان اپنے سطحی معنوں کے علاوہ دوسرے عمیق معنے بھی رکھتا ہوا اسلئے اب اس شرح کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو حیدر میرٹھی نے فرمائی ہے لکھتے ہیں "شب جو رندوں کے سروں میں ساقی کے آنے کا خمار شوق بھرا ہوا تھا تو اس میں اندازہ رستخیز تھا یعنے غل اور چیخ پکار کہ ساقی آئے اور شراب پلاوے. ایسی حالت میں شراب خواہ جام میں تھی یا صراحی میں یا مینا میں یا خم میں یا حوض ترسا میں اسکے محیط یعنے اوپر کے خط میں (جہانتک شراب بھری رہتی ہے) خمیازہ کا عالم تھا، کیونکہ خط میں بہ اعتبار تمدد خمیازہ کی شکل ہوتی ہے. مطلب یہ ہے کہ شراب خانہ کی ہر شئے یہانتک کہ خود شراب بھی خمیازہ کش تھی کہ جبتک ساقی نہ آئے اس میں بھی کیف پیدا نہیں ہوسکتا. صورت خمیازہ نہیں کہا بلکہ صورت خانہ خمیازہ کہا ہے، یعنے ساقی کے شوق میں تمام شراب خانہ خمیازہ طلب کا ایک صورت خانہ بنا ہوا ہے" اس موقعہ پر ایک نکتہ عرض کردینا ضروری ہے. شاعر جب شعر موزوں کرتا ہے تو پہلے اسکی نظر اتنی گہری نہیں جاتی، وہ کسی واقعہ یا احساس یا تخیل سادہ کی بنا پر بسا اوقات ایک ہی مصرع موزوں کرتا ہے. بعد ازاں اسی کی مناسبت سے تکمیل یا توضیح کلام کیلئے اسپر دوسرا مصرع بہم پہنچاتا ہے. یہ اتفاقی امر ہوتا ہے کہ پہلی ہی تلاش میں بلاغت کا پہلو پیدا ہو جائے ورنہ فکر اوّل میں محض سامنے کا مضمون نظم کرتا ہے پھر نظر ثانی میں اگر شاعر معمولی درجہ کا شاعر ہے تو اسکی سعی صرف بندش الفاظ کی اصلاح تک محدود رہتی ہے لیکن اگر وہ جید شاعر ہے تو الفاظ کے ردوبدل اور بندش کے الٹ پھیر سے صوری و معنوی تکلفات پیدا کرنے کی

کوشش کرتا ہے جس سے شعر میں بلاغت پیدا ہوتی ہے۔ مرزا غالب کا یہ شعر اسی نوعیت کا ہے۔ اور شاعر کا پہلا خیال وہی پایا جاتا ہے جو علامۂ طباطبائی نے بیان کیا ہے۔ دوسرے معنے ممکن ہے کہ شاعر نے خود پہلے فکر کے الفاظ میں رد و بدل کر کے داخل کئے ہوں یا ممکن ہے کہ شعر پہلی ہی فکر میں بصورت کذائی نظم ہو گیا ہو اور شارح کی نظر متجسس نے اس میں ان معانی بعیدہ کا پتہ لگا لیا ہو۔

(۲۴)

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے

خانۂ مجنونِ صحرا گرد۔ بے دروازہ تھا

شرح فرمائی ہے "مجنوں کا گھر تو صحرا ہے اور صحرا وہ گھر ہے جس میں دروازہ نہیں۔ پھر کیوں نہیں وحشی ہو کر اسکے پاس چلی آتی کون اُسے مانع ہے"۔ یہ شرح بعینہٖ نظم کی نثر ہے اور بظاہر اس میں کوئی اُلجھن نہیں نظر آتی۔ مگر پھر بھی متن و شرح نظر غائر چاہتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مصرعۂ اولیٰ میں فعل بزمانہ حال ہے اور مصرعۂ ثانی میں بزمانۂ ماضی اور ازمنۂ فعل کے اختلاف نے بیان میں ناگوار بے ربطی پیدا کر دی ہے۔ اسی مضمون کو ناصر علی سرہندی فرماتے ہیں ؎

امتیاز شہر و صحرا داشت از نقصِ جنوں ورنہ مجنوں را خرابی ہائے خود ویرانہ بود

شاید ناصر علی ہی کے شعر سے غالب کے شعر کو ماخوذ خیال کر کے حضرت شوکت میرٹھی نے وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کو وحشت خرابی ہائے لیلیٰ بنایا ہے اور شرح یوں فرمائی ہے: "مجنوں کو خیال ہے کہ خدا جانے لیلیٰ میرے گھر کس وقت آ نکلتی ہو پس وہ انتظار میں گھر سے باہر نہیں نکلتا، ورنہ وہ غریب تو صحرا نورد ہے اور اس کا گھر بے دروازہ ہے پس اے خرابی ہائے لیلیٰ بجز تمھارے مجنوں کی وحشت کا مانع نہیں، یہ دقتیں تمھاری ہی ڈالی ہوئی ہیں"۔ اس شرح کی نسبت بجز اسکے کیا کہا جائے کہ جو مطلب آپ سمجھے ہیں خدا کرے کوئی اور یہ مطلب نہ سمجھے۔

(۲۵)

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن دست مرہون حنا، رخسار رہن غازہ تھا

شرح ہے کہ حسن کو باوجود استغنا ایسی احتیاج ہے کہ ہاتھ حنا کی طرف اور منہ غازہ کی طرف پھیلائے ہوئے ہے" لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر یہی مطلب ہے تو کیا کسی کی طرف ہاتھ پھیلانا اور منہ پسارنا ہی شانِ استغنا ہے؟ اگر واقعی حسن مستغنی تھا تو اس کو مرہونِ حنا اور رہنِ غازہ ہونے کی حاجت ہی کیا تھی؟ یہ اجتماعِ نقیضین کیا معنے رکھتا ہے کہ محتاج بھی ہے اور مستغنی بھی؟ پھر اوپر سے طرہ تفاخر انداز استغنا کی رسوائی! میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ حالانکہ شارح نے باوجود کا لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ البتہ اگر بجائے انداز استغنا کے ادعائے استغنا ہوتا، تو معنے ٹھیک بیٹھتے، اسلئے کہ ادعا جھوٹے دعوے کو کہتے ہیں اور غالباً یہی مدعائے شاعر ہوگا لیکن وزن شعر کی تنگی سے لفظ ادعا نہ آسکا۔ فتدبر۔

(۲۶)

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

شارح علامہ تحریر فرماتے ہیں کہ "بباد دادن فارسی کا محاورہ ہے اردو میں برباد کرنا کہتے ہیں۔ یہ اعتراض بالکل درست ہے لیکن غالب نے فارسی کا بباد دادن کہا ہے اردو کا برباد کرنا نہیں کہا ہے اسلئے بباد کرنا بھی اردو محاورہ نہیں ہے لیکن اصل اعتراض جو اس شعر پر وارد ہوتا ہے اور جس میں علامہ مدظلہ نے معنے سمجھائے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ جبکہ اوراق لختِ دل کا دیوان بے شیرازہ نالہ کی یادگار تھا تو خود نالہ نے اس کو کسطرح برباد کر دیا؟ یہ ایک معما ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ شارح کا نالہ کو شاعر اور اوراق لخت دل کو اس کا دیوان کہنا کسقدر ناموزوں تاویل ہے۔ اسلئے کہ جب نالہ کو اسی شعر میں ہوائے تند یعنی کسی شے کو اڑا دینے والی ہوا فرض کر لیا ہے تو پھر وہی باد تند ایک وقت میں اوراق لخت دل کی جامع و مدون کسطرح قرار پا سکتی ہے۔ البتہ ممکن ہے کہ غالب نے دوسرے مصرعہ میں یادگار عشق کہا ہو اور کاتب نے اسپر اصلاح دیکر نالہ بنا دیا ہو۔

نوٹ اس مضمون کے لکھنے کے کچھ دنوں بعد مجھے دیوان غالب کا جدید نسخہ حمیدیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں اس شعر کا قبل نظر ثانی مصنف اسطرح ہونا بتایا گیا ہے ؎

دیدۂ تر نے دیئے اوراق لخت دل بآب — یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

اگر یہ شعر اسی حالت سے رہتا تو اسکے باسمنے ہونے میں کوئی کلام نہ ہوتا لیکن نظر ثانی میں مصنف نے پہلے مصرعہ کی اصلاح کر کے اس صورت میں کر دیا جسطرح اب متعارف نسخۂ دیوان غالب میں پایا جاتا ہے یعنے "نالۂ دل نے دے اوراق لخت دل بباد الخ۔ آپ کہیں گے کہ غالب نے ایسا کیوں کیا؟ اسکی وجہ مجھ سے سنئے۔ جسطرح مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ "بباد دینا اردو کا محاورہ نہیں بلکہ بر باد کرنا ہے"۔ اسیطرح فارسی گو غالب کو نظر ثانی کے وقت محسوس ہوا ہوگا کہ" اوراق برآب دادن فارسی کا محاورہ نہیں ہے بلکہ بہ آب انداختن ہے"۔ مصرعہ میں انداختن کی گنجایش نہ تھی شاعر نے محاورے کی غلطی دور کرنے کو پورا مصرعہ بدل کر یوں کر دیا "نالۂ دل نے دیئے اوراق لخت دل بہ باد۔ اب یہ مصرع تو درست ہو گیا لیکن دوسرے مصرعہ سے نالہ کا لفظ نکال دینے کا خیال نہ آیا اور وہ جوں کا توں باقی رہگیا۔ محاورے کی اصلاح میں معانی کی حجامت بن گئی مگر کیا اس سے غالب کے کمال پر کوئی حرف آتا ہے۔ نہیں محض سہو نظر ہے اور بشریت کا مقتضا۔

(۲۷)

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد ہمنے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

شرح:۔ ہمیں تو غم کھانے کا مزہ پڑا ہوا ہے اور وہی یہاں نہیں یعنے اس شہر میں ایسے معشوق نہیں جن سے محبت کیجئے"۔ بظاہر الفاظ شعر کے یہی معنے ہیں، لیکن در اصل مقصود شاعر اپنے شہر کی تباہی کا ذکر کرنا ہے اور قحط غم الفت کا ذکر محض بیان شاعرانہ ہے۔ اور "شعر غالب حدیث سعدی ہے"۔ ع

چناں قحط افتادہ اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

لیکن سچ یہ ہے کہ غالب کا شعر سعدی کے شعر کو نہیں پہونچتا۔ سعدی کے پاس چناں کا لفظ حقیقت کا ایسا نقشہ کھینچ رہا ہے کہ باید وشاید پھر یاروں کے ساتھ۔ کہتا ہے کہ دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ اور تو اور عشق باز عشق کرنا بھول گئے۔

ضامن کنتوری

یادِ ایام

(۲)

میں فسٹ ایر میں داخل ہوا اور ایک سال تک اگرچہ بہت پڑھنے والا تھا کبھی کتاب کو ہاتھ نہ لگایا۔ سارا کالج میرا دوست بنا۔ سب سے صاحب سلامت تھی۔ سب کی عادت سے کم و بیش شناسائی تھی۔ پڑھنا کہاں کا۔ اب نئی اُمنگوں نے سر نکالا تھا، نئے ولولے تھے، نئی دنیا میں داخل ہو رہا تھا۔ ادھر شوکت صاحب ہر دم اس خیال میں لگے رہتے تھے کہ مجھے اپنے کام کا بنالیں۔ وہ ہر دم تاک میں تھے۔ جمعہ کے دن کرکٹ تھا شوکت صاحب فٹ بال فیلڈ کے باہر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جناب مارسین صاحب و مسٹر ارنلڈ صاحب بھی کھیل میں شریک تھے۔ جناب مارسین صاحب شروع سے ایک پدرانہ شفقت سے مجھ پر عنایت فرما اور میرے حال و مستقبل کے نگراں تھے۔ کھیل میں اتفاقاً مارسین صاحب کا مقابلہ ہو گیا۔ ایک منٹ میں انھوں نے مجھے زمین پر چت گرا دیا۔ میں روزمرہ کے لباس میں پاجامہ پہنے کھیل رہا تھا۔ گرنا بلا ہو گیا۔ شوکت صاحب اُچھلے کودے، تالی بجانی شروع کر دی، اور شور مچانے لگے کہ "کابلی پاجامہ گر گیا"۔ انھوں نے جلد ہی اسکو کھینچ تان راگ کی صورت میں موزوں بنا کر سڑک پر، بچی اور اچی بارک میں، ڈائننگ حال میں، غرض کہ سب جگہ جہاں مجھ کو دیکھتے یہی الاپنا شروع کر دیا کہ "کابلی پاجامہ گر گیا"۔ میری یہ ضد کہ انگریزی لباس اور نیکر نہیں پہنیں گے، ادھر شوکت صاحب کی ضد کہ پہنا کر چھوڑیں گے۔ ادھر نئے ولولے، لیکن اپنی جسمانی کمزوریاں محسوس کر کے میدان تنگ پاتا تھا، غرضکہ کھیل وغیرہ کا جو تھوڑا سا شغل تھا وہ بھی جاتا رہا۔

چند روز بعد کالج میں کھیل شروع ہوئے۔ سید عبدالحفیظ، محمد زماں خاں (ای۔ اے۔ سی سیالکوٹ)

حاجی محمد خاں (ڈی ایس پی)، لارڈ حامد صاحب وغیرہ کی بن آئی تھی۔ انکی ہر دلعزیزی انکی آزادی دیکھ کر میرا دل للچا گیا کہ میں ایسا مضبوط اور آزاد کیوں نہیں۔ وسوال پیش ہوا کہ کیونکر بن سکوں؟ دیوانگی کے پھندے میں آ گیا۔ بیچارگی کا سماں تھا۔ کچھ بن نہ آتی تھی۔ اسی خیال سے سب سے الگ رہنا شروع کیا۔ یہانتک کہ پڑھائی بھی چھٹ گئی۔ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ ہر جگہ کی بیقدری سے عاجز تھا۔ نہ ماسٹر پوچھتے نہ کھیلنے والے مجھ سے بات کرتے۔ ہر جگہ حقیر تھا۔ میری کوئی شخصیت نہ تھی۔ میری حالت روز بروز ابتر ہونے لگی۔ غذا بھی کم ہو گئی۔ راتوں قلعہ کے ویرانہ میں جا کر قبرستان میں بیٹھا رہتا، یا اسکی فصیل پر آدھی رات تنہا جا بیٹھتا یا اسکے تاریک کنوے کے پاس بیٹھا ہوتا۔ دیوانگی کا نقشہ جم گیا لیکن مسئلہ حل نہ ہوا۔

مولوی عباس حسین صاحب پروفیسر فارسی میری حال پر اکثر مہربان رہے۔ انکے پاس معالجہ کی غرض سے گیا۔ دسمبر کے ایام میں رات کے ٹھنڈے پانی سے صبح کو نہاتا لیکن دیوانگی روزافزوں تھی۔ یہاں تک کہ مسٹر ارسین کو میری حالت دیکھ کر خیال پیدا ہوا اور انھوں نے ڈاکٹر رابرٹ میڈیکل افسر کالج کو میری بابت لکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مرض ہاپوکانڈریا بتایا۔ اب ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب اور نعیم الدینخاں کے حوالے ہو گیا۔ ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب کی دوستی میں اچھا کھانا ملنے کی امید ہو گئی۔ وہ ہر روز نئی غذا کبھی کباب اور پلاؤ، کبھی زردہ اور بھونا وغیرہ لکھ دیتے۔ منشی اطاعت کرتا۔ کھانا تو بہت اچھا ملنا شروع ہوا لیکن جھینگو کے آخر میں بل دیکھ کر حواس جاتے رہے۔ آخرش ڈاکٹر صاحب کی عنایات سے دست بردار ہو کر دلیئے پر گذارا کرتا رہا۔

راتوں کو اکثر کرکٹ کے میدان میں جا کر دوڑنے کی کوشش کرتا لیکن سب کچھ عبث تھا۔ دل پریشان اور سب سے متنفر۔ سچ یہ ہے کہ میں اپنی حالت اور اپنے آپ سے بیزار تھا۔ سید عبدالحفیظ اور محمد امین ہمیشہ میری حرکات سے باخبر رہتے۔ اسی حالت میں ایکسال گذر گیا اور ایکبار اور پھر امتحان ایف اے میں فارسی میں ناکام ہوا۔ مرے کو مارے شاہ مدار۔ میں فارسی کو مادری زبان خیال کرتا تھا اور کبھی کورس دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ این ہم سنم رفت۔

ایک شام کو میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ڈائننگ ہال میں گیا مگر کھانے کو طبیعت نہ چاہی۔

سید عبدالحفیظ نے بہت پکڑا۔ اسکن کھانا نہ کھایا گیا، اور کمرے پر آگیا۔ وہاں محمد امین صاحب موجود تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد انھوں نے ایک سچی ہمدردانہ آواز میں مجھ سے کہا کہ بھائی تمھاری حالت سے میں ڈر رہا ہوں۔ جرأت نہیں کرسکتا۔ معاملہ کیا ہے بتاؤ؟ انکے اس کہنے نے بڑا اثر کیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ آخرش چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپائے میں چند منٹ تو بیٹھا رہا، مگر تھوڑی دیر کے بعد قلعہ کی راہ لی۔ میں نے ٹھان لیا تھا کہ تحت یا تختہ۔ مسجد والے گیٹ سے باہر نکلا تو ٹرین کے آنے کی آواز آئی۔ میں دیوانگی میں اس کو دیکھنے کیلئے زور سے بھاگا۔ میں نے پھاٹک پر ٹرین کو جالیا۔ میرے بعد سید عبدالحفیظ میری جستجو پر میرے کمرے میں پھر آئے۔ کمرہ میں یہ واقعہ سنکر وہ جلدی جلدی میرے پیچھے آئے اور اسوقت جبکہ میں پھاٹک پر سوار گذرتی ہوئی ٹرین کو دیکھ رہا تھا، انھوں نے میری ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیا۔ ٹرین گذر چکی تھی۔ ہم دونوں قلعہ کی طرف چلے۔ عبدالحفیظ نے مجھسے کہنا شروع کیا کہ بھائی سچ بتاؤ تمھیں کیا فکر ہے؟ میں نے سوال کو کاٹ کرا نسے کہا آؤ قلعہ تک دوڑیں۔ ہم دوڑے تو میں نے محسوس کیا کہ میں کالج کے اعلیٰ ترین دوڑنے والے سے بہت زیادہ کمزور نہیں ہوں۔ قلعہ پر پہنچکر وہ بھی میری دیوانگی میں شامل تھے۔ فصیل پر بیٹھے، کنوے پر گئے، ادھر گئے ادھر گئے۔ آخرش میں نے عبدالحفیظ سے کہا کہ سچے بھائی تمہاری ہمدردی کا ممنون، معاملہ کچھ بھی نہیں۔ موت وحیات کا سوال تھا۔ وہ مرحلہ طے ہوگیا۔ چلو واپس چلیں۔

بارہ بج چکے تھے۔ بنگلے کے کمرے میں آئے تو محمد امین صاحب کو منتظر پایا۔ مجھ کو واپس دیکھ کر وہ خوش ہوئے اور شوق سے اُٹھے اور کہا کہ چائے پی جائیگی۔ فوراً سماوار میں آگ ڈال میز پر چائے کا سامان سجا، سماوار پاس رکھکر حقہ کی سٹک ہاتھ میں لیکر سامنے کرسی پر بیٹھکر مسکراہٹ سے پوچھا کہ اب تو تم بشاش ہو ماجرا کیا ہے؟ میں نے کہا کہ آپکا اور بھائی حفیظ کا نہایت ممنون ہوں۔ خدا نے کیا تو ایک دن عرض کرونگا۔

(نوٹ ۱۹۰۵ء میں جب میں الہ آباد سے یونی ورسٹی ٹورنمینٹ کے مائیل ریس Race کا اول تمغہ حاصل کرکے واپس آیا، اور چائے کا دور چلا تو میں نے تمغا محمد امین صاحب کے آگے رکھ کر کہا کہ یہی ماجرا بیان کرنیکا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا)

غرضکہ سخت یا سخت کا سوال حل کرنے کیلئے مُصمم ارادہ کرلیا کہ جو کام دوسرے کرسکتے ہیں میں بھی کرسکتا ہوں میں بھی دوسرے بن سکتے اور دوڑنے والوں کی طرح بہترین انعامات حاصل کرسکتا ہوں۔ میں نے ورزش کے متعلق کتابوں کو پڑھنا شروع کیا اور اپنے آپ کو ٹرین (Train) کرنے کی کوشش کی۔ اپنی نیند اپنا کام اپنی ورزش اپنے خورونوش اور اپنی جسمانی مالش کو باقاعدہ شروع کردیا۔ تھوڑے عرصہ بعد کالج کی تعطیلوں میں گھر آیا۔ یہاں آ کر صبح تین بجے مختلف قسم کی ورزش مثل کودنا، دوڑنا وغیرہ شروع کیا (Friction Towels) مالش کرنے کے سخت و درشت تولیے نے بہت جلدی ہی میرے جسم کو میرے قابو میں کردیا۔ مجھے دوڑنا تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا۔ تعطیلوں بعد کالج پہنچا۔ اور باقاعدہ فٹ بال میں شامل ہونے لگا فٹبال کھیلنے کے بعد فٹبال فیلڈ کا ایک چکر لگاتا اور صبح کو میرے عزیز دوست نواب غلام محمد خاں صاحب اپنے گھوڑے پر سوار آتے تو قلعہ کو جاتے ہوئے اور واپسی میں انکے ہمراہ دوڑتا چلا جاتا (باقی)

---

(۱)

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

سنو بھیّا! تمھیں اس تصور کی قسم جسنے تمھیں حقۂ تازہ کرنیکی زحمت سے ہمیشہ بے نیاز رکھا، سچ کہو کہ یہہ شعر کس کا ہے؟ میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ محمد اقبال کا نہیں۔ لاریب ان کے شعر تو شعر ایک ایک جملہ کی ترکیب پچیس برس سے حفظ کئے ہوئے ہیں۔ اچھا انھیں سے پوچھو کہ یہہ شعر کسکا ہے؟ سر محمد اقبال کا؟ ڈاکٹر اقبال کا؟ یا اقبال کا؟ وہ بے تاشہ کہیں گے کہ اقبال کا! کیا معنی کہ یہہ شعر انھوں نے اسوقت حفظ کرلیا تھا جب وہ اسکول میں تھے اور ہم بھی اسکول میں۔ یہہ وہ زمانہ ہے جب نہ سر محمد اقبال، سر محمد اقبال تھے اور نہ ڈاکٹر اقبال پیدا ہوئے

لـه تم میرے حقہ کے ہمیشہ دشمن رہے اور ہمیشہ اس سے بیزار رہے کیونکہ شاید یہہ اسکا بدلہ ہے کہ تمھاری مٹی بھی تو نہیں اسکے بہت کام آئی ہی۔

تصور کریں کہ ہم اور حیات وہ نہیں ہیں جو ہیں اور گردشِ ایام ہے کہ پیچھے کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے حتیٰ کہ لارڈ کرزن ہندوستان کی گورنر جنرلی اور ماریسن صاحب علی گڈھ کی پرنسپلی پر نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کی شخصیت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ گردشِ ایام کی پیچھے کی دوڑ رک جاتی ہے اور جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ہم پہلی پہل اٹاوہ سے علی گڈھ کو روانہ ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے جو پہلا سبق ہمنے پڑھا تھا یا یوں کہئے کہ تجربے کی بنا پر ہمیں جو محسوس ہوا تھا وہ یہ تھا کہ فٹ بال اور کرکٹ کپتان بڑی ہستیاں ہوا کرتی ہیں۔ انسے بڑھکر کالج میں دوسرا نہیں ہوتا۔ انکی قابلیت کا ہم پر اتنا رعب تھا کہ جب سید علی حسن صاحب کی بی۔ اے میں فیل ہونیکی افواہ (جو بالکل خلافِ واقعہ تھی مشہور ہوئی)، تو ہم نے کہا کہ کپتان صاحب کیا فیل ہو سکتے ہیں، وہ خود ایک سال کپتانی کرنے کے واسطے فیل ہو گئے ہیں۔ چونکہ وہ ہمیں کھیلنے کو کرکٹ کی خراب شدہ گیندیں دیدیا کرتے تھے، اور ہم چھوٹے لڑکے کھرنیوں کے درختوں کے نیچے سڑک پر خوب کھیلا کرتے تھے، اسلئے ہر بچے کی زبان پر یہی الفاظ پڑھ گئے، اور شدہ شدہ یہ خبر تیرہ تمیز تک پہونچی چند روز بعد اس عقیدہ کا صلہ ہمیں چار وکٹ کی شکل میں عطا ہوا، اور ہم لوگ کمرے سے درخت کی تلاش میں دور جانیکی زحمت سے بچ گئے۔ علی گڈھ میں رہتے رہتے جب کچھ شعور آیا، تو ایک بڑا راز ہم پر یہ کھلا، کہ قوم کی لیڈری بلا سر سید کی قبر کی جاروب کشی کے حاصل نہیں ہوتی، اور قوم میں امتیازی درجہ حاصل کرنے اور لاٹ صاحب تک پہونچنے کا موقع کالج کا ٹرسٹی بنے بغیر مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ لیگ کا تو وجود بھی نہ تھا اور کانگریسی مسلمانوں کے نمائندے نہ قوم کی نظر میں تھے، نہ گورنمنٹ کی۔ غرضکہ مسلمانوں کی موت و زندگی وابستہ تھی علیگڈھ موومنٹ Movement سے۔ افرادِ قوم کو علیگڈھ کے حلقے میں شریک ہونیکی کوشش کرتے ہوئے ہمنے بڑے بڑوں کو دیکھا ہے۔ قوم میں علیگڈھ والوں کی ایک خاص عزت تھی، اور ملک و حکومت علیگڈھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی علیگڈھ کا طالب علم خواہ اسکول کا ہو یا کالج کا جب دوسری درسگاہ میں جاتا تھا، تو پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ہم ہی ایک نہیں بلکہ یہہ دن کرکٹ ٹیم کی جان شفقت نے بھی دیکھا ہے۔ محمود اور رضا نے بھی یہہ بہار دیکھی ہے۔ جن قابلیت کا سہرا مصطفےٰ حسین صاحب جن کو انکے ہم عمر منا کے نام سے یاد

کرتے ہیں، کے سر پر بھی باندھا گیا ہے۔ اسکول سے جانیکی شان لطف احمد، تبارک منظور، نواب (ہائے کس جوانمرگ کی یاد آگئی) نے دیکھی ہے۔ جہاں جاتے تھے اس مدرسگاہ میں شور مچ جاتا تھا۔ طالب علمی کا ہے کو تھی اسکول اور کالج پر حکومت کرتے تھے اور ہم تھے کہ جہاں بن باسیت کا زمانہ ختم ہوا پھر علی گڈھ داخل ہو، اسپی پر میر ولایت حسین صاحب جس محبت سے ہیں پھر داخل کرتے تھے اُس کا مزا کچھ وہی جانتے ہیں۔ یاد ایس آنیوالے غریب۔ یہہ تو جملہ معترضہ تھا اب سمجھ لیجئے کہ ہم ۱۹۲۸ میں نہیں ہیں، بلکہ سنہ ۱۹۰۱ شروع ہوا ہے۔

کرکٹ نہایت زوروں پر ہے۔ پویلین (Pavalion) تیار ہو چکا ہے لیکن سامنے کی لان اتنی وسیع نہیں ہے، اور نہ اسپریٹنگ کا بوجھ ڈالکر سبزے کی قدرتی سبزی کو مٹنے کا خیال کھیلنے والوں کے دل و دماغ میں اسوقت آیا تھا۔ کلن کے سپرد کرکٹ کا سامان تھا اور جسطرح کہ اُسکے صاحب کل کالج کے کپتان یعنے فرسٹ الیون کے کپتان تھی اسیطرح یہہ بورڈنگ ہوس کے ملازمین کا کپتان تھا چونکہ اسکے صاحب بھی بولر تھے لہذا یہہ بھی چھٹی کا وقت بول بننے میں صرف کرکے بولر بنگیا تھا۔ اسکے بعد اس کا جانشین ممتاز جو شروع میں مرزا محمود بیگ صاحب کے پاس ملازم تھا کرکٹ کلب کا ملازم ہوکر ملازمین کے ٹیم کا کپتان بنا، اور اکثر اپنی ٹیم کو شہر کے باہر بھی لے گیا۔ نہ معلوم اب یہہ سلسلہ ملازمین کی ٹیم کا جاری ہے یا بند ہوگیا۔ لان کے شمال جنوب وسیع میدان تھا۔ شمال کیطرف مسجد کے دیوار کے پیچھے اکثر تھرڈ الیون و کالج الیون کو میچ کھیلنے کا موقع دیدیا جاتا تھا۔ شمال میں آگے چلکر ایک سمت ہٹا ہوا، رائے ڈنگ (Riding) اسکول تھا اور باقی اللہ کا نام نہ اسطرف اردو ہندی کے معرکوں کا نتیجہ میکڈانل بورڈنگ ہوس منجر کا وہم و گمان تھا اور نہ Swimming سوئمنگ باتھ (Bath) اور دوسری بورڈنگوں کی تیاری کا کسی کے دماغ میں خیال آتا تھا۔ البتہ کالج کی چار دیواری کے قریب دھونی رما کر بیٹھنے کا خیال صاحبزادے صاحب کے دل میں ضرور تھا، جسکو آج آپ سڑک اس پار آفتاب منزل کی شان و شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ اللہ جانے اُنھی دیکھا دیکھی یا خود بخود جعفر منزل بناکر علی گڈھی ہو جانا سید جعفر حسین صاحب انجنیر کو بھی پسند آیا اور چند سال بعد اُنھوں نے کھڑی چارپائی پر بیٹھ، عینک لگا، اپنے بنگلے کا ہی نہیں، بلکہ کالج کے اکثر بورڈنگ ہوسوں کا نقشہ بنانا شروع کردیا۔

آئیے اب ذرا سید احمد خانی بستی میں اللہ کے گھر کی سیر کیجئے جب ہم علی گڈھ پہنچے تو مسجد کی پچھلی دیوار

اور بیچ کا گنبد تیار تھا۔ اسکے متعلق علی رضا بلگرامی صاحب سے (جو ہم سے عمر میں خاصے بڑے ہیں مگر سکنڈ ایر میں پہونچکر جب ہم اور وہ ہم سبق ہوے تو کچھ انھوں نے اپنی عمر گھٹا دی کچھ ہم نے اپنی عمر بڑھا دی) یہہ روایت معلوم ہوئی کہ سرسید کا خیال دو مسجدیں بنانے کا تھا، مگر انکے چچا نواب عمادالملک مرحوم نے اس خیال کی سخت مخالفت کی، اور صرف ایک ہی مسجد بنانا قرار پایا، جہاں سُنی شیعہ دونوں نمازیں پڑھیں۔ چونکہ جنگ بلقان تک یا اگر آپ زیادہ صحت چاہتے ہیں تو نواب وقارالملک کی آمد آمد تک نماز روزے کوئی زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے، ہم نے اس معاملے کے معلوم کرنیکی فکر نہ کی۔ دوسری روایت ہمارے عزیز دوست مرزا شبیر بیگ صاحب نے جو اب نواب شبیر یار جنگ ہیں، مسجد کے دیوار کی طرف ہاتھ اٹھا کر یوں سُنائی کہ دیکھو ابی آنؔ کے ہٹ یہاں آکر پڑی تھی سرسید اور محمود کے مقبرے بن چکے تھے اور نئی بارگ کی طرف مولوی عبداللہ صاحب کے رہنے کا کمرہ موجود تھا۔ وسیع صحن میں برسوں اینٹوں کا انبار لگا رہا، اور یہہ سلسلہ نئے بارگ کے سامنے تک چلا گیا تھا اگرچہ یہہ انبار آنے جانیوالوں کو ناگوار گذرتا ہو لیکن اسکی توقیر اب بیچارے وارفتہ باستطار ویدار سے پوچھیے جس کا کام پڑھنا لکھنا چھوڑ محض اسی پر بیٹھے رہنا تھا نماز کی حاضری کم سے کم دو مرتبہ لازمی تھی، اور کالج و اسکول سے قبل آدھ گھنٹہ دینیات کا درس ضروری تھا۔ رجسٹر ایک مانیٹر کے سپرد تھا، اور حاضری و غیر حاضری میں، اگرچہ انکے الطاف و کرم کو بہت دخل تھا لیکن پریفکٹ مانیٹر بس پریفکٹ مانیٹر ہی تھا۔ مانیٹری کی شان آگے چلکر بھائی ناظر نے قائم کی، اور بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیئے چونکہ یہہ مدتوں ہمارے کلاس فیلو رہے ہیں اسلئے انکو بھائی لکھا ہے۔ ناظرین کرام یاد رکھیں کہ علی گڈھی زبان میں بھائی۔ برادر۔ بڑے بھائی۔ چھوٹے بھائی علحدہ علحدہ معنی رکھتے ہیں اور بھیا ایک آرڈر آف میرٹ (Order of Merit) ہے جو قسمت والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ القصہ مسجد کی تعمیر اکثر شروع ہوی اور بند ہوی اور یہہ قصہ امیر کابل کی تشریف آوری تک چلتا رہا۔

سوائے اسٹریچی ہال کے دوسرے شاندار کمرے تیار نہ ہوے تھے اور اسکے دونوں طرف سے دو چھوٹے چھوٹے راستے پکی بارگ سے کچی بارگ میں جا نکلے تھے۔ مشرق کی طرف ـــــ اسٹریچی ہال کی عمارت کو کے سلسلے میں ہی، ایک کوٹھری تھی، جس میں کرکٹ کا سامان رہتا تھا۔ کالج کلاسس کے قریب اسی لائن میں

صرف مہدی منزل مکمل ہو چکی تھی، جس میں نواب محسن الملک کا دفتر تھا، اور سجاد حیدر صاحب انکی پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ پکی بارگ کے پہلے نمبر میں مارین صاحب کا دفتر تھا، اور انکے بعد دوسرے کمرے میں ریسر صاحب کا دفتر۔ پکی بارگ اُدھر سے سڑگیٹ کے تیار ہو چکی تھی۔ گیٹ کی دوسری طرف صرف ایک دو کمرے تیار ہوئے تھے۔ تعمیر جاری تھی، اور دیوار اتنی اونچی نہ تھی کہ لڑکے کود کر راتوں کو سامنے والے آم کے باغ میں دست درازی نہ کر سکیں۔ دو تین سال میں یہ لائن پکی ہو کر نئی بارگ سے جا ملی اور نئے بارگ کے پاخانوں پر جہاں اب انکلاسس کی تعلیم دیکر ایل ایل۔ بی نکالے جاتے ہیں، اس سے کی پکی بارگ والوں نے اپنا قبضہ بھی شروع کیا۔

نئے بارگ اگرچہ اپنے آغوش میں زیادہ بچے نہیں، لیکن، اُسنے وقتاً فوقتاً ہر قماش کے اہل فن نکالے ہیں۔ آنکھ والے، زباں والے، بھنے والے، بنانے والے، پڑھیدڑے، کھلنڈرے، گانے والے گگن گنانے والے، اور تواور اللہ رسول والے سب طرح کے لوگ ان کمروں میں نظر آئیں گے۔ انہیں سے کوئی ڈپٹی ہوا کوئی مصنّف۔ کوئی وکیل، کوئی قومی درسگاہ کا ہیڈ ماسٹر، کوئی بیرسٹر، کوئی پی۔ ایچ۔ ڈی، کوئی پرنسپل، ایک تھانہ دار، اور رودولی والے صاحب تحصیلدار۔ خوب یاد آیا جو صاحب ہمارے فیاض پریسیڈنٹ نواب سر محمد فیاض علی خاں مرحوم کے پرائیوٹ سکرٹری ہوئے، وہ بھی بفضل الٰہی نئے بارگ الوں ہی سے تھے۔

چشم فلک کی نظروں میں یہ عمارت کالج کی بڑھتی ہوئی شان دیکھ کر کچھ ایسے کھٹکی، کہ پھاوڑے چلوا دیئے ورنہ یہ بارگ تو بارگ اسکے کچے پاخانے کالج کی تاریخ میں وہ اہمیت رکھتے ہیں کہ آثار قدیمہ نہیں تو، روایات قدیمہ کو قائم رکھنے کیلئے، محفوظ کرنیکے قابل تھے۔ اسکی دیواروں پر مشق کرتے کرتے بہت سے کہنہ مشق شاعر اور مضمون نگار ہی نہیں، بلکہ ایک ایڈیٹر بھی نکلے ہیں۔ انھیں میں سے ایک دروازہ باہر جانے کو تھا جو شام ہی سے مقفل کر دیا جاتا تھا، اور اسکے ساتھ ہی ساتھ مسجد والا گیٹ بھی بند ہو جاتا تھا۔ آمد و رفت صرف صدر گیٹ سے رہجاتی تھی، اور وہ بھی کھڑکی ہو کر، جہاں سے نو بجے کے بعد بغیر رجسٹر پر دستخط کیئے ہوئے آنا جانا کارے دارد تھا۔ ایک ایک کر کے آؤ جاؤ یا دس دس کر کے خان ایسا ہوشیار تھا کہ

دستخط کرائے بغیر کھڑکی سے نکلنے ہی نہ دیتا تھا۔ ذات کا پٹھان اسپر ہارسین صاحب کا منہ چڑھا۔ وہی مثل کہ کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔ بی۔اے۔ ایم۔اے والے تو کجا سب پراکٹروں کی نہ مانتا تھا۔ اسکول بورڈنگ میں صرف ظہور وارڈ، اور ہارسین کورٹ (مذکورہ) جسے ڈبنچر کہا کرتے تھے۔ چند بنگلے اسکول کے سامنے اور کچھ یونین کی پیچھے تھے، جن میں ہندو طلباء، مدرسین ماسٹر، دفتری لوگ رہتے تھے۔ انھیں میں سے کسی بنگلے کے ایک کمرے میں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ڈی۔ایس۔سی کے امتحان کی تیاری میں مشغول رہا کرتے تھے۔ یونین کے سامنے چھوٹی سی لان مہندی کی جھاڑی سے گھری ہوئی تھی۔ یہاں ٹینس ہوا کرتی تھی۔ عام طور سے کالج کے طلباء میں اس کا رواج نہ تھا۔ جو لڑکے کرکٹ اور فٹ بال نہ کھیلتے اکثر کمرے کے سامنے چارپائی کھڑی کر کے ٹینس کا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔ ٹینس کھیلنے والوں میں پروفیسر ابوالحسن صاحب کا بہت زور تھا۔ سال میں ایکدفعہ نواب نذیر جنگ بہادر حیدرآباد سے علی گڈھ جایا کرتے تھے، اور پروفیسر صاحب کو سیٹ اور وہیں نمائش کے خرچ کو اشرفی دیا کرتے تھے، جو نمائش کے پراٹھے کباب کے نذر ہو جاتی تھی۔ کالج کے خوانچے والوں پر اس اشرفی کے "ضرب" چھینوں پڑتی تھی، اور مزے سے قرضے پر کاروبار چلتا تھا۔ مسٹر براون اور مسٹر کارنا حال ہی حال میں آئے تھے، اور انگلش وارڈ تھرڈ ہاوس میں براون صاحب کے تحت کھولا گیا تھا۔ محمود، مسعود، صادق علی خاں اس میں منتقل ہو گئے تھے، اور خوشی خوشی براون صاحب کے کندھوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ ہارسین صاحب نے تو نواب صاحب مرحوم سے مجھے بھی وہیں بھیجنے کو کہا تھا، مگر وہ کلکتہ چلے گئے۔ ہارسین صاحب کی بات اور نواب صاحب ٹالتے؟ میری کمزوری اور ماموں محمد عثمان صاحب کے کہنے سننے سے ہفتہ دو ہفتہ کوٹھی پر رکھ کر نواب حسین مرحوم کے کمرہ کو ڈبنچر میں بھجوا دیا۔ ڈبنچر خاص طور پر اسکول کے طلباء کیلئے مخصوص تھا اور چھوٹی عمر کے لڑکے جیسیں اٹھارہ برس کے سام مرزا بھی شامل ہیں، ظہور وارڈ میں رہتے تھے۔ کبھی اور کبھی بارگ میں بھی اسکول کے طلباء کی ممانعت نہ تھی بشرطیکہ کوئی عزیز یا کم سے کم بڑا بھائی کالج میں پڑھتا ہو۔ ظہور وارڈ پر مولوی سلیم کی حکومت تھی اور اسی سال مشہور کرکٹر ضیاء اللہ خان مرحوم بھی اسکے سب پراکٹر ہوئے تھے۔ ظہور وارڈ میں ہی رنگین پٹیالی صافوں کا زور تھا۔ انگلش ہوس پر کچھ دن بعد یہ رنگ چڑھا یہاں سے کچھ دور ہی اسکول کے بنگلے تھے۔ کارنا صاحب ہیڈ ماسٹر تھے، اور میر صاحب سکنڈ ماسٹر

ظہور وارڈ کے سامنے درختوں کے پیچھے ایک صاحب گرمی ہو یا سردی دھڑا دھڑ کرکٹ کھیلا کرتے تھے یہ سوں ہے یہ حیدر آباد کی محمڈن ٹیم کی جان ہیں۔ بولنگ بھی کرتے باؤنڈریاں بھی لگاتے ہیں ان کی خاص خصوصیت (Just a minute) ہے ریحیاّ منظر! ۲۷-۲۸ برس پہلے کا قصہ ہے۔ ۲۰-۲۲ برس کی عمر کے پیر نابالغ مغالطہ نہ کھا جائیں۔ روئے سخن کرنل صاحب یا میجر صاحب کی طرف نہیں ہے بلکہ یہ وہ صاحب ہیں جو ہمارے کلاس فیلو تھے۔ انکے چھوٹے بھائی بورڈ سے ہمیشہ کھریا کا ٹکڑا اُٹھا لیا کرتے تھے، اور راشپنسل سے تصویر بنایا کرتے تھے، اور اچھی بنانے لگے تھے۔ بڑے بھائی صاحب کا تو شوق مستقل ہے۔ مگر چھوٹے بھائی صاحب اب وائرلیس کے دلدادہ ہیں۔ کلمبو، کلکتہ، بمبئی کے گانے سنا کرتے ہیں۔ یہ تو بورڈنگوں کا تذکرہ ہوا۔ بس یہ ہی چند مقام رہنے کے تھے۔ البتہ ایک بنگلے میں جو مارلین صاحب کے قریب تھا اس میں مسٹر والنیس کی نگرانی میں محی الدین مرزا و معین الدین مرزا تھے، اور مارلین صاحب کا کیساتھ سید راس مسعود ایک زبردست اسکاؤٹرن اسکول کا تاروالے بنگلے میں تھا، یعنے سید ضیاء الدین سید معین الدین، سید نورالدین اور انکے بھانجے بھوندو۔ پیارے اور داؤد گیارہ بجے رات کو ہم علی گڈھ پہونچے تھے اور صبح انھیں لوگوں سے ہمارے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ صورتیں بدلیں، کلکٹر بدلے، کمشنر بدلے، لاٹ بدلے، گورنر بدلے، حتیٰ کہ پایۂ تخت کلکتہ سے بدل کر دہلی آیا، مگر نہ بدلا تو پنجاب میل کا وقت۔ اٹاوے سے شام کے وقت جب چھوٹتا تھا وہی اب چھوٹتا ہے۔ خیر بدلے یا نہ بدلے اب نہ علی گڈھ رہا نہ اٹاوہ۔ اچھا آگے، سنو! رات جیسے تیسے کروٹیں بدل کر کاٹی، صبح جب اُٹھے تو ماموں محمد عثمان کو دیکھ کر کچھ دل کی دھڑکن بند ہوئی۔ بشیر بیگ نے او سان ٹھکانے کئے۔ مولوی زین العابدین صاحب مرحوم صبح کو نواب صاحب کے پاس آئے۔ ہم بھی بلائے گئے۔ مرحوم نے بڑی محبت سے پیار کیا۔ خوش خوش پھر مرزا محمود بیگ صاحب کی کمرہ کے طرف واپس آئے۔ دیکھا کہ ایک منڈے کا منڈا چلا آرہا ہے! جسمیں قد کے لحاظ میاں داؤد تو سب سے چھوٹے تھے اور ضیاء الدین مرحوم سب سے بڑے۔ مرزا محمود بیگ صاحب سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ نام بتایا گیا۔ دونوں بھائی تو چپ رہے، مگر مرحوم نورالدین جو اسوقت سے بی۔ اے تک ہمارے ساتھ فیل پاس ہوتے رہے۔ بے تحاشہ ہمارے طرف دوڑے، اور کہنے لگے کہ میاں زین النبین تم کو نواب صاحب خوب بچا لائے (اسٹر میں جاکر

پتہ چلا کہ یہہ سید عین الدین صاحب کی عنایت تھی) اگر یہہ نام دوسرے کو ملتا تو پھیل جاتا مگر ہمارے اور
نورالدین اور بشیر ہی تک رہا۔ کبھی سید عین الدین صاحب بھی کہہ لیتے تھے۔ ہزاروں پھبتیاں آگے چلکر ہم پہ کسی گئیں
اور لاکھوں پھبتیاں ہم نے اوڑائیں، مگر اس پہلی پھبتی سے جو صورت ہماری نکل آئی تھی وہ بشیر سے نہ دیکھی گئی،
اور اُسنے فوراً ہی گرج کر ڈانٹ دیا کہ خبردار میرے بھائی کو نہ چھیڑنا، اور چپکے سے کہا کہ وہ رو دے گا۔
اسپر مرحوم نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا، اور مجھسے کہا کہ یار گھبرانا نہیں، تم کو کالج میں کوئی نہیں چھیڑ سکتا۔ غرض
وہ دن گیا گزرا ہوا۔ حیدرے کوٹھی پر رہ کر ہم نواب مرحوم کے ساتھ ڈبنچر کے آٹھ نمبر کے کمرے میں آکر رہنے لگے،
اور نئے پرانے ہوگئے۔ میر ولایت حسین صاحب کے صاحبزادے میاں محمود مرغیوں کے بہت شایق تھے،
انکے مرغیاں اکثر ڈبنچر کے کمپاونڈ میں پھرتی تھیں۔ محمود کی موجودگی ہی میں ایک نہ ایک مرغی ہم لوگوں کے
ہاتھ پڑجاتی تو میاں محمود روتے ہوے گھر جاتے تھے۔ یار لوگ میر صاحب کے آتے آتے بھون بھان نوش جان
کر لیتے تھے، اور میر صاحب غصہ تو بہت ہوتے تھے مگر غصہ کا اظہار صرف اس سے زیادہ نہ کرتے تھے کہ "پھوا!
میری محمود کی مرغی اور تیرا اسنہ" اسی بورڈنگ میں محمد نوکی جو آگے چلکر خبر نہیں کہ کیا ہوے تھے، اور صمد، بشیر،
سید احمد، محفوظا شمالی جانب کے آخری کمروں میں شان پہلوانی دکھانے والی جنگلوں کے تیاریاں کیا کرتے تھے،
چچا ضیاء اللہ خاں مرحوم کے ظہور وارڈ پہونچنے کی بدولت علی محمد خاں یہاں کے سب پراکٹر ہوکر آگئے تھے،
اور دوسرے سب پراکٹر نیاز محمد خاں تھے۔ یہہ دونوں ہی اسکول میں پڑھاتے بھی تھے یہاں بورڈنگ میں
کسی شرارت کا حال انکو نہ بتایا تو اسکول میں اپیوزیشن کی دھمکی دیکر سب معلوم کرلیا کرتے تھے ہمیں بورڈنگ
میں مہینہ بھر بھی نہ گذرا تھا کہ یہہ معلوم ہوگیا کہ سب پراکٹر سے جھونٹ بولدینا فیشن میں داخل ہے اور شرارت
کرنیوالوں کا حال کہدینا بڑا گناہ ہے۔ اس زمانے میں ہاکی کا رواج ہی نہ تھا۔ کرکٹ اور فٹ بال صرف
دو کھیل تھے۔ اور ایک دوسرے کے مدمقابل کرکٹ کے کپتان سید علی حسن اور فٹ بال کے کپتان عبدالحمید خاں
تھے۔ چونکہ از الف تا یے ہمارے دوست و احباب کرکٹ والوں میں تھے لہذا وہاں تو ہمیں انسے
ملنا نصیب نہوا، حیدرآباد میں ملاقات ہوی۔ یہاں آکر انھوں نے Co-operative so'ties بنا ڈالی۔
ہم جب انسے ملے تو بہت محبت سے ملے۔ آہ یہہ محبت یہہ خلوص ان لوگوں میں بھی ہوتا جو اسٹرائک کے بعد

علی گڈھ لائف سے مستفید ہوئے۔

سید علی حسن صاحب حسب رواج قدیم ۱۲ نمبر کی بارگ میں تھے اور خان جی صاحب بھی بارگ میں۔ اسی بارگ کے آخری کمرہ میں اسکول الیون (Eleven) کے کپتان عابد حسین خاں، جو انٹرنس کے امتحان میں فیل ہوا کرتے تھے رہتے تھے۔ جب ہم پہونچے تو یہ الہ آباد اور پنجاب دونوں کا امتحان دیا کرتے تھے، اور فیل ہوتے تھے۔ اکثر انکے فیل ہونے کی خبر صبح کے وقت ۹ یا ۹½ بجے ڈائنگ ہال میں ملا کرتی تھی، اور یہ حضرات ۴½ بجے تک کمرے میں بند سوگ کیا کرتے تھے۔ ۴½ بجے ہم عمر دوستوں کا ایک باقاعدہ ڈپوٹیشن انکے کمرے پر جاتا تھا اور سب کہتے تھے کہ ٹورنمنٹ قریب ہے، خدا کے واسطے کالج کا ستیاناس مت کرو۔ انکی تکیے کے نیچے سے انکی پتلون نکالتے تھے، اور یہ منھ بنا کر پہن لیا کرتے تھے۔ مگر بھی ہونے پاتی تھی کہ پھر یہ جیسے کے ویسے ہو جاتے تھے۔ سکنڈ الیون کی کپتانی عابد جعفری کے سر منڈھی گئی تھی۔ کالج الیون کے کپتان کی صورت اسوقت میرے آنکھوں میں ہے، مگر نام یاد نہیں آتا۔ اس زمانے کی فرسٹ الیون کا کیا کہنا سکنڈ الیون صوبے کی سب سے اچھی ٹیم تھی۔ مگر کالج الیون کی ٹیم بڑی لچر۔ فرسٹ اور سکنڈ الیون ایک سائٹ پر۔ کالج الیون دوسری جگہ اور تھرڈ الیون نئی بارگ کی طرف کھیلتی تھی۔ سکنڈ الیون کی کپتانی خاص اہمیت رکھتی تھی، اور یہ ان لوگوں کو ملتی تھی جن کے خدمات اہم ہوں۔ کھیل کی یہ حالت ہوتی تھی کہ جب تک فرسٹ الیون کے قابل نہوں نہ یجاتی تھی مگر یہ فرسٹ الیون کی کپتانی سے مستقل عہدہ تھا جو برسوں رہتا تھا۔ اگر میری یاد خطا نہیں کرتی تو جعفری کے بعد عبدالحق۔ عبدالحق کے بعد عزیز اللہ عزیز اللہ کے بعد آل محمد انکے بعد غالباً حیات اور پھر ہم کپتان ہوئے۔ ۱۹۰۱ سے ۱۹۱۲ تک کا یہ سلسلہ ہے اور ہم میں سے صرف آل محمد ہی کو فرسٹ الیون کی مستقل ممبری نصیب ہوئی۔ ورنہ دوسروں کو ہمیشہ فرسٹ الیون کی ٹیم میں بحیثیت اکسٹرا کے اسکورنگ یا امپائری پر اکتفا کرنا پڑا۔ امپائری کا سہرا آگے چلکر حیات کے سر رہا۔ اسکول الیون کا کپتان ہمیشہ فرسٹ الیون کا ممبر ہوتا تھا لیکن کالج الیون کا کپتان سکنڈ الیون سے بھی محروم۔ اسکی وجہ کچھ تو کھیل میں نیازمندی، کچھ کالج میں پڑھنے کا غرور۔ علی حسن صاحب کے بعد سید محمد خاں صاحب، پھر مرحوم عبداللہ صاحب کپتان کر چھوٹے بھائی محمد اکرم صاحب

بعہ سلام الدین صاحب، پھر استاد حلیم، انکے بعد احمد علی صاحب اور انکے بعد آل حسن صاحب اس عہدہ جلیلہ پر سرفراز ہوے۔ یہاں پر ایک عجب لطیفہ یاد آیا۔ احمد علی آل حسن ہم ساتھ ساتھ بی۔ اے کے امتحان میں گئے۔ اگر آل حسن پاس ہو جاتے تو بڑے صاحب کی جانشینی میں فرق آجاتا۔ غرض بڑے معرکے کا سال تھا۔ آخرش ایک سال کپتان رہ ہی لئے، اور اچھی کامیابی حاصل کی۔ انکے بعد پیارے والے عبدالوحید کا نمبر آیا۔ اور وہ تیرہ نمبر میں رونق افروز ہوے۔ انکی ٹیم کی واپسی پر ہم نے ایک رباعی بھی کہدی۔ خدا نخواستہ اس زمانہ میں ہم ایسے ہی شاعر تھے۔

ہے نیک فال پہلی ظفر بہہ وحید کی　　اور اسپہ ایک سینچری بھی مزید کی
حلوای کی دوکان سے مٹھائی منگائی ہے　　اب تاب ہی نہیں رہی وعدی وعید کی

کرکٹ کپتانی کے ساتھ بڑی قید یہہ لگی ہوی تھی کہ بی۔ اے کلاس کا طالب علم ہو۔ اس کا نتیجہ یہہ ہوتا تھا کہ سکنڈ ایر میں برسوں رہنے والے اس نعمت سے مستغنی رہتے تھے۔ اس درد استغنا کو رضا محمود بھوند و شفقت کے دل سے پوچھیے۔

لورڈنگ ہوس کی دیواریں مسٹ وسٹ ناٹ (Must and Must not) کی تختیوں سے مزین نہ تھیں۔ اور سوا ے ظہور وارڈ کے باقی سب بورڈر ڈائنگ ہال میں آکر کھانا کھاتے۔ یہہ عمارت پکی بارک کی دو بارکوں کے درمیان مدت سے تیار تھی، اور سطح سڑک کے اس پار جہاں پہلے تھا وہیں اب بھی ہے۔ ڈائنگ ہال کا لطف کچھہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہائے کسی اولڈ بائے نے کیا ہی خوب کہا ہے:

آتا ہے یاد اکثر کالج کا وہ زمانا　　وہ نت نیا تماشہ وہ نت نیا ترانا
وہ دال ماہنیٹر سے جنگ و جدال کرنا　　اور بھیرویں کی لے میں پشتو کی گیت گانا
ہوتا رکابیوں سے جب ہال رشک گلشن　　شاخ کباب پر تھا احقر کا آشیانا
ایک مصرع بھول گیا۔　　پیشیس بھی ہے تمھاری اک امر ابھانا
جب پچھلی رات آئی تھی باغ پر چڑہائی　　گٹھلی کی چاندماری چھلکے کا تھا نشانا

بڑی خوبی ڈائنگ ہال کی یہہ تھی کہ مزے میں ذرا فرق نہ آتا تھا۔ جو گوشت کا مزا آج ہے وہی پہلے

وہی تھا، اور جو آج ہے وہی قیامت تک رہے گا۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۵ء تک کی تو ہم کہہ رہے ہیں، کالج یونیورسٹی ہو کر بدل گیا ہو تو خدا جانے۔ بدھ اور اتوار کو صبح کے وقت پلاؤ بھی ملجاتا تھا، اور جمعہ کو شہر جاتے جاتے ایک فرنی اور ایک زردہ کی رکابی اور نوش جان ہوجایا کرتی تھی! اسکے علاوہ باقی دنوں میں دونوں وقت ایک گوشت کی رکابی اور دال چپاتی یا آبی تنوری روٹی جتنی کھاسکیں کھائیے، مگر کمرے بند چھ سے زیادہ چپاتی اور تین سے زیادہ آبی روٹی نہیں مل سکتی۔ مانیٹروں کا لطف وکرم دوسری بات ہے۔ یادہ ترکیبیں جو استادلوگ سینہ بسینہ تلقین کرتے ہوئے چلے آئے ہیں اور جسکے لئے دل کی قوت اور ہاتھ کی صفائی درکار ہے اس کا ذکر شرارتوں کے سلسلے میں آئیگا۔ میر عاشق علی صاحب مرحوم ٹرسٹیوں کی طرف سے ڈائنگ ہال کے نگران تھے اور ٹمنگ صاحب سے بگڑ کر کہا کرتے تھے کہ میں بھی کالج کا ٹرسٹی ہوں۔ پلاؤ کی تعریف ایک صاحب نے کیا خوب کی تھی کہ صبح کو دھو کر چاول بنئے اور گوشت قصاب کے ہاتھ بیچ لو۔

ڈائنگ ہال کا وقت صبح کے ۹ بجے اور شام کو نماز مغرب کے تقریباً آدھ گھنٹے بعد۔ بارگ کے بیرے آکر دال کی رکابیاں میز پر چن دیتے تھے، اور گوشت کی رکابی مانیٹر صاحب کے سامنے بھری جاکر بانٹ میں رکھ دیجاتی تھیں۔ دس پانچ نائد رکابیاں مخصوص ہوا کرتی تھیں۔ مانیٹروں کے لطف وکرم بعض بعض دن تو خشکہ وکباب بھی کھلادیتے تھے۔ گوشت کا دیگچہ آتے ہی دونوں طرف کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے، اور پھر جب میز تیار ہوجاتی تو ایک بیرا پکی بارگ کے برآمدے میں جاکر اور پھر باورچی خانہ کی طرف آکر زور سے گھنٹی بجاتا تھا، اور ہم لوگ جمع ہونا شروع ہوجاتے تھے۔ اپنے بل بوتے پر زائد رکابی حاصل کرنے والے پہلی ہی ریلے میں داخل ہونا ضروری سمجھتے تھے، اور داب کر دو ہاتھ میں رکابی صاف کر کے بیرا بیرا پکارنا شروع کر کے مانیٹر صاحب کو چکمہ دیئے جاتے تھے۔ اب سنا ہے کہ دنیا بھر کی تختیاں ڈائنگ ہال میں لٹک رہی ہیں۔ پہلے تختیوں پر لکھے جانے کا رواج صرف کرکٹ ٹیم (speaking, prize) یونین کے وائس پریسیڈنٹ اور سکرٹری کا تھا، اور یہ تختیاں یونین ہی میں تھیں۔

شہر جانیکے واسطے پاس کی ضرورت ہوا کرتی تھی اور غالباً جمعہ کو ۲ بجے سے قبل مغرب تک

عام اجازت تھی شہر کے باہر جانے کیلئے پاس لازمی تھا، اور اسکی اطلاع میر صاحب کو دینا پڑتی تھی بورڈنگ
میں داخلہ، بورڈنگ سے علیحدگی، گھر آنے جانے کی اجازت سب میر صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ میر صاحب
پراکٹر تھے اور باقی دوسرے استاد سب پراکٹر۔ اکثر میر صاحب لالٹین لیکر بورڈنگ میں ۹ بجے کے بعد ٹہلا کرتے
تھے۔ انھیں لڑکوں سے محبت تھی اور لڑکے بھی انکا ادب دل سے کرتے تھے خطابات اگرچہ دیئے جاتے
تھے، مگر سلطنت بھنبولا قائم نہ ہوئی تھی، اور نہ باقاعدہ گزٹ اکسٹرا آرڈنری شایع ہوتا تھا۔ فاختہ کا رواج
تھا، مگر لڑکوں لڑکیوں میں۔ گرمیوں میں خاص لطف پلنگ اٹھانے اور بستروں کو درخت پر رکھ دینے میں تھا۔
ایک گروہ مرے صاحب کا روپ بھر کر شیمپین سگریٹ یا اسکی قیمت وصول کرتا تھا۔ یہ کھیل جاڑوں کے لئے
مخصوص تھا۔ کبھی نووارد دوست کا روم فیلو مرے صاحب کو اندر داخل ہو جانے دیتا تھا، اور کبھی یہ پارٹ
کھڑکی کے پیچھے سے ہوتا تھا۔ اگرچہ پارٹی بندی تھی مگر پلنگ اٹھانے، فاختہ اڑانے، گھر سے آیا ہوا حلوہ
کھانے میں اپنے و غیر کی تمیز نہ تھی۔ بننے والے کو بنانا فرض عین تھا۔ ماہرین فن دکھتی ہوئی رگ کا ایک ہی
دو دن میں پتہ چلا لیتے تھے۔ یونیفارم کی سختی نہ تھی۔ اسکول کالج میں سوٹ، شیروانی، رام پوری انگرکھا
سب چلتا تھا۔ سال کے انوکھے واقعات، نواب صاحب رام پور کی تشریف آوری، لارڈ کرزن کا دربار،
ڈابنچر کیمپ بارگ کی جنگ، محرم کی لڑائی تھے۔ اسی سال مارسن صاحب کلکتے سے ایک تھیٹریکل کمپنی لائے
تھے۔ آدھے دن کی تعطیل دی تھی۔ ٹاؤن ہال میں رومیو جولیٹ کا کھیل ہوا تھا جس کا صرف ایک جملہ
"اور رومیو" منہ بنا کر ادا کرنا ہم دو چار دوستوں کو یاد رہ گیا تھا، جو وقتاً فوقتاً دو چار صاحب پر کس دیا جایا کرتا تھا
یا تو حبیب اللہ خاں صاحب ڈپٹی یا اور کوئی صاحب اولڈ بوائز کے سکرٹری تھے اور اسٹریچی ہال میں ڈنر
ہوتا تھا۔ اولڈ بوائز (Easter) کے تعطیلوں میں کھیل کود کر اور لچھے دار تقریریں کر کے گھر چلے جایا کرتے
تھے جو آگے چلکر ہوا اسکا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بچپن کی باتیں اس سے زیادہ یاد نہیں آتیں۔ کوئی صاحب
اگر اور لکھنا چاہیں تو بندہ سننے کو تیار ہے۔

سید غلام پنجتن

ہمارا کالج

۱ - ۱۱ر فروری سنہ ۴۲ء کے سہ پہر میں جامعہ اسلامیہ علیگڈھ کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ ہندوستانی اور یوروپین معززین کا کافی مجمع تھا۔ مسٹر او کلڈن کمشنر میرٹھ نے خطبۂ اسناد پڑھا۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی روایات اور اسکے کارکنوں کا ذکر کیا، اور طلبہ و طالبات سے ہندوستان کی عظمت کیلئے انتھک کوشش کرنے اور رواداری کی روح پیدا کرنے کی خواہش کی کیونکہ اُن کی رائے میں رواداری سچی شائستگی کا اعلیٰ ترین کمال ہے۔ نواب سر فرل اللہ خاں بہادر نائب امیر جامعہ نے کہا کہ اسلام رواداری کی تلقین کرتا ہے۔ صاحب موصوف نے ہنود سے بھی اپنے مذہب کا احترام کرنے اور اپنے مذہبی رواداری پر قائم رہنے کی خواہش کی۔ ایک لڑکی ثروت آرا بیگم کو میٹرک میں اول آنے پر طلائی تمغہ دیا گیا۔

۲ - ہمیں یہ معلوم کرکے فکر پیدا ہوگئی تھی کہ برادرم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب علیل ہوگئے تھے لیکن بعد ستوں سے معلوم ہوا کہ اب بفضلہ وہ بعافیت ہیں۔

اولڈ بوائز

۱ ۔ یہ امر ہمارے اور تمام اولڈ بوائز کیلئے مسرت خیز و اطمینان بخش ہے کہ ہزایکسلنسی گورنر صاحب صوبجات متحدہ نے ہمارے برادر مکرم آنریبل نواب صاحب چھتاری کو اپنی ایگزیکٹیو کونسل کا نائب صدر مقرر فرمایا ہے۔ نواب صاحب میں بہت سی ذاتی خوبیاں موجود ہیں، اور اپنے انہیں صفات کی بدولت وہ کونسل کے اندر سوالات کی بارش کا مقابلہ تن دہی مگر زندہ دلی کے ساتھ فرماتے ہیں۔ ہمیں حافظ احمد سعید خاں بہادر کی خوبیوں میں سب سے زیادہ انکی یہ بات پسند ہے کہ ماہ مبارک رمضان میں چھتاری جاکر ایک قرآن اپنی مسجد کے مصلیوں کو ضرور سنایا کرتے ہیں۔ اس اعزاز پر ہماری جانب سے نواب صاحب دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

۲ ۔ برادر عزیز خواجہ غلام السیدین صاحب (خلف آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم) اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: والد مرحوم کے حالات یقیناً قلمبند کرنا چاہیے۔ میرا خود عرصہ سے خیال ہے لیکن اس کے لئے جیسا کہ آپ نے لکھا ہے عم مکرم خواجہ غلام السبطین صاحب کی امداد کی ضرورت ہے وہ آجکل اجمیر میں ہیں، اور میں علیگڈہ میں رہتا ہوں۔ بہرحال میں ان کو لکھتا ہوں کہ وہ یہ کام کردیں۔ امید کہ انشاء اللہ جلد ہو جائے گا، میں بھی کوشش کروں گا کہ "اولڈ بوائے" کے لئے کچھ لکھوں۔ ہم اپنے عزیز بھائی کی توجہ فرمائی کے شکر گزار ہیں، اور ساتھ ہی برادر محترم جناب خواجہ السبطین صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم اپنے دوسرے بھائیوں سے یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اگر اپنے اُن بھائیوں کی یاد کو تازہ رکھنا چاہتے ہیں جو ہمیشہ کیلئے جدا ہو چکے ہیں تو براہ کرم اپنے حافظہ پر زور ڈال کر اُن کے حالات قلمبند فرمائیں اور اپنی دماغ سوزی کے نتیجہ کو ہمارے پاس بھیجدیں۔ کیا ہم اپنے مرحوم بھائی مولوی عسکری مرزا صاحب کے فرزندوں میں سے مسٹر احمد مرزا مسٹر ابو سعید مرزا اور مسٹر سجاد مرزا سے یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کی آخری خدمت انجام دے کر اُن مرحوم کی روح کو شاد اور ہمیں ممنون فرمائیں گے؟ مسٹر سید محی الدین صاحب سے ہماری درخواست ہے کہ وہ بھی برادرم مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم کے حالات ہمارے پاس روانہ فرمادیں۔

۳۔ برادر محترم مولانا شوکت علی صاحب نے تہیہ فرمالیا ہے کہ ماہ مبارک رمضان حیدرآباد میں گذاریں اور اس غرض سے اوائل ماہ میں وارد بلدہ ہو کر برادرم مولوی محمد اصغر صاحب بیرسٹر کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ جہان کے بہت سے زنگ خوردہ ولایتی پرزے (یا دیسی ریزے؟) بیزبان کو رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور دلوں کی بات زبانوں پر آچلی ہے کہ اس جواہر ریزے کو کسی تدبیر سے اڑا لیا جائے اگرچہ مولانا کا ورود بالکل پرائیوٹ اور اپنے قدیم دوستوں میں تھوڑی مدت گزارنے کے قصد سے ہے لیکن ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیداری میں بھی وہ ارض پاک حجاز پر حجاج کی ضروری ضرورتوں کو بہم پہنچا کر اُن کے مشکلات کم کرنے کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ صدیاں گزرتی جاتی ہیں، مگر ہمارا انتظام جیسے کا ویسا ہے اور آفتاب آج بھی ویسی ہی تمازت کے ساتھ لاکھوں بندگان خدا کے سروں پر چمکتا رہتا ہے جیسا حضرت ابراہیم کے زمانہ میں چمکتا رہتا تھا۔ ہم ہندوستان میں بیٹھ کر عرب کی تیز دھوپ کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ ہم میں اگر تھوڑا احساس بھی اُن مشکلات کا موجود ہے جو حجاج کو حجاز اور خاص کر منیٰ میں برداشت کرنے پڑتے ہیں تو اپنے مجاہد نفس کے ذریعہ اس کام کو اتمام تک پہنچانے کی فکر کریں اور اتنا فنڈ مہیا کردیں کہ وہ دوران حج میں ہندوستانی حاجیوں کیلئے سایہ پانی اور دوسرے ضروریات کا اہتمام کرسکیں۔

۴۔ سارے ہندوستان میں حیدرآباد رائفل مٹنگ (Rifle meeting) ہی ایک

ایسی تفریحی پارٹی ہے، جس میں ہندوستانیوں کو بندوق اندازی کا موقعہ ملا کرتا ہے؛ ورنہ ایسی باقی دو پارٹیوں میں تو محض انگریز صاحبان اپنی تفریح کیا کرتے ہیں۔ اس سال جنوری کے آخری دو دنوں سے فروری کے سولہ دنوں تک متذکرہ بالا میٹنگ کی سرگرمیاں، زیر صدارت کرنل نواب عثمان یار الدولہ بہادر کمانڈر افواج باقاعدہ سرکار آصفیہ جاری رہیں؛ اور مقابلہ میں زیادہ نمبر پانیوالے افسروں اور سپاہیوں نے، اپنے کمانڈر کے ہاتھ سے ۱۸ فروری کو جام کامیابی اور مقررہ انعامات حاصل کئے۔ اس میٹنگ کی انتظامی کمیٹی میں ہمارے بھائی لفٹننٹ کرنل محمد عظمت اللہ سردار بہادر وایس پریسیڈنٹ، اور برادر عزیز کپتان نظیر الاسلام سکرٹری کے سوا مندرجہ ذیل اولڈبوائز بحیثیت رکن شریک تھے، (۱) لفٹننٹ کرنل مرزا قادر بیگ سردار بہادر (۲) میجر سید ولایت حسین (۳) میجر ریاست علی مرزا (۴) میجر عبدالجبار خاں (۵) میجر عبدالصمد (۶) کپتان محمود حسن خاں (۷) اسکرٹری صاحب افیسرس میس (؟)

برادرم کپتان شیخ محمد بشیر صاحب نے بحیثیت رکن و پروسٹ مارشل اور حسب ذیل اولڈبوائز نے رینج افیسرس (Range Officers) کی حیثیت سے شرکت کی تھی: (۱) لفٹننٹ غلام معین الدین (۲) لفٹننٹ امیر احمد (۳) لفٹننٹ احمد اشرف (۴) لفٹننٹ حبیب احمد (۵) لفٹننٹ خواجہ محمد سعید (۶) سب لفٹننٹ قیصر مرزا بیگ (۷) سب لفٹننٹ محمد عنایت اللہ (۸) سب لفٹننٹ محمد حامد اللہ (۹) سب لفٹننٹ نظام علی بیگ (۱۰) سب لفٹننٹ بشیر الدین احمد (۱۱) سب لفٹننٹ میر امام الدین۔

آخری دن بندوق کی آواز نے ہمیں بھی اپنی طرف متوجہ کیا، اور دل کڑا کرکے، ہم اسکی جانب بڑھے۔ رائفل رینج پر پہونچے تو وہاں کھلنڈرے ہی کھلنڈرے نظر آئے۔ غیر فوجی بھائیوں میں سے مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی اور اُن کے فرزند مسٹر اعظم بلگرامی بھی تماشائیوں میں موجود تھے، دوست بکار و دل بیار، کا تجربہ ہمیں اس موقعہ پر اچھی طرح ہوگیا۔ گولیوں کے سایہ میں مجسمۂ اسلام کے ساتھ ہمارا اور سید صاحب کا وقت نہایت ہی لطف کے ساتھ گزرا۔ کپتان میاں محمد بشیر سے بار بار تعارف ہمیں تازہ لطف دیتا تھا۔ دوپہر کو میس ہاوس میں برادر مکرم میجر محمد شفیع اور عزیزی لفٹننٹ سید مسلم علی بلگرامی کو بھی سر جھکائے ہوئے، چھری کانٹے سے جنگ کرتے دیکھا۔ مگر برادران محترم میجر عبدالجبار خاں اور میجر وزیر الزماں خاں کو وہاں بھی آنکھیں ترستی رہیں۔

شام کو خدا حافظ کہنے اور دوستوں سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ کھلاڑیوں میں ایک (اور وہ بھی ہمارے فٹ بال کپتان کی) کمی ہے۔ دریافت کیا تو ایک سپاہی نے کہا کہ میجر صاحب فلسفیوں کیطرح اپنے بنگلہ میں ننگے سر ٹہل رہے ہیں اور کسی سے بات تک نہیں کرتے۔ یہ سنا سب کو فکر ہوگئی اور خیریت کیلئے بنگلے پر آدمی دوڑائے گئے۔ تھوڑی سی دیر میں راز افشا ہوگیا! اسقدر فکر کی بات یہ تھی کہ انکی گھوڑی تا فوجی کوتوال صاحب کے پنجراپول (مویشی خانہ) کے معائنہ کو تشریف لے گئی تھیں اور فوجی قاعدہ کی رو سے وہاں روک لی گئیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض شوقین سپاہی کوٹ کی جیب میں رکھ کر اس پوتر ہستی کو اپنے گھر لیجانا چاہتے تھے لیکن میٹنگ کے سکرٹری صاحب کو بروقت اطلاع ہوگئی اور انھوں نے اس بے زبان کو گھر پہنچکر مالک کو فکر سے نجات دلادی۔

چلتے چلتے ایک بات کی ہمیں اطلاع لفٹنٹ تاج احمد خاں کے ذریعہ ہوئی یعنی برادرم نظیر الاسلام صاحب نے ایک نیا وظیفہ شروع کردیا ہے، اور یہ اسی کا اثر ہے کہ بلدہ میں اب طاعون کمی پر ہے۔ ایسا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ انھیں اور میاں بشیر صاحب کو میجر بنا کر اسی کام کیلئے مخصوص کردینا مناسب ہوگا، اور ان دونوں کی معاونت کے لئے خود لفٹنٹ تاج احمد خاں موزوں ہونگے۔

۵۔ اسی فروری میں برادر عزیز لفٹنٹ عمر دراز خاں قلعدار گولکنڈہ کی ہمشیر کی شادی کے موقعہ پر ہمیں اپنے بھائی کے طرز مدارات اور خوش سلیقگی کا اندازہ ہوا۔ یہ شادی ہمارے بھائی مرزا مصطفے بیگ صاحب الکٹریکل انجینیر اورنگ آباد کے ساتھ ۱۸ فروری کو بمقام قلعہ گولکنڈہ واقع ہوئی تھی؛ جہاں حیدرآباد اور مضافات کی سوسائٹی کے تقریباً تمام شرفاء اور اولڈ بوائز کثیر تعداد میں صف بصف موجود تھے۔ رسم قدیم کے مطابق دولھا کا ایک شہ بالا ہوتا ہے، لیکن ہم جب شادی گاہ میں پہونچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ سند شادی کے گرداگرد بہت سے شہ بالا موجود ہیں، اور لطف یہ ہے کہ دولھا صاحب اپنی جگہ سے غائب! دوسرے دوستوں کے پرچانے میں مشغول ہیں۔ ہم نوشاہ اور انکے برادر نسبتی دونوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

۶۔ طاعون کی مصیبت جہاں کہیں آتی ہے اس حصہ ملک کو زیروزبر کردیتی ہے۔ حیدرآباد بھی ایک مدت سے اس بلا کا شکار ہے۔ شائد ہی کوئی سال ایسا گزرتا ہوگا کہ یہاں طاعون نہ آتا، اور اپنی رو میں ہزاروں جانوں کو

نہ لیجاتا ہو! اس مرتبہ بھی اس بلا نے ادھر کا رُخ لیا، اور برادرِ مکرم ڈاکٹر حامد علی صاحب نے ہزار کوشش کی لیکن مرض دن بدن بڑھتا ہی گیا، اور شہر کی بیشتر آبادی کو بے خانماں ہونا پڑا۔ ہم بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، اور نقل مکان کرنے کے باب میں آسانی کے ساتھ بھائی مولوی سید لیاقت حسین صاحب (علیگ) کے ارشاد کی تعمیل کرنے پر تیار ہو گئے۔ اُن کے سارے گھر سے ہی جو آرام پہنچا، اسکے لئے ہم اُن کے شکرگزار ہیں۔ ہم صابر میاں صاحب کے بھی ممنون ہیں کہ سماع خانہ درگاہ حضرت شاہ خاموش کے بہترین حصہ کو ہمارے حوالہ فرما دیا تھا۔

۷۔ ہمارے بھائیوں میں سے دو صاحبان کو سرکار آصفیہ کے خدمات سے وظیفہ حاصل ہوا ہے۔ ان میں سے ایک برادرم مسٹر جمیل احمد صدر مہتمم تعمیرات اورنگ آباد دکن ہیں، اور دوسرے برادرم مولوی نظیر حسن فاروقی مہتمم تعلیمات ضلع نظام آباد۔ ہمارے ان بھائیوں نے فرض شناسی کے ساتھ اپنی اپنی خدمت انجام دی ہے اور ہم خوش ہیں کہ آخر تک اپنی زندہ دلی کو قائم رکھا۔

۸۔ بہرائچ (اودھ) میں ہر سال حضرت سالار مسعود غازی کا عرس ہوتا ہے اور مختلف دیار و امصار سے ہر طبقہ و مذاق کے کثیر التعداد مرد و زن کا مجمع ہو جاتا ہے، گزشتہ عرس شریف کے اچھے انتظام کا سہرا ہمارے برادر عزیز ڈپٹی محمد عباس خاں صاحب شروانی کے سر ہے، جو مجلس انتظامی درگاہ شریف کے صدر نشین ہیں۔ انکی کمیٹی نے تھوڑے عرصہ سے معاشرتی دلچسپیاں پیدا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور سال بسال میلہ اور عرس میں رونق زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ دنگل کشتی اور قدیم فنِ حرب کی نمائش کا سال حال میں اضافہ ہوا ہے۔ ہزاروں زائرین کے منجملہ اس مرتبہ ہمارے برادرِ مکرم آنریبل نواب صاحب چھتاری نے بھی شرفِ آستانہ بوسی حاصل کیا تھا۔ ہم مسٹر شروانی کو اُن کے حُسنِ انتظام پر مبارکباد دیتے ہیں اور زندگی کے ہر مفید شعبہ میں اُن کی کامیابی کی دُعا کرتے ہیں۔

۹۔ کہتے ہیں کہ اس مرتبہ مسٹر قاسم حسن قبض سے اور مسٹر سید محمد اعظم بخار سے سخت علیل ہو گئے تھے اول الذکر دل کے پُرانے مریض اور معدہ کے قدیم شکار دیا شکاری (؟) ہیں۔ اسی لئے ڈاکٹروں کو بڑی جدوجہد سے کام لینا پڑا۔ اور آخر الذکر پر بھی معدہ ہی کے افسوں کا اثر پایا جاتا ہے۔ مسٹر غلام پنجتن کہتے ہیں کہ مہینہ میں پانچ پلے

گھی ہضم کرجانا اعظم چھوڑ دیں تو ابھی اچھے ہوجائیں اور ہم خیال کرتے ہیں کہ سنہ پنجتن گھی کی متعلق رائیں زیادتی پر ہیں

۱۰ - ہمیں یہ معلوم کرکے سخت قلق ہوا کہ برادر عزیز مسٹر تجمل حسین کی شریک راحت و رنج نے ہمیشہ کیلئے اپنا چہرہ خاک میں چھپا لیا، اس افسوس میں اس وجہ سے اور بھی زیادتی ہو جاتی ہے کہ مرحومہ وطن سے دور ہنگولی میں بغرض تبدیل مقام قیام پذیر تھیں اور وہیں انکی رحلت واقع ہوئی۔ اپنے بھائی کے اس غم میں ہم اسکے شریک ہیں اور مرحومہ کیلئے دعاء مغفرت کرتے ہیں، مسٹر عبدالغنی نے اس موقعہ پر جس برادرانہ رواداری سے کام لیا ہے وہ بھی شکرگزاری کے قابل ہے۔

۱۱ - عزیزی سید صابر حسین پھپوند ضلع اٹاوہ کی ہمشیر کی جواں مرگی کی اطلاع ہمیں دیر میں ملی۔ ان مرحومہ نے اوائل جنوری میں بمقام جالون رحلت کی اور اپنے والدین و اعزہ کو اس وقت داغ مفارقت دیا جب کہ سب لوگ شوال سال حال میں انکی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ خداوند عالم مرحومہ کو جوار جناب سیدہ عطا فرمائے اور والدین کو صبر کی توفیق دے۔

۱۲ - ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ برادرم حاجی مولوی سید لطف احمد صاحب کو حال ہی میں ترقی ملی ہے پہلے وہ ناظم صاحب طبابت سرکار آصفیہ کے پرسنل مددگار تھے اور اب ترقی پاکر مددگار ہوگئے ہیں بہت دنوں سے ہمارے برادر عزیز کا وعدہ ہے کہ اولڈ بوائے کیلئے قلم اٹھائیں گے اور حج کی دلچسپیاں سپرد قرطاس کرینگے۔ کیا اچھا ہو اگر اس موقعہ پر دعوت سے بچانے ہمیں خوشگوار مضمون دیدیں ہم دعوت کی فرمائش کریں تو قصور وار۔ دوسرے بھائیوں کی ذمہ داری ہم نہیں لیتے۔

۱۳ - رسالہ اولڈ بوائے کی توسیع اشاعت میں ہمارے جن بھائیوں نے کوشش کی ہے ان کا شکریہ ادا کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہم برادر عزیز مسٹر صدیق الزماں (اورنگ آباد دکن) کے ممنون ہیں، جن کا ہفتہ وار یاد نامہ ہمیں ضرور ملتا ہے اور اس میں رسالہ کیلئے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوا کرتی ہے۔ ڈائرکٹری کیلئے اولڈ بوائز کے حالات، رسالہ کیلئے اطلاعات کے سوا ہمارے بھائی کی توجہ توسیع اشاعت کی جانب بھی مائل ہے۔ ہم اپنے برادر مہربان کپتان نظیر الاسلام صاحب کے بھی ممنون ہیں جنھوں نے عساکر آصفیہ کے ملیگڈھ اولڈ بوائز کی مکمل فہرست ہمیں عنایت فرمائی اور جو ... ہماری پہلی ... گئے تھے وہ بھی ہمارے ہوتے جاتے ہیں۔

برادر محترم مولوی مسعود علی صاحب بی اے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ توسیع اشاعت کی جانب میلان خاطر ظاہر فرما رہے ہیں۔ اسی نام کے ایک دوسرے بزرگوار (جو بی اے ہونے کے سوا ایل ایل بی بھی ہیں) ہم سے دس خریداروں کے دینے کا وعدہ کرتے اور انکے بمجملہ چار پیشگی دیتے ہیں۔ ان کا شکریہ ہم وعدہ کے پورا ہونے پر ادا کریں گے۔ مسٹر غلام دستگیر (کلوا کری) کے البتہ ہم ممنون ہیں کہ انکی فہرست میں سے دو وکیل صاحبان نے رسالہ کی خریداری منظور کر لی ہے۔ اسیطرح برادر مکرم مولوی حامد علی خانصاحب (میدک) کی توجہ فرمائی ہمارے لئے باعث منت ہے کہ انکے بتائے ہوئے بیرسٹر صاحب بھی نقد نکلے۔

۱۴ - برادرم آغا محمد احسن صاحب کو بھائی محمد عثمان صاحب مع اپنے اسٹاف کے مبارکباد دیں تو دیں، ہم تیار نہیں ہیں کہ کسی کے گھر میں لڑکی پیدا ہونے پر اپنی مبارکباد کا اظہار کریں۔ آپ پوچھیں گے کیوں؟ وجہ ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ عذر تراش کر یہ کہہ دینا کہ کئی کوششوں کے بعد لڑکی نکالی ہے، بہت آسان ہے۔ کوئی اس نوشق مرد میدان سے پوچھے کہ اس کام میں کتنی دردسری سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس پیدائش کے سلسلہ میں یہ معلوم کر کے تو ہمیں خوشی ہوئی کہ خدا نے زچہ کو سخت بیماری سے نجات دی اور اس موقعہ کی مبارکباد ہم اپنے بھائی کو ضرور دیتے ہیں۔

۱۵ - ہمارے لئے یہ اطلاع باعث مسرت ہے کہ برادرم مولوی حنیف الدین صاحب پروفیسر فارسی مدرسہ فوقانیہ عالیہ نے حال ہی میں چالیس سال کی عمر میں عقد اول کا ارتکاب کیا ہے یہ ارتکاب بڑے دن کی تعطیلات سے فائدہ اٹھا کر کاکوری میں کیا گیا تھا۔ سنا ہے کہ اس آبادی سے بہت مسرور ہیں اور اپنی سابقہ حالت پر اب تاسف کرتے ہیں کہ کیوں اتنے دنوں تک اس نعمت سے محروم رہے۔ یہ صاحب ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء تک کے اولڈبوائے ہیں۔

۱۶ - ہمیں معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ برادر عزیز ڈاکٹر سید عبدالرحمن خلف جناب مولوی سید عطا حسین صاحب کے خدمات سررشتہ طبابت سرکار آصفیہ کیلئے محفوظ کر لئے گئے ہیں اور ہمارے بھائی کو ضلع عثمان آباد کا سول سرجن مقرر کیا گیا ہے۔ سنتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اسوجہہ سے خوش خوش عثمان آباد گئے ہیں کہ وہاں روزانہ صبح صبح تلجا دیوی کے درشن ہوا کریں گے۔

علیگڈھ کا ایک کھلنڈرا

از جناب مولانا شوکت علی صاحب

کہتے ہیں قدیمی ہے اِس یار ہوں تیرا
زلفیں بھی نہیں تھیں جب سے گرفتار ہوں تیرا

سید منظر علی صاحب نے اولڈ بوائے حیدرآباد سے پھر نکالا ہے۔ خدا کرے وہ اس کو بہت دن تک زندہ رکھ سکیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اولڈ بوائے کے استحکام کی ذمہ داری بھی کسی نہ کسی دن مجھ کو لینا پڑے گی تاکہ اس کے ذریعہ سے علیگڈھ کے پرانے کھلنڈروں اور دوست احباب سے اپنے ارادوں کے مطابق کوئی بڑا کام لے سکوں۔

ہندوستان کی آب وہوا میں، اس کی تعلیم میں، اس کے گرد و نواح میں، عجب زہر پھیلا ہے، جو ہم سب کو اچھی بیہودہ حالت پر رضامند رکھتا ہے۔ اولڈ بوائز سے توقع تھی کہ وہ اسلام کے اور بڑے بڑے کام نہ کرتے، ہندوستان کیلئے نمایاں کارگزاریاں نہ کرتے، تو کم از کم اپنی اچھل کود اور آپس کے پیار محبت کو تو قائم رکھتے۔

میں اسلام کا فقیر بہت سی مشکلات میں پھنسا ہوں۔ ذاتی دشواریاں ہیں۔ کام کی سخت ترین ذمہ داریاں ہیں، مگر پھر بھی خدا کا شکر ہے۔ جب کبھی چار پانچ پرانے دوست اور نئے پرانے اولڈ بوائز خلافت کے دفتر میں میرے چھوٹے سے کمرہ میں، جو میرے سونے کا کمرہ بھی ہے، ڈرائنگ روم اور ملاقات کا کمرہ بھی ہے، دفتر کا

اعجاز محبت منگر، کم کردر ایں راہ
بے بال و پر از شوق پریدیم پریدیم

کہ یہی ہے، نہاتے اور وضو کرنے کی جگہ بھی یہی ہے، وہاں ہم بیٹھتے ہیں، دنیا زمانہ کے تذکرے ملاتے ہوئے عظیم الشان سازشیں کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی تھوڑی دیر کیلئے، نیاز مافیہا کو بھول کر اپنی پرانی زندگی کو یاد کرکے، اپنا اور ساتھیوں کا دل خوش کرتے ہیں، کھاتے ہیں، ہنستے ہیں، نہاتے ہیں، چلاتے ہیں، لڑتے ہیں، بگڑتے ہیں، جیتے ہیں، ہمارے پیش روس کیسا ہی جمود، اور قبر کا سا سکوت کیوں نہ ہو، پھر بھی ہم مست کھلنڈرے اس سے متاثر نہیں ہوتے، بہت سے دوستوں سے ایسی مردہ دلی کی باتیں سنتا ہوں، کہ جیل میں یاد کیا ہوا داغ کا مطلع یاد آجاتا ہے ؎

دن گزارا اب خیال مہر باصد آفات کر سکے — وہ خبر رات کی نہ دن ہی گزری رات کر سکے

شہر خوب ہے، اور سچا ہے، مگر ہم سخت جان جب مل کر بیٹھتے ہیں، تو ہمارے بے چارے دلوں میں وہ خوشی پہنچاتا ہے، کہ تمام گرد و نواح کی مایوسی اور مردہ دلی دور ہوجاتی ہے۔ اس وقت اکثر غزل کا دوسرا شعر بر حسب حال ہوجاتا ہے ؎

چار مل بیٹھے جہاں پھر وہی رنگ وہی ترنگ — کچھ عجب لطف ہے رندانہ قدح خوار کے ساتھ

میں، ایک پرلطف اسلامی سیکھ۔ چھپڑ کر، ماہ مبارک رمضان بسر کرنے، حیدرآباد جیسے اسلامی مرکز میں آیا تھا۔ خیال نہیں بلکہ یقین کامل تھا کہ حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ نہ مجھ جیسے ۔۔۔۔ سے ملاقات کرسکیں گے اور نہ میں جو انکا دعاگو ہوں، وہ اسلام کے خادم ہیں، اور جو اسلام کے خادم ہیں میں اُن کا خادم ہوں۔ میں کیوں بیکار اعلیٰحضرت سے مل کر انکی اور اپنی دشواریوں میں اضافہ کروں؟

حیدرآباد آیا تھا علیگڈھ کے کھلنڈروں میں آیا تھا، کہ بڑے بڑے لوگ ملاقات کریں یا نہ کریں یہاں کے ذمہ دار اور بڑے بڑے افسر مہمان نوازی کریں یا نہ کریں کم از کم علیگڈھ کے بڑے چھوٹے اور بڑے اولڈ بوائز، جن کی تعداد، حیدرآباد میں ایک ہزار سے اوپر ہوگی، وہ تو مجھ کھلنڈرے کے پاس دوڑے آئیں گے، اپنی ثقاہت اور وجاہت کو تھوڑی دیر کیلئے بالائے طاق رکھ کر پیدل نہ سہی موٹروں ہی میں سہی، مجھ تک ضرور پہنچیں گے، میرے ہاتھ پاؤں دبائیں گے، خشک و تر دعوتیں کریں گے، نقد نذرانے پیش کریں گے میکدہ سے چھوٹے ہوئے کو اگر میکدہ نہیں تو کم از کم سندھی خانہ تک پہنچائیں گے، اور میں داغ مرحوم کا ایک بیت

پیمانہ انشا شعر پڑھوں گا جس سے خود میری ثقاہت میں فرق آنے لگا اور جوانوں کی طبیعت تازہ ہو جائیگی وہ مجھے دق کریں گے اور میں بار بار انکی ہمت افزائی کیلیے یہ شعر پڑھ دونگا سے

ہوش سب تو دیا کیا کہنا کیجئے کچھ تو کہ ہم بھی ہمت ہو گی؟

مگر یہاں دیکھتا ہوں تو تمام کھلنڈرے اپنے اپنے طریقہ سے مشغول رہے ہیں۔ نہ میخانہ ہے نہ بت خانہ معلوم ہوتا ہے کہ سب افیم (افیون) کی نشہ میں بے حس و حرکت پڑے ہیں۔ مجھ غریب نے شروع میں افیم کے محکمہ میں نوکری کی تھی، ہزاروں من خالص افیم ان ہاتھوں سے تقسیم کی مجھ پر تو افیم کا اثر الٹا ہوا۔ یہاں پر جہاں چانڈو خانے حکماً بند کر دیے گئے تھے، ان عزیزوں نے گھروں میں خفیہ طور پر اپنی تفریح اور دلبستگی کے لیئے قائم کر لیئے ہیں۔ اپنے مکان سے ہل کر دوسرے بھائی کے مکان پر جانا، مل کر آپس میں کچھ میل کی باتیں کرنا، ایک ایسا سخت ترین مرحلہ ہو گیا ہے کہ سب لوگ

ارے بھائی! جانے بھی دو

کہہ کر اپنے اپنے گھر میں پڑے مردہ دلی کی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

میں اصغر صاحب کے یہاں مہمان ہوں۔ بڑے بیرسٹر ہیں، بڑے زندہ دل ہیں، بڑے مہمان نواز ہیں، انکے دسترخوان پر کھانا بہت سا موجود رہتا ہے تقاضے کر کر کے بھوکے ہوتے کو کھلاتے، اور موٹا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جب میں کام کا ذکر کرتا ہوں، علیگڈھ کی اصطلاح میں عیاشی کا ذکر کرتا ہوں، تو فوراً وہ لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں جسکے ذریعہ سے ہائیکورٹ کے غریب ججوں کو دھوکہ دے دے کر قانون کی بھول بھلیاں میں ڈال دیتے ہیں، پھر بھی رجوع ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

آپ حیدر آباد کی حالت کو نہیں جانتے

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ ایک تو محبت ہے دوسرے اُن کو اور انکے ساتھیوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتا بلکہ پیار سے، محبت سے، خوشامد سے، حیلہ سازی سے، پرانے علیگڈھ کے قصے یاد دلا دلا کر، دوستوں کے لطیفے سنا سنا کر لندن کی زندگی کے کارناموں کی طرف اشارے کر کے، ان کو ابھارتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہنستے ہیں، اور ایک آدھ پھریری لاتے ہیں، اسکے بعد اپنی طرف سے ہر کام و امداد پیش کر دیتے ہیں کہتے ہیں گھر پر سلام کرا لو کہ پڑے

اور قانونی کتابیں لیجاؤ، گھر کا سامان قرق کراکر لیجاؤ، ولایت سے اکسفورڈ کی لائی ہوئی تصویروں کو لیجاؤ، روپیہ پیسہ جو کچھ ہاتھ لگے لیجاؤ، مگر بھائی! دوسرے کے یہاں نہیں جائیں گے۔

تم حیدرآباد کو نہیں جانتے

پیر بنان کا یہ حال ہے تو میں اوروں کا کیا ذکر کروں!

بیچارہ عظمت اللہ (لفٹنٹ کرنل محمد عظمت اللہ سردار بہادر) کمانڈنگ سکنڈ امپریل لانسرس، میرے آنے کی خبر پاکر، میرے پاس مع اپنی وردی اور تمغوں کے آتا ہے، اور میرے راضی کرنے کے لئے کچھ فلسطین کے دلچسپ حالات بیان کرتا ہے، تھوڑی سی بحث ہندوستان کے معاملات پر کرتا ہے، اور چلا جاتا ہے۔

سیکڑوں اولڈ بوائز ہیں، کس کس کا نام لوں۔

راس مسعود یعنی نواب مسعود جنگ سے ملا۔ ان حضرت کے پیدا ہوتے وقت میں علیگڈھ میں تھا، بسم اللہ کی جو شیرینی بٹی تھی اُس کا بھی دوہرا حصہ لیا تھا، روزمرہ دیکھتا تھا کہ دو سفید گھوڑوں کی گاڑی میں سرسید کے ہمراہ ہندوستان کے ساتھ لٹکائے ہوئے یہ جناب نواب مسعود جنگ بہادر بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ دن بھی دیکھے ہوئے ہیں، اور دیکھتا ہوں کہ اب وہ آکسفورڈ کے گریجویٹ بنے ہوئے مجھ سے دو تین اچھے اونچے انگریزی اردو میں فرفر باتیں کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک آدھ بات ایسی بھی کر جاتے ہیں، جس سے سید محمود مرحوم کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ وہی سید محمود جو علم و فضل، لطائف و ظرائف، طبیعیات و سائنس کے دریا، اور ہر قسم کی خوبیوں کا دلچسپ مجموعہ تھے۔ مگر جب کام کا ذکر آتا ہے تو میرے کان وہی سنتے ہیں۔

تم حیدرآباد کو نہیں جانتے

قادر بیگ یعنی لفٹنٹ کرنل مرزا قادر بیگ سردار بہادر، میر محمد شفیع، میر عبدالصمد کی زبان پر بھی اسی کا ورد ہے۔

نواب صمد یار جنگ، جو علیگڈھ میں عبدالصمد مظہر کے نام سے پکارے جاتے تھے، اور محمد علی بھیج کی یاد دلاتے تھے، اور میرے سامنے محمد علی کے خوش کرنے کیلئے طرح طرح کے ادہر اُدہر سے جمع کئے ہوئے قصے

اپنی حیثیت آواز میں سمانا اپنا فخر سمجھتے تھے، اُن سے بھی ملنے گیا۔ دوپہر کا وقت تھا، میں عالی خوار ۔
غرضوں میں سرشار، دوپہر کے تین بجے اُنکے بنگلہ پر پہنچا تھا۔ سو رہے تھے۔ جگاؤ نہ ہوئے، ڈرا کیونکہ

یہ حیدرآباد ہے

اور ملنے اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اُن سے بھی حیدرآباد اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے انکو خوش کرکے کچھ کام کی
باتیں کرتا، تو غالباً وہی آواز کانوں میں آتی کہ

تم حیدرآباد کو نہیں جانتے

چھوٹے بڑے یہاں تک کہ غلام نجیبن کی زبان پر بھی حیدرآباد کا نام زبان پر آجاتا ہے۔ یہ حیدرآباد کیا ہوا، ہمیں
میرے گلے کا جنجال ہو گیا، سب آرام طلب عیش پسند مجھے فقرے سناتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بارہی بارہی ارشاد یا ہمہ نہ
اس بھوتے سے دل میں استدراگ بھری ہے کہ حیدرآباد تو ایک اسلامی مرکز ہے، یہاں کے
لوگوں میں باوجود کمزوریوں کی بہت کچھ اسلام کا درد ہے، خوبیاں ہیں مٹی اور راکھ میں دبے ہوئے ہیں۔
مگر اسلامی چنگاری اگر زندہ ہے، حیدرآباد کو گرما کر، یہاں کے مسلمانوں کو اللہ کے کاموں کی طرف متوجہ کیا
تو کیا بڑا کام کیا۔ قطب شمالی، جہاں ہزاروں میل برف ہی برف ہے، اگر وہاں ایک دل جلا مسلمان اپنے
خدائے برتر کے بھروسہ پر پہنچ جائے، اور صدق دل سے ایک آہ لگائے، تو برفستان کو پگھل کر دریا کر دیگا۔ آپ کو
میں علیگڈھ کا کھلنڈرا، کاہل سست عیش و آرام کا چاہنے والا فضول باتوں اور گپوں میں وقت
ضائع کرنیوالا، جس کو سوائے کھیل کود ہنسی مذاق کے، دوسرا کام نہ تھا، مگر جب سے اللہ کا سپاہی بننے کی
دل میں خواہش ہوئی ایک ایسی طاقت پاتا ہوں جو کبھی تو الگ ــــ برف کی سل بھی نہیں دبا سکتی۔
داغ مرحوم پر لوگ ہنستے ہیں انکو بڑا شاعر بھی نہیں گنتے، مگر میں بہت کھلنڈرا تو غالب کے بعد
انکے کلام میں بہت کچھ لطف اور طاقت پاتا ہوں۔ خوب لکھ گیا ہے ؎

پڑا فلک کو کسی دل جلے سے کام نہیں جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

ہم لوگ بچپن میں ہندوستان میں ٹیسو نکالا کرتے تھے۔ تین سینٹوں کے اوپر ایک صورتی، اُس میں
ایک چراغ رکھا ہوا۔ اس ٹیسو کو لے کر اپنے عزیزوں کے گھر پہنچتے تھے۔ زبان سے بھی کہتے تھے، اور عمل بھی

اسی پر کرتے تھے کہ "ٹھیسوا کو کرے، ٹھیسو کر کرے، ٹھیسو لے ہی کے ٹلے"۔

کھلنڈرو! علیگڈھ کے کھلنڈرو! ذرا ہوش میں آؤ۔ زمانہ رنگ بدل رہا ہے، دنیا تہ و بالا ہو رہی ہے، ہندوستان نیا رنگ لا رہا ہے۔ تم کو علیگڈھ کے بانی نے اسکی تعلیم دی تھی کہ تمھارے سیدھے ہاتھ میں سائنس و فلسفہ رہے، بائیں ہاتھ میں ریاضی اور دوسرے علوم اور سر پر تاجِ "کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اپنی بے حسی اور جمود سے اپنی مادر کالج اور خود اسلام کیلئے اگر آج سوتے رہے تو ننگ ملت اور بے حمیت ثابت نہ ہو گے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بہت سے تنگ خیال اولڈ بوائز ایسے ہیں کہ اگر ملتے ہیں تو چند خاص دوستوں سے اور پھر بھی اپنے آپ کو اللہ کے خاص ہستیوں کا جتھا خیال کرتے ہیں۔ جن باہمت اور غریب مسلمانوں نے علیگڈھ کی بنا ڈالی تھی، ان کا منشا یہ تھا، کہ ہم میں کا ہر ایک اسلام کا مجاہد ہو، بلکہ اسکے ہاتھ میں علم و عمل کی روشن مشعل ہو، اور تمام دنیا کو اسلام کے نور و صحبت سے منور کر دے۔ مگر۔

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

میں حیدرآباد میں سیر تماشے، تفریح، اور سونے کے لئے آیا ہوں۔ انشاء اللہ! میری سیر تفریح بھی عزیز دوستوں کے دلوں میں پھر وہی محبت اور زندگی کی لہر پیدا کر دیگی، اور مسلمان حیدرآباد کے مسلمان، اس سب سے بڑی ہندوستانی ریاست کے مسلمان اس سب سے بڑی اسلامی ریاست کے مسلمان جن کا بادشاہ ایک فقیر کی زندگی بسر کرتا ہے، کم از کم اولڈ بوائز تو عیش و عشرت اور فضول خرچی و لغویات سے کنارہ کش ہو کر اللہ کے کام کی طرف متوجہ ہوں گے، اپنے خدائے برتر کی دی ہوئی درست عقلی قوت کو اللہ کے دین کی ترقی میں صرف کریں گے۔ اسلام کے ایک ادنیٰ غلام، یعنی اپنے آقا اعلیحضرت شاہ دکن اور انکی رعایا کی خدمت کر کے دین و دنیا کی فلاح حاصل کریں گے۔

اس جمود کو دور کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ملک و ملت کی خدمت کرنا، صرف بیگار کے طریقہ سے نہیں، حاکم کے ڈر سے نہیں، بلکہ خود دل کی امنگ سے کسی کام کو کرنا ہمارا فرض ہونا چاہئے۔ رہا میں تو تم سب خوب جانتے ہو، اب تو سارے ہندوستان کے مسلمان جانتے ہیں، ساری اسلامی دنیا جانتی ہے میں تمھاری اہل انکاری سے مرعوب ہونیوالا نہیں ہوں۔

جھڑکی سہی، ادا سہی، چین جبیں سہی
یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی، نہیں سہی

مجھ دیوانے سے بحث نہ کرو، فضول منطقی دلائل سے نہ اپنا وقت ضائع کرو اور نہ میرا۔ اپنی حد کے اندر رکر، جو کچھ کر سکتے ہو، ملک وملت کے لئے کرو۔ خدا اجر دے گا۔ اگر سوتے رہوگے، تو سوائے خواری اور بربادی کے تمھیں کچھ نہ ملے گا۔ مجھے میرے راستہ پر چھوڑ دو۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

نے پیروی قیس، نہ فرہاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

السعی منی والاتمام من اللہ! کوشش کرنا ہمارا کام ہے، کامیابی دینا یا نہ دینا اس مالک کی قدرت میں ہے۔

عید تک حیدرآباد میں رہوں گا، اور جانتا ہوں کہ سب نہیں تو بہت بڑی جماعت اولڈ بوائز سے مل لینا ممکن ہے۔ مل کر وہ بھی خوش ہوں یا ہوں، مگر ایک تھکا ہوا اسلام کا سپاہی تو ضرور خوش ہوگا۔ خدا حیدرآباد کو "حیدر" آباد رکھے، اور خدا اُسکے بادشاہ کو اسلام وملک کی خدمت کی اور توفیق عطا فرمائے۔ یاد رکھو کہ تمھاری ساری شیخی، تمھاری ساری عزت، تمھارا سارا چین آرام اس پر منحصر ہے کہ حیدرآباد "حیدر آباد" رہے، اور اعلیحضرت میر عثمان علی خاں بہادر، جن کے نام سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی کبھی کبھی یاد آجاتی ہے، خدا ان دونوں کو، اور انکے متعلقین کو زندہ وسلامت رکھے، اور ہمیشہ صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت فرمائے۔

تمھارا ایک مست کھلنڈرا

جفا پہ جان دیتے ہیں، ستم پر تیرے مرتے ہیں
یہ ناکام محبت اب تو یہ ہے، کام کرتے ہیں

ہمیں یہ خبر بہت دیر سے ملی کہ ہمارے غریب الوطن بھائی خاں صاحب احتشام الدولہ خاں صاحب اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ کویت وخلیج فارس ساکن کوٹ ضلع فتح پور ہسوا نے سلطان سے کراچی میں وفات پائی، جہاں مرحوم علاج کی غرض سے لائے گئے تھے۔ مرحوم نے ماتم کرنے کیلئے بی بی بچوں کے سوا ضعیف ماں باپ کو چھوڑا ہے، جن کے ساتھ ہمیں دلی ہمدردی ہے۔
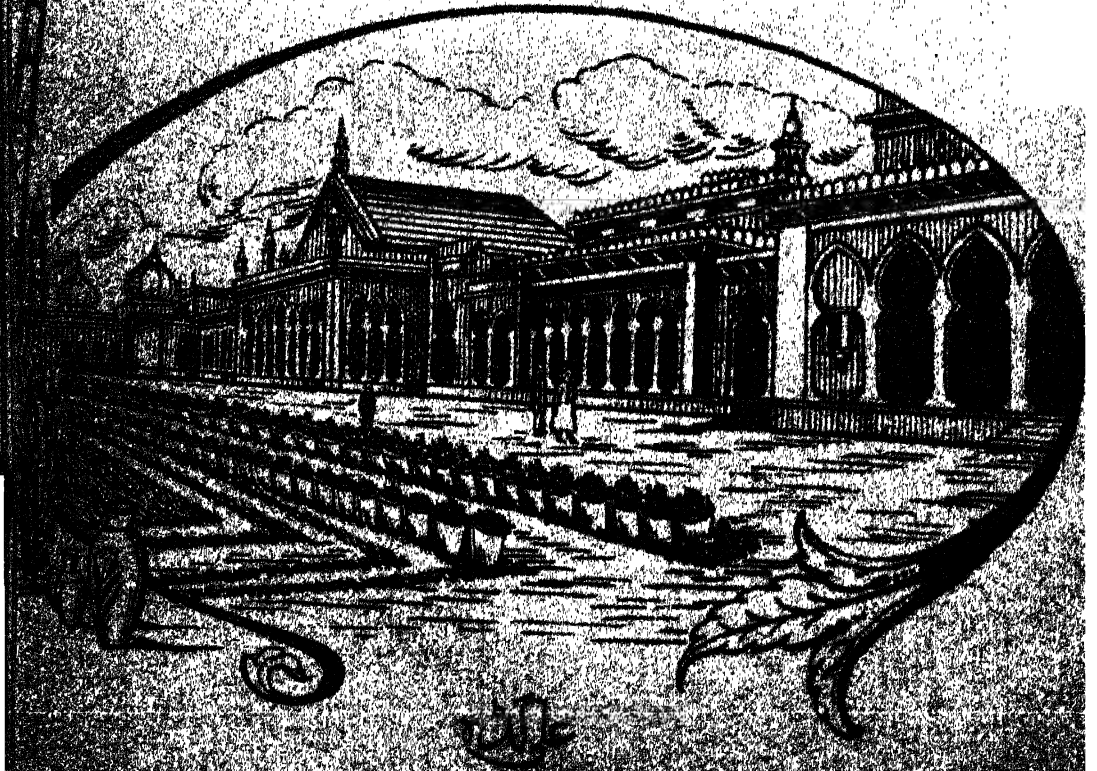
اولڈ بوائے

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۱۲-۴۸ سلطانپورہ حیدرآباد دکن سے شائع کیا

یہ مسٹر عظمت اللہ خاں بی۔ اے (مرحوم) کی دلچسپ اور اچھوتی نظموں کا وہ لاثانی مرقع ہے جسے انکی شاعرانہ عظمت کا صحیح ترجمان کہا جا سکتا ہے۔ مرحوم کی دلرُبا اور نکھری ہوئی نظموں کی ملک نے جسقدر قدر کی ہے اسی بھروسہ پر بصرف زرِ کثیر نہایت اعلیٰ پیمانے پر انکی طباعت کا بھی انتظام کیا گیا ہے اس کا مقدمہ مصنف مرحوم کا خود نوشتہ اور اردو ادب میں ایک ایسا بے نظیر اضافہ ہے جسنے شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

جو حضرات کہ سخن سنجی اور سخن فہمی کا ذوق سلیم رکھتے ہوئے دراس بات کے دل سے خواہاں ہیں کہ اب اردو شاعری کا نیا دور شروع ہو ان کیلئے اس مجموعہ اور مقدمہ کا مطالعہ حقیقی مسرت کا باعث ہوگا۔

اس مجموعہ کی مانگ ملک کے ہر گوشے سے ہو رہی ہے آپ اپنا آرڈر ابھی سے بُک کرا لیجئے ورنہ طبع ثانی تک انتظار کرنا پڑے گا۔

فرمائشات ذیل کے پتہ پر روانہ کی جائیں۔

منیجر اولڈ بوائے بُک ڈپو سلطانپورہ حیدرآباد دکن

نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کے نیاز مند اور ہمارے مخدوم و مکرم جناب نیاز مند (تخلص) نے تحریر ذیل ہمارے پاس درج رسالہ کرنے کی غرض سے روانہ فرمائی ہے۔ اولڈ بوائے کی کشش، یا برادر مکرم مولوی محمد یعقوب صاحب (ڈپٹی پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی) کی محبت کے اثر نے...... کے دور دراز مقام سے جناب نیاز مند کو اس تکلیف فرمائی کیلئے مجبور کیا، اور ناظرین رسالہ کو علمی سبق حاصل کرنے کی غرض سے اُنھوں نے اپنے سالہا سال کے تجربات کو "اولڈ بوائے" کے سپرد فرما دیا۔ اللہ کرے یہ صاحب پھر بھی کبھی کبھی کچھ لکھتے رہیں بلکہ مولوی محمد یعقوب کو بھی اپنے اس مرض میں شریک فرمالیں۔ ہم مسرت کے ساتھ دوسرے قارئین کرام کے آرا کا انتظار کرتے رہیں گے۔

صاحب مضمون نے اپنی تحریر کے دو حصے کئے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے اجمال کی تفصیل ہیں۔ جو خط اس تحریر کے ساتھ شریک ہے ہم چاہتے ہیں کہ ارباب علیگڈھ اسپر توجہ فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ آخر مئی سنہ ۲۷ء سے اب تک عملی طور پر کسقدر کام انجام پذیر ہوا ہے۔ صاحب تحریر نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے خیال کی توضیح فرمائی ہے اور اگر اس پر توجہ فرمائی گئی تو بہت سے فوائد کی اُمید کیجاسکتی ہے۔ کیا جناب نواب صاحب، یا پرو وایس چانسلر صاحب، یا دونوں صاحبان ان تجاویز کو بغور ملاحظہ فرما کر ہمیں اطلاع بخشیں گے کہ ان امور سے متعلق کیا کیا جا رہا ہے؟

اولڈ بوائے

مسلم یونیورسٹی میں اساتذہ طلباء و عملہ کی ضروریات کے اخراجات سالانہ

(۱) ٹوپی۔ جراب۔ بنیان۔ رومال۔ نکٹائی۔ کالر۔ بٹن۔ پیٹی۔ ہیٹ (Hat) مفلر۔ تولیا۔ گیلس (Braces) تیل۔ خوشبو۔ کنگھی۔ برش۔ منجن۔ صابن۔ استرہ۔ سپ۔ چاء۔ سگریٹ۔ جیم (Jam) کاغذ۔ قلم۔ روشنائی۔ دوات وغیرہ .... دو لاکھ ستر ہزار

(۲) پارچہ جات پوشیدنی۔ لحاف۔ چادر۔ توشک۔ دری وغیرہ .... تین لاکھ

(۳) سامان و مرمت برائے ضروریات طلباء یونیورسٹی .... پچیس ہزار

(۴) بوٹ۔ فیتے۔ اور مرمت .... ایک لاکھ

(۵) بسکٹ۔ ڈبل روٹی۔ کیک وغیرہ .... ایک لاکھ

(۶) مٹھائی اور شکر .... پچھتر ہزار

(۷) دھلوائی پارچہ جات .... ایک لاکھ

(۸) فوٹوگراف اور تصاویر .... پندرہ ہزار

(۹) سامان کرکٹ۔ فٹ بال۔ ہاکی۔ ٹینس وغیرہ .... دس ہزار

(۱۰) میوہ .... تیس ہزار

(۱۱) گھی۔ مکھن۔ دودھ۔ دہی۔ بالائی۔ برائے ضروریات طلباء ڈائننگ ہال .... دو لاکھ

(۱۲) کتب .... پچاس ہزار

میزان کل پونے تیرہ لاکھ

یہ تخمینہ کئی ماہ کی دریافت کے بعد قائم کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کی آبادی تین ہزار کے قریب ہے تاہم

احتیاطاً فرض کرلیا جاوے، کہ اخراجات کی میزان دس لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔

صورت موجودہ

مدّ ۱۔ یعنے بساطی خانہ کیلئے یونیورسٹی میں کوآپریٹو سٹورس ہے۔ سامان معمولی بساطیوں سے خرید کر فروخت کیا جاتا ہے۔ نرخ عموماً بازار سے گراں ہے۔ بیشتر ضروریات مہیا نہیں کی جاتیں۔ حساب قابلِ اطمینان نہیں۔ سنا گیا کہ آمد کا روپیہ بنک میں نہیں رکھا جاتا۔ معلوم ہوا ہے کہ پچھلے سال فروخت فقط سولہ ہزار کی ہوی ہے۔ نفع نہ ہونے کے برابر ہے۔

پارچہ جات اور بوٹ وغیرہ شہر علی گڈھ یا بیرونجات سے تیار کرائے جاتے ہیں یا انگریزی دکانوں سے منگوائے جاتے ہیں۔ شہر اور بیرونجات میں خرید کیلئے جانے پر طلبا ایک معقول رقم کرایہ کی خرچ کرتے ہیں۔ مال عموماً ناقص ہوتا ہے چیزوں کے لئے بار بار تقاضا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ہے۔ کہ میرے بچوں کے کپڑے دہلی میں بنتے ہیں اور بوٹ میرٹھ۔ آگرہ۔ یا کانپور میں۔

کمرے کا سامان وغیرہ ہر ایک طالب علم گراں قیمت پر بازار سے خریدتا ہے۔ چیزیں پائدار نہیں ہوتیں۔ اور یونیورسٹی سے رخصت ہونے پر اَونے پَونے بیچ دی جاتی ہیں۔

بُک ڈپو میں کتابوں کی بہم رسانی کا پورا انتظام نہیں۔ سال گزشتہ میں بچوں کو کئی مہینے تک کتابیں نہیں مل سکیں۔

گھی۔ دودھ۔ مکھن۔ میں عموماً آمیزش ہوتی ہے۔

دس بارہ لاکھ روپیہ کا بیشتر حصہ غیروں کی جیب میں جاتا ہے۔

اسوقت ہندوستان کی تجارت غیر قوموں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان وقتاً فوقتاً جوش میں آکر دکانیں کھولتے ہیں لیکن ناتجربہ کاری، سرمایہ کی کمی، خریداروں کی نادہندگی، مسلمانوں کے عدم تعاون، اور غیروں کے مقابلہ کی وجہہ سے چند روز میں سرمایہ ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اِن وجوہات سے وہ مسلمان جن کے پاس روپیہ ہے کاروبار شروع کرنے کو تیار نہیں۔ چندوں، اور کمپنیوں کے متعلق ملک میں عام طور سے بے اعتباری پھیل رہی ہے۔ پس ان ضروریات کی بہم رسانی کے لئے کمپنی بنانے کا خیال عبث ہے اور انہیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

"تجویز"

ضروریات مندرجہ بالا کے بہم پہنچانے کیلئے مسلم یونیورسٹی کوآپریٹیو سٹورس یا سوسائٹی قائم کیجاوے۔
یونیورسٹی کا ہر ایک فرد لازماً مجوزہ سٹورس کا ممبر ہو۔ ممبران کورٹ و سابق طلبا، حصہ دار ہوسکتے ہیں کسی شخص کو ایک سو سے زیادہ حصص خریدنے کی اجازت نہیں، قیمت فی حصہ پانچ روپیہ۔
انتظامیہ کمیٹی میں اساتذہ۔ طلباء۔ اور سابق طلباء ہوں لیکن بیشتر حصہ طلباء کا ہو۔
کاروبار کی نگرانی کیلئے تنخواہ دار منیجر اور حساب کتاب رکھنے کے لئے تنخواہ دار اکونٹینٹ ہو۔ ہر ایک شعبہ کیلئے ایک نائب منیجر تنخواہ دار۔ ان جملہ عہدہ داران کے اسسٹنٹ طلباء ہوں۔
جملہ مال کمیشن پر خریدا جائے، یا تھوک فروش دکانوں اور کارخانوں کی ایجنسی حاصل کی جاوے۔ مال فروخت ہونے پر یا ماہواری فروخت پر حق کمیشن وضع کر کے دکاندار یا کارخانہ دار کی رقم ادا کی جائے۔ حق کمیشن پانچ فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ ملنے کی اُمید ہے۔
سٹورس میں فروخت نقد ہوگی۔ خاص صورتوں میں والد یا ولی کی منظوری اور افسر مجاز کی اجازت سے بیس پچیس روپیہ تک اشیاء قرض پر دیجاسکتی ہیں بدیں شرط کہ آیندہ ماہ کے یونیورسٹی بل کے ہمراہ رقم وصول کر لی جائے گی۔

سب سے پہلے بساطی خانہ اور بدات نمبر ۱۹ اور ۱۲ کا کام شروع کیا جاوے۔ اسکے بعد درزی خانہ۔ شوز فیکٹری۔ بیکری یعنے بسکٹ ڈبل روٹی وغیرہ بنانے کا کام۔ لانڈری یعنے پارچہ جات کی دھلوائی کا کام بذریعہ مشین۔ میز کرسی وغیرہ بنانے کا کارخانہ۔ ڈائری فارم یعنے دودھ مکھن کا کام بتدریج شروع کئے جائیں۔

"منافع اور اسکی تقسیم"

فروخت کے لئے مال زیادہ تر کمیشن پر یا بطور ایجنسی کے حاصل کیا جائے گا اور نقد پر بیچا جائے گا۔ اشتہارات وغیرہ پر خرچ کم ہوگا۔ اور طلباء بطور اسسٹنٹ کے سٹورس کے مختلف حصوں میں کام کریں گے اسلئے کام پورے طور پر جاری ہوجانے سے ایک لاکھ روپیہ سالانہ خالص منافع کی توقع بیجا نہیں اس کو حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جائے۔

(۱) ریزرو فنڈ ---------------- پچیس ہزار

اس طریقہ سے سوسائٹی کے پاس معقول سرمایہ جمع ہوتا رہے گا۔

(۲) حصہ داروں کو بونس یا منافع ---------------- چالیس ہزار

(۳) وظائف خصوصًا ان طلباء کو جو سٹورس کے مختلف حصوں میں کام کریں ---- پندرہ ہزار

(۴) لائبریری اور اخبارات ---------------- دس ہزار

یونیورسٹی میں لائبریری ضروریات کے مطابق نہیں ہے اخبارات کافی نہیں ہیں۔

(۵) کرکٹ۔ رائڈنگ سکول۔ جم نیزیم و دیگر کھیلیں ---------------- دس ہزار

چندہ اور آمدنی کی کمی کیوجہہ سے کوکٹ اور رائڈنگ سکول عمومًا دست سوال پھیلاتی رہتے ہیں۔ تربیت جسمانی کا انتظام اسوقت بالکل نہیں۔ اس کیلئے سامان اس رقم سے مہیا ہوسکتے ہیں۔

"دیگر فوائد"

(۱) طلباء کو نفع پر روپیہ لگانے کا شوق پیدا ہوگا۔ اور وہ تجارت کیطرف مائل ہونگے۔ اور ان میں مل جل کر کام کرنے کا مادہ پیدا ہوگا۔

(۲) ممبروں کو چیزیں عمدہ۔ ارزاں۔ اور یونیورسٹی کی حدود کے اندر میسر ہوسکیں گی۔

(۳) فضول خرچی اور قرض پر چیزیں خریدنے کی عادت کم ہوگی۔

(۴) ہر سال پچاس ساٹھ طلباء کاروباری زندگی کیلئے طیار ہوکر علی گڈھ سے نکلیں گے۔ جن تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمت حاصل کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں، وہ تھوڑے سے سرمایہ سے اپنی معاش پیدا کرسکیں گے۔ اور مختلف مقامات پر دوکانیں جاری ہونے سے یہ تحریک رفتہ رفتہ ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیل جائیگی۔

(۵) اخراجات مندرجہ بالا کے علاوہ یونیورسٹی میں تعمیر، چھاپہ خانہ، اجناس، گوشت، مرغی، انڈا سبزی، ترکاری اور بہت سے اور سلسلے ہیں، سٹورس کا میدان عمل رفتہ رفتہ وسیع ہونے پر زراعتی

فارم وغیرہ جاری ہو سکتے ہیں۔ اور تعمیر کا کام سنبھالا جا سکتا ہے۔

ٹیکنیکل تعلیم کے سلسلے میں علیگڈھ میں عملی کام ہو سکتا ہے گویا مسلم یونیورسٹی صحیح معنوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کی "درس گاہ" ہو جائے گی۔

تعلیم کے معنے محض کتابوں کا پڑھا دینا نہیں ہے۔ بلکہ طلباء کو زندگی کی کشمکش کیلئے طیار کرنا ہے۔

---

۱۰ رمئی ۱۹۲۶ء

مخدومی و معظمی نواب صاحب قبلہ دام عنایتہٗ۔ وعلیکم السّلام

گرامی نامہ کل شام کو صادر ہو کر باعث مسرت و افتخار ہوا۔

کواوپریٹو سکیم کے متعلق کاغذات میں جناب والا کے دفتر سے لے آیا تھا۔ سید عبدالجلیل صاحب کے نوٹ پر غور کرتا رہا۔ اس اثنا میں مخدومی ڈاکٹر صاحب اس تجویز کے متعلق وقتاً فوقتاً تحریر فرماتے رہے۔ کل صبح ان کا والا نامہ صادر ہوا جس سے معلوم ہوا کہ جناب والا کے مشورہ اور منظوری سے دودھ مکھن اور بساط خانہ کا ٹھیکہ دینے کی تجویز ہوئی ہے اور درزی خانہ اور شو فیکٹری کی فکر ہو رہی ہے۔ الحمد للہ۔

مخدومی ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے، کہ جناب والا میری تجاویز پر حسب صورت حالات عمل فرمانے کو تیار ہیں۔ جزاک اللہ۔

کوآپریٹو سکیم کے متعلق میرا پہلا نوٹ مفصّل ہے۔ وہ اور سید عبدالجلیل صاحب کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں چند باتیں اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت خدا کے فضل و کرم سے ہماری یونیورسٹی میں طلباء کے تعداد میں روز افزوں ترقی ہے اور اسپر کارکنان یونیورسٹی بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں لیکن یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جب یہ ابنوہ فارغ التحصیل ہو کر علیگڈھ سے رخصت ہونگے، تو یونیورسٹی کی تعلیم ان کو روزی کمانے میں کہاں تک مدد دیگی سرکاری ملازمت عموماً نوجوانوں کا نصب العین ہے لیکن اسامیاں محدود ہیں اور اس سلسلہ میں جو مشکلات ہمارے نوجوانوں کو پیش آ رہی ہیں وہ جناب والا سے مخفی نہیں۔

قانون پیشہ اصحاب کی تعداد ہر جگہ اسقدر بڑھ گئی ہے کہ سوائے خاص قابلیت کے نوجوانوں کی اس سلسلہ میں کھپت اور ترقی کی گنجایش نہیں ہمارے طلباء کے داخلہ پنجاب کی رکاوٹ خدا کرے آپ کی سعی سے رفع ہو جائے۔

یہ تو کیفیت ہے ان طلبا کی جو بی۔اے یا ایم اے ایل ایل بی ہیں۔ یا اسی قسم کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں لیکن بہت سے طلباء ان ڈگریوں کو حاصل کرنے سے پہلے علی گڈھ سے چلے جاتے ہیں تعلیم کی وجہ سے ان کو معمولی کام کرنے سے عار ہوتا ہے۔ بیکاری میں جدّی جائداد کی آمدنی یا فروخت پر انکی گذر ہوتی ہے۔ عام مسلمان گھرانوں کی یہ حالت ہے کہ روپیہ پیسے کی قدر نہیں۔ کفائت شعاری کو کنجوسی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کاروباری طریقوں سے قطعی ناواقفیت ہے۔ ایسے گھرانوں کے بچے ان معاملات میں جیسے کورے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں ویسے ہی کورے واپس جاتے ہیں بیس تیس روپیہ ماہوار کی سرکاری نوکری کیلئے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ وہ بھی دوسری قوموں کے نوجوانوں کی طرح ہزار دو ہزار کے سرمایہ سے اپنا گذارہ کر سکتے ہیں۔ اگر خیال اسطرف مائل بھی ہو تو کامیابی کی اُمید نہیں ہوتی۔ کیونکہ دکانداری کے لئے انٹرنس اور ایف اے تو کیا بی۔اے، ایم۔اے کی ڈگریاں بیکار ہیں۔ بلکہ ایک خاص قسم کی تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں کے صغیر سن بچے محض اپنی تربیت کی وجہ سے دکانداری کے اصولوں اور طریقوں کو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں۔ تجارت بالعموم غیر قوموں کے ہاتھ ہے اور مسلمانوں کی کمائی غیر قوموں کی جیب میں جاتی ہے نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہماری قوم میں افلاس اور بیکاری روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

ہندوستان کی یونیورسٹی میں عام طور سے یہ نقص ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ عموماً اپنی روزی کمانے کے ناقابل ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ نوٹ چسپاندہ۔

مجھے اور یونیورسٹیوں سے سرکار نہیں۔ ہماری یونیورسٹی کا یہ مقصد ہے کہ تعلیم دین کی بنیاد پر دنیاوی تعلیم کی عمارت ہو تعلیم دین کا مضمون تو مجھ گنہگار کی قابلیت اور فہم سے بالاتر ہے۔ دنیاوی تعلیم کے متعلق یہ عرض کروں گا کہ ہماری یونیورسٹی کو جو مسلمانان ہند کا تعلیمی مرکز ہونے کی دعویدار ہے زمانہ کی ضروریات سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

چاروں طرف سے پکار ہے کہ مسلمانانِ ہند کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ بچاؤ کی یہی صورت ہے کہ وہ تجارت کی طرف مائل ہوں۔ امریکہ اور جاپان نے جس قدر ترقی کی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ بایں ہمہ وہاں تجارتی یونیورسٹیاں اور کالج جاری ہوتے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو نوٹ چسپاں شدہ۔

برادرانِ وطن کا یہاں تجارت میں غلبہ ہے لیکن وہ بھی اس بارہ میں غافل نہیں۔ چند دن ہوئے کہ لاہور میں ایک تجارتی مدرسہ کا افتتاح ہوا ہے۔

ہمارے ہاں تجارت تو درکنار صنعت و حرفت کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ سائنس، ٹیکنیکل، اور میڈیکل کالجوں کی تجویزوں کو عملی صورت میں لانے کیلئے کئی برس اور لاکھوں کی رقمیں درکار ہیں۔ میرے خیالِ ناقص میں تجارتی تعلیم کا شعبہ ہماری یونیورسٹی میں فوراً قائم ہونا چاہئے۔ اور اس علم کے ساتھ عمل کو ملانے کیلئے کوآپریٹو سٹورس سے بہتر ترکیب میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اسی خیال سے میں نے اسکی تحریک کی۔ اور میری نہایت ادب سے گذارش ہے کہ سٹور کی سکیم پر غور کرتے وقت اس امر کا ضرور لحاظ فرمایا جاوے۔

دکان کی کامیابی کیلئے چار چیزیں لازم ہیں۔ اول سرمایہ، دوم مال ارزاں نرخ پر خریدا جائے تیسرے یہ کہ وہ مال فروخت اور جلد فروخت ہو جائے۔ اور چوتھے یہ کہ وہ بالکل کاروباری طریقہ پر چلائی جائے میں نے اس بارہ میں مسٹر سٹر کلینیڈ آئی سی۔ ایس رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز پنجاب اور خان عبدالمجید خاں صاحب رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز ریاست کشمیر سے گفتگو کی ہے، اور وہ میرے ہم خیال ہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہئے۔ کہ یہ چاروں لوازمات یونیورسٹی میں مہیا ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

اول سرمایہ۔ اگر یونیورسٹی کے ہر ایک فرد پر کوآپریٹو سٹوریس کی ممبری لازم کر دی جائے۔ اور اولڈ بوائز کو شمولیت کا حق دیدیا جائے اور ممبری کی فیس یا حصہ کی قیمت پانچ روپیہ مقرر کیجائے تو چالیس پچاس ہزار کی رقم فوراً فراہم ہو سکتی ہے۔ بہت سے ایسے اشخاص ہیں جو بخوشی سو حصص خریدینگے۔

دوم خریداری۔ اس سرمایہ سے یا تھوک فروش دکانوں اور کارخانوں سے کمیشن پر ایک مہینہ

عمدہ ادائگی پر حاصل ہوسکتا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ سال بھر کی ضروریات ایکدم خریدی جائیں۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا مال منگوایا جائے۔ جب وہ فروخت ہوجائے تو اور منگوالیا جاوے۔ اس طریقہ سے مال کے خریدنے کیلئے زیادہ سرمایہ کی ضرورت نہوگی ایسا مال ہرگز نہ منگوایا جائے جسکی مانگ نہو۔ اور دکان پر پڑا سڑا کرے۔

سوم فروخت۔ یونیورسٹی اور طلبا کی ضروریات معمولی دریافت سے معلوم ہوسکتی ہیں کوآپریٹیو سٹورس کی کمیٹی انتظامیہ کے ممبروں سے منیجر کو ہمیشہ معلوم ہوتا رہے گا۔ کہ کس قسم کے مال کی مانگ ہے۔ ایسی چیزیں بہت جلد فروخت ہوجایا کریں گی۔ مال چونکہ ارزاں خریدا جائیگا، اسواسطے بازار کے بھاؤ سے بہرحال ارزاں ہوگا۔ شہر میں آمدورفت اور پارسلوں کے خرچ سے طلبا بچ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جبکہ یونیورسٹی کا ہر ایک فرد کوآپریٹیو سٹورس کا ممبر اور نفع کا حصہ دار ہوگا، اور اس کو اپنی ضرورت کی چیزیں ارزاں، عمدہ اور آسانی سے مل سکیں گی، تو وہ سٹورس کو بازار پر ترجیح دیگا۔ علاوہ ازیں خریداروں کو بونس دینے کی تجویز پر عمل کیا جاوے تو دکان کو یقیناً کامیابی ہوگی۔ مثال کے طور پر آرمی اینڈ نیوی کوآپریٹو سٹورس کمپنی کا ذکر کرتا ہوں۔ جسکے ممبر ہندوستان کے ہر حصہ میں موجود ہیں، اور مقامی دکانوں پر کوآپریٹو سٹورس کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہلم کے سٹیشن کلب میں ایک کوآپریٹو سٹورس ہے۔ ممبروں کی تعداد سردیوں میں عموماً ۵۰ اور گرمیوں میں ۳۰ ہوتی ہے لیکن سٹورس میں قریباً ساٹھ ہزار سالانہ کی بکری ہوتی ہے۔ درآنحالیکہ شہر اور چھاونی میں، اور دکانیں موجود ہیں۔ اور ممبر عموماً لاہور اور راولپنڈی جاتے رہتے ہیں۔

میں یہانتک عرض کرونگا کہ اگر مجوزہ مسلم یونیورسٹی کوآپریٹو سوسائٹی کی کامیابی میں کوئی رکاوٹ نظر آئے، تو بورڈرس کو کھلّا باہر سے چیزیں خریدنے سے روک دیا جائے۔ اگر کارکنان یونیورسٹی کو اختیار ہے، کہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں کے طلبا کو ایک قسم کا لباس پہننے اور کھانا کھانے پر مجبور کریں اور بہت سی باتیں ان کیلئے لازم قرار دیدیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسا حکم جاری نہ کیا جائے جس سے طلبا، اور ان کے والدین، اساتذہ اور یونیورسٹی کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ میں اپنے عریضہ مورخہ ۲۷۔ اپریل بنام مخدومی ڈاکٹر صاحب میں کرچکا ہوں۔

چہارم۔ منیجر وغیرہ آنریری ہرگز نہوں۔ موجودہ اسٹاف کے ممبر، آنریری اصحاب پورا وقت دکان کے

کاموں میں صرف نہیں کر سکتے۔ اسٹاف کے ممبر یونیورسٹی سے اسلئے تنخواہ پاتے ہیں، کہ وہ اپنا وقت اور دماغ تعلیمی معاملات میں صرف کریں۔ ان میں سے اگر کسی صاحب کو سٹوریں میں لگا دیا گیا، تو اوّل تو وہ غالبًا اس کام کے اہل نہ ہونگے۔ دوم ان کے فرض منصبی میں ہرج ہوگا، یا سٹورس کا کام بگڑے گا، اور سوم بے ضابطگی کی صورت میں ان سے بازپرس ہونے میں مشکل ہوگی۔ کیونکہ ڈسپلن اور پوزیشن کا سوال پیدا ہو جائے گا۔

منیجر اکونٹینٹ۔ اسسٹنٹ منیجر وغیرہ ایسے آدمی ہونے چاہئیں۔ جو اپنے صیغہ میں ماہر ہوں اور اس شعبہ کا کام پوری طرح انجام دے سکیں۔ ان سے معقول ضمانت لیجاوے اور معقول تنخواہ دی جائے۔ انکے کام پر نگرانی کرنے کیلئے ایک کمیٹی انتظامیہ بنائی جاوے۔ جس کے اجلاس کم سے کم ۳۰ دن کے وقفہ کے بعد ہوا کریں۔ ان اجلاسوں میں خرید و فروخت کو جانچا جائے، مال موجودہ دکان کی پرتال سٹاک بک وغیرہ سے نئی چیزیں خریدنے کا فیصلہ کیا جاوے اور خاص طور سے دیکھا جاوے۔ کہ دکان میں کسی قسم کی بے ضابطگی یا خیانت تو نہیں ہوئی؟ ممبران کمیٹی کو ہر اجلاس میں شمولیت کا معاوضہ دیا جاوے۔

ممکن ہے علی گڈھ میں حسب مطلب آدمی نہ مل سکیں لیکن ہندوستان میں بہتر سے بہتر آدمی مل سکتے ہیں دکان کے ہر حصہ میں چند طلبا کو بطور اسسٹنٹ کام کرنے کی اجازت ہوگی لیکن وہ تنخواہ دار سٹنٹ کی نگرانی میں کام کریں گے، جو انکے افعال کا ذمہ دار ہوگا۔ اور روپیہ پیسہ یا مال ہرگز ہرگز انکی تحویل میں نہ ہوگا۔ ایسے طلباء کو وظائف بھی دیئے جاسکتے ہیں۔

قرض پر مال ہرگز فروخت نہ کیا جائیگا۔ اکثر دکانیں نادہند خریداران کی وجہ سے بیٹھ جاتی ہے۔ نقد فروخت کی پابندی سے طلباء میں قرض پر مال لینے کی عادتیں کم ہو جائیں گی، اور فضول خرچی کی بھی رکاوٹ ہو جائیگی

اکیس برس گذرے، خان عبدالمجید خاں صاحب نے مسٹر ولبرفورس کی نگرانی میں ضلع جالندھر میں کوآپریٹو سوسائٹی کا کام شروع کیا۔ ساہوکاران اور دیگر اہل غرض نے انکے کام میں ہر طرح روڑے اٹکائے لیکن عزم و استقلال کو آخر کامیابی ہوئی، اور یہ تحریک سارے پنجاب میں پھیل گئی۔ صورت موجودہ یہ ہے۔ کہ اس صوبہ میں پندرہ ہزار سوسائٹیاں ہیں۔ جن کے ۴ ½ لاکھ ممبر ہیں اور سرمایہ نو کرور ہے۔

پنجاب کے ڈھگے اگر اکیس برس میں یہ کچھ کر سکتے ہیں، تو کیا ہماری یونیورسٹی جس میں ہندوستان کے

بہترین دل و دماغ موجود ہیں، کوآپریٹو سکیم کو کامیاب نہیں بنا سکتے؟ ممکن ہے کہ موجودہ کواپریٹو سوسائٹی کی ناکامیابی کے باعث کارکنان یونیورسٹی کو مجوزہ سٹورس کے جاری کرنے میں تامل ہو۔ اہل ہمت کیلئے ناکامیابی فی الحقیقت کامیابی کا زینہ ہے۔ اسواسطے کارکنان یونیورسٹی کو اس ناکامی سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئیے۔ جو نقائص موجودہ سوسائٹی کی ناکامی کا باعث ہوئے ہیں، ان کو دور کردیا جائے تو کوئی وجہ نہیں، کہ تجویز کامیاب نہو۔

ان نقائص کا حال جناب والا اور مخدومی ڈاکٹر صاحب کو مجھ سے بہتر معلوم ہے۔ علیگڈھ میں جن اصحاب سے اس تجویز کا ذکر ہوا ہے، وہ اسکے مفید ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن نئی بات سمجھ کر ہچکچاتے ہیں، اور اس کا اجرا ان کو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ میں نے انکے خدمت میں عرض کیا ہے، کہ یہ سرسید علیہ الرحمتہ کی بنائے مدرستہ العلوم سے زیادہ انوکھی بات نہیں، اور دیگر مقامات میں اس قسم کے سٹورس کامیابی سے چل رہے ہیں۔ ضرورت فقط اس بات کی ہے۔ کہ یہ کام ایسے اصحاب کے سپرد کیا جاوے جو اسکے اہل ہوں۔ تجارت کے اصولوں سے واقف ہوں، اور عملی طور سے کام کرچکے ہوں۔

اس کام کے جاری ہونے سے یونیورسٹی میں ایک عمدہ شعبہ بغیر کسی مزید خرچ کے جاری ہو جائیگا۔ ہر سال پچاس ساٹھ لڑکے روزی کمانے کا کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ کر نکلیں گے اور رفتہ رفتہ عام مسلمانوں میں یہ تحریک پھیل جائے گی۔

عمارت کا مسئلہ مشکل نہیں۔ دسمبر گذشتہ میں ایک نقشہ طیار کرکے میں نے علیگڈھ بھیجا تھا۔ وہ مخدومی خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب یا کرمی حاجی محمد صالح خاں صاحب کے پاس ہوگا۔ اسکے ملاحظہ سے جناب والا کو معلوم ہوجائے گا کہ عمارت ایسی محفوظ ہوگی کہ کوئی شخص بجز اکونٹینٹ اور خزانچی کے انکھ بچا کر وہاں سے نہیں نکل سکتا۔ یہ عمارت بیس ہزار روپیہ میں تیار ہوسکتی ہے، اور کام شروع ہونے کے تین چار برس کے اندر بلکہ اس سے بھی کم عرصہ میں اسکی قیمت ادا ہوسکتی ہے۔

یونیورسٹی اور طلبار کی سالانہ ضروریات کا اندازہ میں نے کئی ماہ کی دریافت کے بعد قائم کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ طلباء کے اخراجات کا صحیح اندازہ والدین کو ہوسکتا ہے۔ جن کو فیس ادا کرنی پڑتی ہیں، نہ کہ اصحاب سٹاف کو لیکن میں بحث کی خاطر مان لیتا ہوں کہ سید عبد الجلیل صاحب کا اندازہ درست ہے اگر طلباء کا

سالانہ خرچ تین لاکھ ہے۔ تو سٹورس کو پچیس تیس ہزار روپیہ سالانہ خالص منافعہ ہو سکتا ہے، اور یہ رقم ایسی حقیر نہیں کہ اسکو آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔ اسکے علاوہ جو فائدے ہیں ان کا ذکر میرے پہلے نوٹ میں موجود ہے۔

سید صاحب موصوف کی جائنٹ سٹاک کمپنی کی تجویز کی بابت میں کچھ عرض نہیں کر سکتا، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ ایسی کمپنی کے قائم کرنے کیلئے کون کون اصحاب طیار ہیں اور کسقدر سرمایہ بہم پہنچا سکتے ہیں، اور یونیورسٹی کو اس میں کس قدر دخل ہوگا۔

وظائف کے متعلق جو تجویز موصوف نے فرمائی ہے اس سے مجھے اتفاق ہے۔

اب جناب والا، مخدومی ڈاکٹر صاحب اور اصحاب اگزیکٹیو کونسل کے قابل غور یہ امر ہے، کہ آیا کوآپریٹیو سٹورس یونیورسٹی کیلئے زیادہ فائدہ مند ہے یا وہ سلسلہ جس کا ذکر مخدومی ڈاکٹر صاحب نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۴ ماہ حال میں فرمایا ہے۔

دودھ مکھن کی تجویز تو بہت اچھی ہے لیکن باقی چیزوں کے متعلق میں مزید غور کی درخواست کرتا ہوں، اور جناب والا کی صحت سلامتی کی دعا پر اس طویل عریضہ کو ختم کرتا ہوں۔ زیادہ حد ادب

نیازمند

برادر مکرم **تسلیم**۔ مرسلہ پوسٹ کارڈ پہونچا شکریہ۔ علیگڈھ اولڈبوائے کے حیدرآباد سے نکلنے کی خبر سے بیحد مسرت ہوئی! اور زیادہ تر اس سے خوشی ہوئی کہ ہمارے حیدرآباد کے اولڈبوائے نے اس احساس میں پیشقدمی کر کے ہمت سے اور مستقل مزاجی سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ خداوند تعالیٰ انکے ارادوں میں برکت عطا فرمائے۔ ہم سب اور ہر ایک علیگڈھ اولڈبوائے کا فرض ہے کہ اس کام میں انکا ہاتھ بٹائے اور اپنی حتی الوسع ہر ممکنہ کوشش سے جائز طور پر دریغ نکرے۔

پرچہ آنے پر انشاءاللہ تعالیٰ میں ضرور کوشش کروں گا جسقدر علیگڈھ اولڈبوائے یہاں اور دیگر اضلاع پر موجود ہیں انکے نام پرچہ جاری کراؤنگا۔

اور آپکے حسب تحریر انشاءاللہ تعالیٰ آپکے رسالہ کے آخری ورق کے سوالات کا جواب بھی ادا کرونگا۔

سید افتخار حسین، بازار رائچور

یونان کے جزیرے

(۱)

یونان کے جزیرے یونان کے جزیرے — سافو کی عشقبازی بلبل کا ہے چہکنا
وہ بزم کے سلیقے وہ رزم کے وتیرے — ڈیلاس کا ابھرنا فیبس کا وہ چمکنا
اب بھی بسنت رُت میں جنت بنا ہے سب کچھ — سورج کے اک علاوہ ڈوبا ہوا ہے سب کچھ

(۲)

سی اِجی وہ ٹی اِجی شعر و سخن کی دیوی — وہ بین سورمائی وہ بانسری پریمی
اپنے ہی ساحلوں پہ شہرت نہیں ہے جن کی — جنکے جنم کی بھومی اُن کیلئے ہے گونگی
وہ راگ گونجتے ہیں پورب میں دور پل کر — ان پاک ٹاپوؤں سے اسلاف کے نکل کر

(۳)

مرتھان اور پربت ماہ کا وہی ہے نقشہ — مرتھان کے کنارے لہرا رہا ہے دریا
کھویا ہوا سا تنہا یاں میں نے خواب دیکھا — آزاد پھر یہ اک دن یونان دیش ہوگا
پیوند خاک جب جا ایران کی ہو سینا — خود کو غلام سمجھوں ممکن بھلا یہ کب تھا

(۴)

ساحل کی وہ پہاڑی وہ شہریار بیٹھا — سلامیس بھی سامنے ہے تخت دل سمند پہ
نیچے جہاز صدہا اقوام کی وہ سینا — بیڑے یہ سب اسی کے اس کا ہی لاؤ لشکر
گنوا لیا تھا اسنے اک کو دن نکلتے — سورج کے ڈوبنے تک وہ ٹھاٹ سب کہاں تھے

(۵)

ہاں ٹھاٹ وہ کہاں ہیں تو بھی بتا کہاں ہے		میرے وطن یہ سال تیرے جو بے صدا ہیں
وہ گیت سو رہائی گویا کہ بے زباں ہے		تیرے نہ دیوتا ہیں اب وہ نہ سورما ہیں
کیا اب یہ دیوتائی یکتا ستار تیرا		ان بے کمال ہاتھوں دنیا میں خوار ہوگا؟

(۶)

شہرت کا کال ایسا اتنا ہی ہو غنیمت		مانا کہ قوم میری پہنے ہوئے ہے بیڑی
اِک عاشقِ وطن کو آ سکے ذرا سی غیرت		شاعر کے واسطے یاں اب کیا رہا ہے باقی
اے دیس چاہتا ہے اس سے زیادہ کیا تو		یونانیوں پہ تجا یونان پہ دو آنسو

(۷)

روتے رہیں گے کب تک ماضی کی داستاں پر		ہم شرم سے گڑے ہیں آبا تھے رن میں تے
وہ سورما وطن کے بس نام ہیں زباں پر		پرتھی نکال تیرے اسپارٹا کے مردے
اُن تین سو کے بدلے ہو جائیں تین زندہ		پھر دیکھے زمانا تھرما پلی کا نقشہ

(۸)

ٹوٹی نہیں خموشی کیسی یہ چپ لگی ہے		سنتا وہ رفتگاں کی آواز آ رہی ہے
اک دور سے گرجتی ندی چڑھی ہوئی ہے		زندہ دماغ تم میں بتلاؤ اب کوئی ہے
ہو جائے ایک زندہ سمجھو کہ ہم یہاں ہیں		رونا یہی ہے سارا زندہ ہی بے زباں ہیں

(۹)

سنتا ہے کون اپنی اب چھیڑ اور چھیڑیں		پھر دیجئے لبالب جام شراب سامی
ترکوں کو ہی مبارک جنگ جدل کی سیریں		ہو خونِ تاک سے اب دو ہم اور عیش کامی
سنکر صدائے عشرت کس شوق سے ہو اُمڈے		کیسے ہیں ٹوٹے مرتے بے کس کمت بندے

(۱۰)

رائج ہو تاج پر بریک اس کا ہوا ابھی چرچا | پر بریک پر کہاں ہیں انکا بھی کچھ پتا ہے
اک بزم کا سبق تھا اک رزم کا سبق تھا | مردانہ سبق کو تمنے بھلا رکھا ہے
بنیاد علم و فن کی کلاسس کی وہ الف بے | تم سے غلام ہرگز اسکے نہ اہل ہوتے

(۱۱)

پھر دیجئے لبالب جام شراب ساقی | ہمنے بھلا دئیے ہیں مضمون وہ بھی آخر!
گانے اناکریئن جن سے ہوئے ہیں نامی | سچ ہے ملی کراتس آقا تھا ایک جابر
مانا کہ تھی غلامی اس دھیان میں مگن تھے | اسوقت اپنے آقا اپنے ہی ہموطن تھے

(۱۲)

جابر وہ کرسنیس کا وہ حریت کا حامی | وہ بے جگر بہادر وہ حریت کا شیدا
وہ کون؟ ملٹیاڈس تاریخ میں گرامی | ہو جائے کچھ دنوں کو پھر مستبد جو ایسا
شیرازہ ہو اکٹھا مٹ جائے پھوٹ ساری | بکھرے ہوؤں کو باندھے زنجیر اتحادی

(۱۳)

بھر دیجئے لبالب جام شراب ساقی | سیولی کے پربتوں پر گا کے بھی کنارے
اب بھی بچی کچھی کچھ ہے ایک نسل باقی | ڈورک نژاد مائیں جنتی تھیں جیسے جائے
اک آدھ دان عجب کیا پڑ جائے بیج کوئی | جسکی رگوں میں دوڑے خوں ہراکلیڈی

(۱۴)

کرنا نہ تم بھروسہ ہرگز فرنگیوں پر | فرمانروائے مغرب قوموں کو بیچتا ہے
تلوار پر ہی دیسی دیسی سپاہیوں پر | اقوام کو بھروسہ ہر حال میں رہا ہے
لاطینیوں کے فتنے عثمانی عساکر | یونان توڑ دینگے تیری سپر کو آخر

(۱۵)

بھر دیجے لبالب جام شراب سامی — سائے میں ناچتی ہیں وہ پریاں وطن کی
آنکھیں وہ کالی کالی سوئی کٹی رسیلی — کلیاں ہیں کھلنے والی جوبن یہ اس چمن کی
اس دھیان سے جو آنسو چلتے ہوئے بھر آئے — آخر غلام ہونگے ان کو دیوں کے جائے

(۱۶)

میں اور سویرے کی مرمر کی وہ ڈہلائیں — موجوں کے ساتھ میری بچپن پہ روح تڑپے
لہروں کی اور میری اپنی ملکر تانیں — شُن سُوان گاتے گاتے ہی جان نکلے
میرا وطن نہیں ہو جس ملک میں غلامی — دے مارے زمین پر جام شراب سامی

مسلم یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ

ڈاکٹر ضیاء الدین اور عملہ تحت کو علیحدگی کا نوٹس

دہلی ۲۴ مارچ۔ جریدہ بمبئی کرانیکل کی نامہ نگار خصوصی کو معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کردی ہے اور ارباب یونیورسٹی نے اسے بورڈ کے ارکان کی پاس بھیجدیا ہے یہ رپورٹ فی الحال صیغۂ راز میں رکھی گئی ہے تاہم معلوم ہوا ہے کہ اس میں یونیورسٹی کے متعلق متعدد نقائص بتلائے گئے ہیں اور شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یونیورسٹی کے ضوابط اور قوانین وغیرہ سے علانیہ انحراف کیا جارہا ہے۔ اس رپورٹ میں نہایت ہی اہم تبدیلیوں کی سفارش بھی کیگئی ہے۔ علی الخصوص قابل ذکر یہ ہے کہ یونیورسٹی کے سارے عملے کو علیحدہ کرکے جدید عملہ بھرتی کرنیکا مطالبہ کیا گیا ہے تاکہ یونیورسٹی کی زندگی میں نئی روح پھونکی جاسکے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین پرو وائس چانسلر سے کہا گیا ہے کہ وہ ریٹائر ہونے سے پیشتر رخصت لے لیں۔ یونیورسٹی کے معاملات کی اصلاح کی پیش نظر تین سال کیلئے خاص افسر کی تقرر کی سفارش بھی کیگئی ہے۔

علیگڈھ ۲۶ مارچ مسلم یونیورسٹی کی ذمہ دار حلقوں سے اس امر کی تصدیق ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگئے ہیں اسکے متعلق کوئی سرکاری اعلان نہیں ہوسکا چند پروفیسروں کو بھی نوٹس دیا گیا ہے کہ وہ اپنے استعفے داخل کردیں۔ یونیورسٹی کے امتحانات ۱۰ اپریل سے شروع ہونگے اور اسکے بعد یونیورسٹی موسم گرما کی طویل تعطیلات کیلئے بند ہوجائیگی۔ رپورٹ میں جس تغیر و تبدل کی تجویز پیش کیگئی ہے اس پر یونیورسٹی کے دوبارہ کھلنے کے بعد عملدرآمد ہوگا۔ یونیورسٹی کورٹ کا اجلاس ۲۱ مارچ کو منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر محمود وائس چانسلر یونیورسٹی کی خلاف عدم اعتماد کا ریزولیوشن پیش کیا گیا تھا اسکے ارکان نے اس رپورٹ

شرح دیوان غالب پر ایک نظر

(۲۸)

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

شرح ہے۔ ہمنے جو یہہ کہا کہ فقط وعدہ وصل سُن کے ہم مرنے سے بچ گئے تو ہمنے جھوٹا جانا" یہ معنے تو کسطرح اس شعر سے نہیں نکلتے معلوم نہیں شارح کا خیال اس جانب کیوں منتقل ہوا۔ ہاں اسکے بعد دوسرے احتمالی معنے جو بتائے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں کہ "ترا وعدہ سُنکر جو ہم جیے تو اسکا سبب یہ تھا کہ اسے جھوٹا وعدہ خیال کیا۔ اسپر اتنا اور بڑھانے کی ضرورت ہے کہ "اگر تیرے وعدہ کو سچا سمجھتے تو شادی مرگ ہو جاتے"۔

(۲۹)

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ "(۱) رقیب بلہوس کی ہوس کو نشاط کار وصل لطف وصل نگار حاصل ہے۔ اب ہمارے جینے کا کیا مزہ ہے؟ اگرچہ شارح علامہ لکھتے ہیں کہ مصنف کی اصطلاح میں ہوس بمعنی رقیب کا نام ہے اور سند میں اسی غزل کا یہ مصرع پیش کرتے ہیں ع ہوس کو پاس ناموس وفا کیا۔ پھر جو مطلب بتایا گیا ہے وہ بھی تو الفاظ شعر میں کہیں سے نظر نہیں آتا۔ میرے نزدیک یہ نظیر کا مصرعہ اس دعوے کو ثابت نہیں کرتا کہ مصنف نے ہوس کو بمعنی رقیب کے معنوں میں باندھا ہے۔ ہوس تو علی العموم عشق صادق کی ضد ہے۔ چاہے ہوس پرست کسی کا

رقیب [illegible] ہو۔ اور یہ ان معنوں کے ساتھ جو شارح نے معنی ادنیٰ کرتی [illegible] فرمائے ہیں [illegible] الفاظ کا
ترکیب بیان کوئی لگاؤ نہیں لیکن اگر لغت یا دلالت مجازی ہی معنے لینے پر مجبور کرتی ہے تو یہ اسی شعر کا
حل میں کرونگا۔ "ہوس = محبت کا جنون۔ محبت اقدس (اسلئے) محبت رقیب نشاط کار [illegible] کا
زیست جو عیش و نشاط میں گزرے اور مدت بھی ہو۔ اب پہلے مصرع کے معنے یوں کیجئے [illegible] رقیب جو [illegible] اظہار
محبت کرتا ہے نشاط کار کا بھی طالب ہے یعنے اس کا ادعائے محبت مشروط ہے بقائے حیات اور حصول عیش و نشاط
سے۔ برخلاف عاشق کے جس کی محبت مشروط بہ خود غرضی نہیں بلکہ وہ معشوق کی ایک ادائے ناز پر جان فدا
کردینے کو حیات جاودانی سمجھتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ رقیب بوالہوس کو دیکھو محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے
اور جان کو بھی عزیز رکھتا ہے حالانکہ جان جو اسقدر عزیز ہے وہ محض اسوجہ سے ہے کہ موت کا کھٹکا لگا ہوا ہے
اگر معلوم ہو جائے کہ موت نہ آئیگی تو پھر زندگی کی کوئی قدر باقی نہ رہے۔ حاصل یہ کہ مزہ جینے کا عشق
کے ساتھ ہے جو مترادف ہے موت کا نہ کہ ہوس کے ساتھ جس کی مراد پر نشاط زندگی ہے" دوسرا مطلب جو بیان
ہوا ہے وہ بھی الفاظ شعر سے مغایر نہیں تو شستہ ضرور ہے۔ فرماتے ہیں: "دنیا میں انسان کو ہوا و ہوس سے
رہائی نہیں۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو اسطرح کے جینے میں کچھ مزہ نہ تھا یعنے حاصل زندگی مرنا ہے" یہاں بھی جبتک مرنے
سے فنا فی العشق ہونا مراد نہ لیا جائے شعر دنداں تو جلاد رہا ند کا مصداق قرار پاتا ہے۔ پس اگر یہی معنے
لینا ہے تو اسطرح فرمائیے۔ ہوس کو کاروبار زندگی سے نشاط حاصل ہوتا ہے لیکن حقیقی نشاط مرنے (فنا فی العشق)
میں ہے۔ اسی مطلب کو استاد ذوق نے کیا خوب کہا ہے ؎

مزے جو عشق کے عاشق بیان کبھو کرتے — مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

(۳۰)

نفس موج محیط بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

شرح "یہاں بے شراب پیئے بیخودی ہے پھر بے التفاتی ساقی کا گلا کرنا کیا ضرور ہے،
جیسے اسکی صورت دیکھ کر بیخودی ہو جائے۔ اُسے وہ شراب نہ دے تو کیا شکایت"۔ اس شرح میں جو توجیہ بیخودی

کی تشریح ثانی ہے جو ایک مضمون تراشا ہے۔ ساقی کی صورت دیکھ کر بیخود ہو جانے کے معنے شعر میں کہیں سے
نہیں نکلتے۔ بہتر تھا کہ پہلے ہی جملہ پر شرح کو ختم کر دیا جاتا اور اسباب بیخودی کو دریافت کرنے والے
دریافت کرتے رہتے۔ اگرچہ اس صورت میں پہلے مصرعہ کا ربط دوسرے مصرعہ کیساتھ بتانا ذرا دشوار ہے۔
ہے کہ یہ شعر تشنہ معنی ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ میری ہر سانس خود ایک
موج ہے دریائے بیخودی کی جس سے اغلبًا مراد غالب یہ ہے کہ میں روز ازل سے مست صہبائے محبت
ہوں۔ پھر شاعر اپنے نفس سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ جب ساقی ازل نے تیری فطرت میں مستی و بیخودی
ودیعت کر دی ہے تو اسکے تغافل کا کیا (کیوں) گلہ کرتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں ایک "پھر" کا لفظ ہونے
سے شعر میں سست تالیف پیدا ہو گیا ہے۔ کہئیے کہ "میری قسمت ہی میں شراب نہیں ہے ساقی کا کیا گلہ"
"تجھے تو ساقی پہلے ہی پلا چکا پھر اب تغافل کا کیا گلہ ہے"۔ ان مثالوں پر غور فرمائیے اور سمجھئے!

(۳۱)

سن اے غارتگر جنس وفا سن
شکست قیمت دل کی صدا کیا

شرح۔ توجیہ یہ کہتا ہے کہ ہمیں شکست دل کی خبر نہیں تو کہیں شکست دل میں آواز ہوتی ہے۔
مصنف نے شکست دل کو شکست قیمت دل سے تعبیر کیا ہے۔" میں عرض کروں گا کہ کیا شکست شئے اور
شکست قیمت شئے کے ایک ہی معنے ہیں؟ جبکہ شکست قیمت شئے سے کسی شئے کی قدر و قیمت کا گھٹ
جانا یعنے اسکا بیقدر ہو جانا مراد ہے۔ پھر اس شعر میں شکست قیمت دل سے دل کی قدر و قیمت کا گھٹ جانا یا
اسکی تذلیل و توہین کیوں نہ مراد لیجائے؟ لیکن اس سوال سے ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ اگر شکست قیمت
دل سے مراد دل کی بیقدری لیجائے تو شعر کے معنے کیا ہونگے؟ اسکو سمجھنے والے سمجھیں میں تو اتنا ہی
سمجھا ہوں کہ مصرعہ کی تکمیل کیلئے یا جنس کی رعایت سے قیمت کا لفظ بے سوچے سمجھے رکھدیا گیا ہے اور بس!

(۳۲)

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑینگے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

شعر صاف ہے شرح صاف ہے اور جو نسخہ میرے پاس ہے اس میں بھی یہ تماشا نہ ہوا چھپا ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھا کہ اگر سستی بندش اور ضعف معنی کو غالب نے جائز رکھا ہو غالباً شاعر نے یہ نہیں بلکہ یہہ کہا ہوگا اسلئے کہ "یہ" کہنے سے تماشا عمومیت کے معنے دیتا ہے اور "یہہ" کہنے سے معنوں میں خصوصیت پیدا ہوتی ہے اور یہہ محل تخصیص ہی کا ہے یعنے یہ تماشا کہ غالب کے پرزے اڑائے جائیں نہیں ہوا۔

(یہہ نوٹ لکھنے کے بعد جب نسخہ حمیدیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تو دیکھا گیا کہ اس میں یہہ چھپا ہے اور صحیح چھپا ہے)

(۳۳)

داں ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

شرح "کہتا ہے کہ جو حسین کہ طعن و طنز ڈھونڈھا کرتے ہیں ان سب کے دہن تیرے لئے زنجیر رسوائی ہیں، یعنے ہر ایک دہن طنز گفتار (پیغارہ جو) ایک ایک حلقہ ہے زنجیر رسوائی کا ... حسینوں کے دہن کو عدم کہتے ہیں (شعرا) تو جب انکے دہن میں تیری بیوفائی کا ذکر ہے تو گویا عدم تک پہونچ گیا اور تیری نیکنامی کے پانو میں زنجیر رسوائی پڑ گئی"۔ شعر کا حل تو ہو گیا لیکن میں اتنا عرض کروں گا کہ جب نیکنامی کے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی تو وہ مقید ہوگی پھر بہ حالت پابہ جولانی ہستی سے عدم تک راہ رسوائی کسطرح طے کی ہو شارح علامہ نے بیوفائی کی جگہہ نیکنامی کہکر حق وکالت ادا کیا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ یہ شعر نرا لفظوں کا گورکھ دہندا ہے۔ ہاں اگر نیکنامی یا بیوفائی یا رسوائی کے پانوں کی زنجیر کاٹ ڈالی جائے جو حسینوں کے حلقہ ہائے دہن سے بنائی گئی ہے اور بجائے اسکے پہلا مصرعہ یوں کردیا جائے ع۔ دہاں ہر بت پیغارہ جو تھا صور رسوائی۔ تو پھر کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ جہانتک میرا خیال ہے شاعر نے بھی زنجیر رسوائی سے صدائے زنجیر ہی مراد لی ہوگی۔ مگر مساعد الفاظ فراہم نہو سکے۔

(۳۴)

گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائیگا بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائیگا

شرح " شام فراق کا اندوہ اگر میں نہ بیان کر سکوں تو سمجھنا چاہیے کہ چاند کا داغ نہ تھا بلکہ میرے ہونٹوں پر مُہر تھی"۔ داغ مہ اور مُہر دہاں میں وجہ شبہ مسلم اور یہ بھی مسلم کہ سکوت کو مُہر دہاں ہونے سے استعارہ کرتے ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کوئی شخص چاندنی رات میں زیر سما پلنگ پر لیٹ کے اپنے ندیم یا جلیس سے جو یقیناً سوا معشوق کے کوئی اور ہی ہے اندوہ فرقت بیان نہ کرے تو داغ مہ اسکی مُہر دہان کیونکر ہو جائیگا۔ پھر شاعر تو فعل مستقبل استعمال کر رہا ہے مگر شارح اسکو ماضی کی معنوں میں لیکر شعر کو بامعنے بنانے کی کوشش میں ہیں۔ اگر فعل ماضی استعمال کیا جاتا تو شارح کے بتائے ہوئے معنے تو غاو کر ہاں ان لئے جاتے۔ اب تو شعر اپنی موجودہ ترکیب لفظی کے ساتھ ان معنوں کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اب ہم حضرت شوکت کی شرح سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ " دوسرے مصرعہ میں داغ سے مراد داغ معشوق ہے" (داغ معشوق سے شارح کی مُراد داغ الفت معشوق ہے) پھر یعنے کے ساتھ اس اجمال کی تفصیل اسطرح فرماتے ہیں کہ "اگر شب فرقت کا غم چاندنی رات میں جبکہ معشوق سے ہم آغوش ہونا لطف دیتا ہے بیان نہ ہوگا تو معشوق کی فرقت کا داغ بے تکلف مُہر دہان ہو جائیگا۔ پھر اسی مطلب کی توضیح اسطرح کیجاتی ہے مطلب یہ ہے کہ دہن سے غم فرقت ہی بیان نہ ہوا تو یہ دہن کس کام کا" اسپر اکتفا نہیں بلکہ آگے چل کے پھر فرماتے ہیں کہ "اور داغ مہ سے اگر ماہ فلک مراد لیا جائے جب بھی معنے ٹھیک ہیں یعنے معشوق کی فرقت میں ماہ فلک ایک داغ ہے لیکن اسکی چاندنی اچھی نہیں معلوم ہوتی' اور ماہتاب کا اثر بہ اعتبار نجوم خاموشی ہے پس داغ مہ خود مُہر دہاں ہو گیا۔ اور مُہر چونکہ سیاہ ہوتی ہے پس شب فرقت میں چاند کا سیاہ یا تاریک نظر آنا دوسرا محل ہے"!

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس ایک شعر کی شرح میں کتنے یعنے استعمال ہوئے ہیں حالانکہ استاد کا یہ کہنا ہے ع در فہم سخن رہ بنود اعنی را ۔

اس لکھنے کے بعد ڈاکٹر بجنوری کا دیباچہ (صفحہ ۵) بھی میری نظر سے گزرا تھا افسوس ہے کہ میں اپنے لاابالی پن سے اسکی نقل نہ لے سکا اور کتاب جہاں کی تھی وہاں چلی گئی۔ اتنا یاد ہے کہ خدا بخشے

ڈاکٹر صاحب نے فلسفہ کے دریا بہا دئے ہیں مگر پھر بھی یہی کہونگا۔

رباعی

تو شعر مگو کلام لا یعنی را   در فہم سخن رہ نہ بود اعمیٰ را
طفلیست تیمم در کنارت معنی   لفظے باید کہ پرورد معنی را

ضامن

ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی اور یقیناً ہمارے بہت سے بھائی اس اطلاع سے مسرور ہونگے کہ حضور نواب صاحب بہادر بھوپال نے اپنے مصاحب خاص برادرم سید ممتاز علی خاں صاحب کو ترقی دیکر اب چیف آف دی اسٹاف کے منصب پر مامور فرمایا ہے ہمیں اُمید ہے کہ اس خوشی میں سید ممتاز، اپنی ایسوی ایشن کے سکرٹری صاحب کے نام "گنگلے" کا ایک پارسل اور ہمارے نام پاپڑ کا دوسرا پارسل روانہ کر دیں گے۔

برادرم ڈاکٹر عبدالرحمن (عثمان آباد) کے اچھے ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے بھائیوں اور دوستوں کے پیٹ بھرنے کی خاطر وقت کی تاک میں رہا کرتے ہیں۔ رمضان کے آخری عشرہ میں ایک صبح کو ہمیں اطلاع ملی کہ حضرت شکم کی رسد رسانی کی غرض سے حیدرآباد اور سکندرآباد کو ایک کیا جا رہا ہے۔ سگرٹ سگار والے اور میوہ والے، دال موٹھ والے، انڈے والے، مرغی والے اور خدا معلوم کون کون والے طلب کئے جارہے تھے تھوڑی دیر کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ "اولڈ بوائے صاحب" اور ڈاکٹر صاحب کے دوستوں کی ایک بڑی قطار افطاری اور کھانے پر مدعو ہے۔ کئی آدمیوں نے ایک سے زیادہ دنوں میں جو اہتمام کیا تھا اس کو ان بھوکے بنگالیوں (معاف فرمائے روزہ دار شریفوں) نے دم بھر میں صاف کر دیا اور جتنا کھایا تھا کالج کی پرانی حکایتوں کی صورت میں اگل کر گھر چل دیئے۔

علیا حضرت سرکار عالیہ بھوپال کے خلف اوسط جنرل عبیداللہ خاں مرحوم کو ہمیشہ علیگڈھ اور علیگڈھ والوں سے محبت رہی۔ اسکی مثال ہماری درسگاہ کے بہت سے کاموں میں ملے گی ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ مرحوم کے خلف اصغر صاحبزادہ رشید الظفر خاں صاحب کو انٹرمیڈیٹ میں تعلیم پانے کی غرض سے حضور فرمانروائے بھوپال نے علیگڈھ روانہ فرمایا ہے۔ اُمید ہے کہ اپنے عم محترم کے نقش قدم پر چل کر صاحبزادہ صاحب بڑی ترقی حاصل کرینگے۔

آتش جوان تھا!

برادرم! السلام علیکم۔ اولڈ بوائز ڈائرکٹری کیلئے آپکے سوالات حل کر دیے گئے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے ایک سوال اور بھی کیا تھا؟ جسکے جواب کے لئے میں نے تھوڑی سی مہلت مانگی تھی۔

آپکا سوال یہ تھا: کالج کے خوشگوار حالات میں سے اب بھی کسی کا نقش آپکے قلب پر باقی ہے؟

یہ سوال غالبًا برادر مکرم مولوی محمد عنایت اللہ صاحب کی تحریک پر آپ نے اضافہ فرمایا ہے۔ میرے لئے اس کا جواب دینا ضروری ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ دوسرے برادران بھی اس کا لحاظ فرمائیں گے۔ فکر فردا سے آزاد ہم چند بھائی جب مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے، میں کالج فٹ بال الیون میں شریک تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری الیون کے کپتان سردار محمد اشرف خاں صاحب تھے، اور کرکٹ کی کپتانی مولانا شوکت علی صاحب کے سپرد تھی۔ نام پیدا کرنے کا شوق کہئے، یا مسابقت کی تمنا، ان دونوں ٹیموں میں رقابت موجود تھی۔ یہ رقابت صرف کھیل کی حد تک تھی، باقی ہم سب دوست اور بھائی تھے۔ اس زمانہ میں فٹ بال کے کھلنڈروں کا گزر کرکٹ فیلڈ پر سے ہوا کرتا تھا، ان گزرنیوالوں کی ضیافت طبع پھبتیوں کے ذریعہ ہمیشہ کیجاتی تھی۔ ایکروز فٹبال الیون کے کپتان اور انکے ساتھیوں پر پھبتیوں کی بارش ہو رہی تھی، کہ ایک کھلنڈرے نے اپنے کپتان سے کہا، کہ روز روز کی مصیبت سے یہہ بہتر ہے، کہ ایکدن سارا قصہ چک جائے۔ وہ اسپر راضی ہو گئے۔ اُدھر شہ پا کر کرکٹ والوں کے قائد مسٹر (معاف فرمائیے مولانا) محمد علی بنے۔ مولسری کے درختوں کے قریب تمام کھلنڈروں نے ایک وسیع حلقہ بنا کر دونوں مشہ زوروں کیلئے میدان تیار کر دیا۔ سردار اشرف خاں اور مسٹر محمد علی میں مکہ بازی شروع ہوئی۔ جوڑ برابر کے اُترے تھے، اسلئے امید تھی کہ میدان جم کر ہوگا۔ مگر تھوڑی سی دیر میں مسٹر محمد علی کی

زبان سے "تام ثامد" کی صدا آنے لگی۔ بات وقت کی تھی، اسلئے دوسرے بیادران انگریجی درمیان آگئے۔ اور حریف کو روک دیا۔ مسٹر محمد علی سے رُک جانے کی وجہہ دریافت کیگئی، تو پاجامہ کا کونپ باندھتے ہوئے، انھوں نے اپنا ٹوٹا ہوا کمربند سب کے سامنے ڈال کر کہا کہ اس کمبخت کے سبب سے یہ گھڑی کھینچی نصیب ہوئی۔ یہ سن کر سب نے فرشی قہقہہ لگایا، اور سردار اشرف خاں نے دوڑ کر مسٹر محمد علی کو گلے لگالیا۔ یہہ واقعہ جب کبھی مجھے یاد آجاتا ہے، بیساختہ ہنسی آجاتی ہے۔

طالب علمانہ زندگی کے دوسرے واقعات میں سے ایک وہ واقعہ ہے جب سرسید نے انتقال فرمایا۔ اور انکی جانشینی کیلئے سب کی نظریں نواب محسن الملک (مرحوم) پر پڑنے لگیں۔ ایک محمد میر صاحب وکیل البتہ یہ رائے رکھتے تھے کہ سید محمود صاحب کالج کے لائف سکرٹری ہیں، ایسی صورت میں کسی دوسرے کا انکی جگہہ ہونا خلاف قاعدہ ہے۔ اس کام کیلئے اسٹریچی ہال میں ٹرسٹیوں کا جلسہ زیر صدارت سردار محمد حیات خاں صاحب منعقد ہوا۔ خود سید محمود صاحب بھی جلسہ میں موجود، اور ٹہلتے ہوئے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہجائیگا جب لاد چلے گا بنجارا

پڑھتے جاتے تھے۔ اسٹریچی ہال کے تمام دروازے بند تھے لیکن چند طالب علموں نے بازو کے ایک دروازہ سے اپنے لئے جگہہ نکال ہی لی۔ سب ٹرسٹیوں نے اتفاق رائے سے محسن الملک مرحوم کا انتخاب کرلیا، تو خود نواب صاحب کو اسکی اطلاع کی غرض سے سید محمود صاحب مرحوم کی خدمت میں بھیجا۔ اپنے خلاف اس قسم کے فیصلہ کو سن کر کون شخص ٹھنڈے دل سے قبول کرسکتا ہے، یہی حالت سید محمود صاحب کی بھی ہوئی، اور نواب محسن الملک کا کالر پکڑ کر صحیح جواب کے خواہاں ہوئے۔ جب انھیں یقین دلایا گیا، کہ کام کی ابتری کے باعث انھیں پریسیڈنٹ، اور محسن الملک کو سکرٹری بنایا جارہا ہے، تو سید محمود صاحب محسن الملک مرحوم کے گلے مل کر خوب سا رو دیئے۔ دوسرے ٹرسٹی بھی اس سے اثر پذیر ہوئے اور ان دونوں کے رونے میں شریک ہوگئے۔ اب گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اٹاوہ کے میر مظہر حسین مرحوم کے یہاں کی مجلس عزا، آج اسٹریچی ہال میں برپا ہے۔ جتنے طالب علم بازو کے کمرہ میں موجود تھے گھبرا کر سب ہال میں داخل ہوگئے۔ تھوڑی سی دیر میں یہ بے کیفی لطف و محبت سے بدل گئی۔ اسوقت تقریبًا تمام ٹرسٹیوں نے دوپہر کا کھانا غائب کردیا تھا۔ اور شام کے پانچ بجے تک بھوکے کام

کرتے رہے تھے۔ اس موقع کی فرد کارروائی، جہاں تک یاد پڑتا ہے، ہمارے برادر مکرم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے تحریر فرمائی تھی جلسہ برخاست ہونے کے بعد اسٹریچی ہال کے سامنے، ایچ اے مرزا فوتوگرافر نے حاضرین کا فوٹو لیا تھا۔

تیسرا واقعہ ٹرسٹی صاحبان کے ایک اہم اجتماع کے موقعہ کا ہے۔ یہ تو یاد نہیں کہ اس موقعہ پر کیا مسائل تصفیہ طلب پیش آئے تھے، البتہ اتنی بات اب بھی یاد ہے کہ ملک کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوے تھے۔ ہم لوگوں (دیسیوں بقول آپ کے سوپ کمپنی والوں) نے ارادہ کیا کہ حیدرآباد دکن اور میرٹھ کے ٹرسٹی صاحبان کو چاء پر مدعو کریں، اور اس خیال کو عملی جامہ بھی پہنا دیا جن بزرگوں نے اُس روز کی چاء خوری منظور فرمائی تھی انمیں نواب عماد الملک مرحوم، مولوی سید علی مرحوم، نواب سلام اللہ خاں مرحوم، اور شیخ وحید الدین صاحب بھی تھے۔ پچیس تیس آدمیوں کے مجمع نے اُس روز چاء اور اسکے لوازمہ کے ساتھ خوب انصاف کیا تھا، اور سب کے سب گپوں میں مشغول تھے۔ ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس سے زیادہ آدمیوں کے ساتھ جن میں ہز ہائنس آغاخان بھی تھے نواب محسن الملک کا گزر ہمارے کمروں پر سے ہوا کھلانے اور کھانے کے وہ مرحوم بھی بڑے شوقین تھے۔ آتے ہی کمرہ والوں سے کھانے کی فرمایش کردی۔ یہاں میدان پہلے ہی صاف ہوچکا تھا ہم سب بھائیوں اور ہمارے ساتھیوں نے بغلیں جھانکنے میں وقت گزاری کرنیکے بجائے، یہ مناسب سمجھا کہ ہرچہ بادا باد، ڈائننگ ہال کے دودھ اور ڈبل روٹی شاپ کی پیسٹری پر دھاوا کیا جائے! ایساہی کیا گیا، اور تھوڑی دیر میں سب انتظام مکمل ہوگیا۔ دوسری ناخوانده جماعت نے بھی اس خوان یغما میں شرکت کی اور سیر ہوکر کھایا۔

یہ قصہ تو وقت کے وقت ختم ہوگیا۔ مگر دوسرے روز ہم لوگوں کی طلبی مسٹر ماریسن کے اجلاس پر ہوی۔ ہم ملزموں نے بات جیسی تھی ویسی ہی بیان کردی۔ ماریسن صاحب نے اس داستان کو سنکر قہقہہ لگایا، اور فرمانے لگے۔

I like the spirit

یہہ حکایت تو ڈائننگ ہال کے دودھ کی تھی، جب پیسٹری کی روداد سامنے آئی تو ہم لوگوں نے کوشش کی کہ بل نواب محسن الملک کے پاس بھیجا جائے ایساہی ہوا۔ وہ مرحوم اس جسارت سے بہت محظوظ ہوے، اور نہایت خوشی سے اس رقم کو ادا فرمادیا۔ بھیا! اس کے بعد میری خورجی خالی ہے۔ والسلام

محمد احمد

پیامِ ٹگور

ٹگور میں جو خصوصیات ایک شاعر کی حیثیت سے پائی جاتی ہیں انکو مجملاً "رنگِ تصوف" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وجدانیت یا تصوف کی تعریف مشکل ہے کیونکہ وہ کوئی خاص مذہب یا اصولِ فلسفہ نہیں ہے۔ ایک نقاد تصوف کی یہ تعریف کرتا ہے۔

"حقیقت کا روحانی انکشاف جو احاطہ ادراک سے بالاتر ہے۔ شاعری کی بنیاد عقیدہ پر ہے نہ کہ عقل پر۔ مشہور شعراء یا تو خوابِ تصورات میں گم رہے ہیں یا تصوف میں، وہ اس وجدان سے مسرت آگین ہو سکتے ہیں، جس کو عام طور پر ہم دیکھنے یا سمجھنے سے عاری ہیں" پس تصوف سے مراد شاعر کے ذہن کی خاص حالت۔ خاص تخیل یا اور اسکی وہ اعلیٰ قابلیت ہے جس سے وہ اپنی وجدانیت کو شاعرانہ زبان میں قلمبند کرتا ہے۔

ٹگور کی شاعری میں شاعرانہ تصورات کے علاوہ فطری زندگی اور حیاتِ انسانی کی تشریح بے مثل ہے اسکے نزدیک فطرت معبود کا ملبوس ہے۔ دنیا کے مشہور فلسفی صوفیوں کی طرح اس کا بھی یہ عقیدہ ہے۔ "اللّٰہ باقی مِن کُلِّ فانی" وہ اختلاف میں یکجہتی دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ اسکی دعا یہی ہے کہ "اس ایک کا جلوہ کل کے تماشہ میں دکھائی دے"۔ ہندوستان کے فلسفیوں کی طرح وہ خدا کو اپنے ہی میں پاتا ہے کیونکہ وہ پوچھتا ہے۔

میرے مالک کیا تو اپنی تخلیق اپنے ہی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے؟ تو اپنا سوہن روپ مجھ میں پاتا ہے۔

اُسنے فطرتِ انسانی کا غائر مطالعہ کیا ہے "معصوم" اور اسکے کھیل ہم ہر روز دیکھتے ہیں، کہیں اسکی ابتدا اور انتہا کے متعلق عموماً دماغ پر زور نہیں ڈالا جاتا لیکن اس زبردست صوفی کے نزدیک۔

"لامتناہی گیتی کے ساحلوں پہ بچے ملتے ہیں آسمان پر طوفان اٹھتا ہے جہاز بھنور میں گم جاتے ہیں اور فنا

فضا پر چھایا ہے لیکن بچے کھیل میں مصروف ہیں۔ لا انتہا دنیا کے ساحلوں پر بچوں کا عظیم الشان جمگھٹ ہے۔"

... انکی ایک شعر نظم کا ہیرو ہے اپنی حکایات کا ذکر کرنے میں اپنی ماں سے کہتا ہے ۔

"اماں میری کشتی کا بادبان سفید ہوگا"۔

کیا اس سے یہہ مقصود ہے کہ بچہ ماں کو زندگی کے بچہ کی دشواریوں کے طے کرنے میں مدد دیگا؟ ماں کے نزدیک معصوم اسکے تمام خیالات کا مرکز ہے۔ وہ دیوتا ہے جسے وہ اپنے خانہ دل میں جاگزیں کئے ہوئے ہے۔ زندگی کی ناپائداری میں اگر اسکا کوئی تکیہ ہو سکتا ہے تو وہ اسی معصوم کی محبت ہے۔ ٹیگور کے ایک قصہ کا سورما ایک لڑکا ہے جو اپنی ماں سے دور اپنے ماموں کے پاس بغرض تعلیم جاتا ہے۔ اسکا ماموں نہایت شفقت اور محبت سے اس کا خیال کرتا ہے لیکن لڑکے کو اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں اور گھر کیلئے مضطرب ہے لیکن اسے تعطیلات کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اضطراب اسقدر بڑھ جاتا ہے کہ آخر کار وہ بیمار پڑ جاتا ہے اور بیہوشی طاری ہو جاتی ہے اور اسی عالم میں اسکے منھ سے کوئی کلمہ نکلتا ہے تو صرف یہی کیا ماموں جان تعطیلات آگئیں۔ آخر کار ماں اس حالت میں پہونچتی ہے جسکی گہرائیوں کو جاننا آسان نہیں۔ اس کا دلبند معصوم آخری دفعہ آنکھیں کھولتا ہے ماں کو دیکھکر خوش ہوتا ہے اور یہہ کہہ کر "اماں تعطیلات آگئیں" ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ پڑھنے والے پر یہہ ظاہر ہو جائے گا کہ اس سے مراد انسان کی روح کا دورہ ہے جو زندگی کی جد و جہد کے اختتام پر عارضی نیند کے بعد اپنے مبداء اصلی سے جا ملتا ہے۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیگور کی تصانیف میں وہ گہرے معنی پنہاں ہوتے ہیں جن کو ہم پہلی نظر میں نہیں جان سکتے۔ یہی وہ راز ہے جس نے اسکے کلام کو وہ مرتبہ بخشا جو آج دنیا جہان کی شاعری میں اسے حاصل ہے ۔

بالآخر یہہ کہا جا سکتا ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور دنیا کا ایک ممتاز پیغامبر شاعر ہے۔ وہ روحانیت محبت اور اخوت کا پیغام پہونچاتا ہے۔ شاعر کے نغموں سے پڑھنے والے اپنی سمجھ کے مطابق معنی نکال لیں مگر انکے اصل معنی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسنے شاعری میں روحانیت پیدا کردی۔ وہ شاعری میں ان ہی مقاصد کو پیش کرتا ہے جن کا علم دنیا کے تمام پیغمبروں نے بلند کیا تھا اور اسکے لئے تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ زمانہ موجودہ میں اسکی شخصیت ایک خاص وقعت رکھتی ہے۔ اسکی زندگی کا مقصد شرق و مغرب میں اتحاد پیدا کرنا ہے اور ایک

حد تک وہ اس میں کامیاب رہا ہے۔ اسکے نزدیک کسی انگریزی شاعر کا یہ خیال کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور دونوں کبھی ایک نہ ہوسکیں گے" دعوے باطل ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے امتزاج کا حامی ہے۔

اعلیٰ اوصاف (اوصاف حمیدہ) کسی خاص قوم یا فرقہ کا مخصوص حق نہیں ہوتے لیکن یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسانی صفت کسی خاص قوم میں بدرجہ اعلیٰ موجود ہوتی ہے۔ مغرب جذبہ سے آزادی کا گہوارہ رہا ہے اور آزادی کی روح جواب مشرق میں پائی جاتی ہے مغرب ہی کی منت پذیر ہے۔ ٹیگور کے یہاں آزادی کی خواہش بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ ڈھکوسلوں اور خلاف فطرت باتوں کا قائل نہیں۔ وہ اپنی اور وطن کیلئے جو دعا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ۔

"جہاں من بے خوف اور سربلند ہو جہاں علم کی فراوانی ہو۔

جہاں آپس کے جھگڑوں نے عالم انسانی کو منتشر نہ کردیا ہو۔

جہاں عقل و شعور کی شفاف نہر عادت کے غلیظ اور ریتیلے صحرا میں گم نہ ہوگئی ہو۔

اس آزادی کی بہشت میں میرے پیارے وطن کو بیدار کر"

اگر اسکی محبت ذات (خودی) کو مغرب سے منسوب کیا جاسکتا ہو تو اسکی عقیدت جو اسکے بربطی نغموں میں نمایاں ہیں، خاص طور پر ہندی ہے! اسکا صوفیانہ رنگ مشرقی ہے لیکن انسانیت مغربی ہے۔

جب وہ تماشا گاہ عالم میں اس ایک کا جلوہ دیکھتا ہے تو وہ ہندی فلسفی کا ہم خیال ہے لیکن جب وہ زندگی کیلئے کوشاں نظر آتا ہے تو پھر ہندی فلسفی کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ اسکے نزدیک بخشش اسمیں نہیں ہے کہ خود کو بھول جائے۔ وہ کہتا ہے۔

"میں اپنے حواس معطل نہ کرونگا۔۔۔۔۔۔۔ انہی کے ذریعہ شہر محبت حاصل ہونگے!"

اس بناء پر اسے انسانیت کا شاعر کہنا بجا ہوگا۔ اسکی غیر فرقہ بندی یا آزادی مذہب کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ جہاں وہ مغرب کی خامیوں کو بتلاتا ہے وہاں مشرق کی کوتاہیوں پر بھی انگشت نمائی کرتا ہے۔

"قومیت" سے جو مراد مغرب میں لیجارہی ہے اور جسکی پیروی مشرق میں ہو رہی ہے اس سے ٹیگور کو کوئی دلچسپی نہیں۔ مغرب کا سیاسی اور تجارتی غلو اسکے نزدیک موجودہ تہذیب کی برائی کی جڑ ہے! اسکی

دعا بھی ہے :-

"انسان روحانیت میں غرق ہو کر مادیت کے ظلم سے آزاد ہو جائے"

کارلائل کی طرح ٹگور بھی یہہ محسوس کرتا ہے کہ عالم انسانی تنزل پذیر ہے۔ کیونکہ وہ سلما مادیت کی دیوی کے مندر میں جو دجلا رہا ہے "اسکے نزدیک دنیا کی لا انتہا ہی قوتیں اپنی حقیقت کا اظہار حسن میں کرتی ہیں .... حسن اور صداقت تمام ہیں"

شاعری سائنس۔ اور سیاسیات میں روحانیت کا پیدا کرو دنیا ہند جدید کے کارناموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ کیا یہہ ہندوستان کی تہذیب کی قابلیت کی کافی صداقت نہیں کہ بیسویں صدی میں جبکہ ہم اپنے اسلاف کیطرح سیدھی سادھی بلند خیال زندگی بسر نہیں کرتے تب بھی ہندوستان کو دنیا میں اپنے تین بلند پایہ سپوتوں کے مقاصد و کارناموں کے بدولت اعزاز حاصل ہے۔ ان میں ایک مشہور سائنس داں دوسرا سر آور دہ صوفی شاعر اور تیسرا اعلیٰ اخلاق کا حامی ہے ہر ایک عالم انسانی کے ناز تحیر۔ اور تحسین کا مستحق ہے۔

افضل حسین فاروقی

برادر عزیز مسٹر خواجہ علاء الدین (بھوپال) جن کو ہاکی سے ہمیشہ شوق رہا، اور جو کالج کے کھلنڈروں کی صف اول میں رہ کر ایک مدت ہوئی Colour holder بن چکے ہیں ان کو کلکتہ کے انٹرنیشنل میچ میں کلکتہ طلب کیا گیا تھا لیکن ذاتی وجوہ سے انھیں شرکت کا موقعہ نہ مل سکا البتہ یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں علیگڈھ جا کر ہاکی ضرور کھیلا کرتے ہیں۔ اسپورٹس کے باب میں ہم اپنے عزیز بھائی مسٹر ناظر حسن انصاری (گوالیار) کا مراسلہ آئندہ شایع کریں گے جس کی جانب توجہہ کرنے کی ان تمام بھائیوں کو ضرورت ہے جن کو تفریحی مشاغل سے دلچسپی ہے۔

ویرہ دون اور سہارنپور کے خوشش ذایقہ چاولوں کے شوقین حضرات! حافظ منظور احمد د ملیگ ہے

[illegible]

من کی موج

گولکنڈہ کی شرقی فصیل پر کھڑے ہو تو اک عجیب منظر آنکھوں کے سامنے کھل پڑتا ہے وامن ہی میں ڈراؤنی خندق ہے۔ یہیں ان فدائیاں عالمگیر کی آرامگاہ بھی ہے جنہوں نے جانیں دیکر قلعہ لیا تھا! انسان! اُف! یہہ تیری خونی ہوسناکی!! جو شفیق باپوں، عزیز فرزندوں پیارے بھائیوں اور محبت دار خاوندوں کے خون سے سینچی جائے! حیرت سی حیرت ہے کہ یہاں خوش عیش تانے شاہ سے نازک مزاج اور خوش صفات عالمگیر سے خداشناس کی پیاس بھی بندگانِ خدا کے ہی خون سے بجھی!

فصیل سے ذرا آگے پُل کے بائیں طرف "لنگر حوض" والے تالاب کا صاف آئینہ سندر نیچر کی تصویر لے رہا ہے۔ دائیں طرف وہاں کے مخملی کھیت ہیں، جن کے نرم نرم فرش پر نیچر کی دیوی ایک رنگیلی شاعر[1] کے ساتھ ساتھ یوں "رنگ" سنگھوے چلی آرہی ہے:-

وہ بال سنہری لہرائے
سُورج نے صورت دِکھلائی
وہ پرکاش کے طوفاں آئے
نور میں جگتی ساری نہائی
نور کی نہریں رنگ کی لہریں بول اٹھی ہے منھ سے خدائی!

پرند کی سہانی چہکار نسبتاً کم ہو گئی۔ اب یا تو انکے غول کے غول بسیرا لینے لگے، ایک وقت ہے دوسرے پر چہچہی تھی کی

---

[1] اس مضمون میں جسقدر نظم کا حصّہ ہے اسمیں مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم کے کلام کو کام میں لایا گیا ہے۔

گل اندوزی کیطرح جا رہی ہیں! تالاب پر آبی پرندوں کی بہار ہے، بگلا بوٹیوں کی ٹکڑیاں تاؤ سے کاٹ کاٹ کر جدا
ایک رخ اتر رہی ہے وہاں کے لہلہاتے کھیتوں میں کلیجائی کی گھا گھی ہے، اندھرا دیس کی سندر
پتریوں کی دور دور ایک لنگتار چلی گئی ہے، جو کویل کیطرح کوکتی بھی جاتی ہیں۔ گیت کا نچوڑ "حسن و عشق"
کے معاملہ سے زیادہ نہیں، مگر ہندی نزاکت نے ناز و نیاز کی غضب گھلاوٹ بھر دی ہے!

"چندرماں! دیکھ تو کتنی رات آگئی! مجھ پیت کی ماری کی سجریا اب بھی سونی ہے! کہیں
اسی بات کا تو تیرے دل پر بھی داغ نہیں ہے؟!

"للہ تو یونہی انھیں دیکھے جا، شاید بیرن کو مناتے مناتے وہ بھی تھک کر تجھے دیکھ لیں! لاؤ،
یوں ہی آنکھیں چار ہو جائیں!"

"اچھے چندرماں! اپنی دودھ سی کرنوں کا انبر جھو رہا ہیں دکھیاری درد کی ماری تیرے پیر
پڑوں گی، لونڈی بنوں گی۔ تجھ پر سے جیو ٹپ کر دوں گی، آتما واں دوں گی!!"

تلنگانہ کے یہ گداز بول جن کا خلاصہ اوپر دیا گیا، سُریلی آوازمیں پرندے کے گیتوں کیطرح پھیل رہے ہیں
جس سے روح پر حسین جذبات کا ایک رنگ آتا ہے، ایک آجاتا ہے۔ ذرا سوچئے تو ایک بے کل پرشباب کے
کے یہ سہدی ارمان ہیں بھی کتنے فطری اور محبت لیئے!

صحت و اطمینان کی یہ بھیلی پتریاں بھی، واقعہ یہ ہے، حسن سے خالی نہیں۔ محنت کے سڈول اعضاء
میں صحت کی سج دھج اور گاؤں کی سادگی ہے، جو انکی پشتینی دولت ہے۔ چہروں پر سوچ کی اداسی کی جگہ
دہاتی بھولپن اور خوشی کا نور پڑا برس رہا ہے۔ ساتھ ہی جائز غرور کا موہن وقار بھی ہے کہ بچہ، بوڑھا، مرد،
عورت، امیر، غریب سب کے سب ہمارے دست نگر ہیں! انکی ساری زندگی اپنے پالے پوسے معصوم
دہات کی سی ہوتی ہے، جو دنیا کی ہوا کھا کر دنیا سے الگ تھلگ بھی رہتا ہے اور اس کا پیٹ بھی پالتا ہے۔
یہ ان منگرکہ محسنوں کی بہو بیٹیاں ہیں۔ جن کا اوڑھنا بچھونا صبح و شام کھیت ہے اور جن کے طفیل جان
کی کھیتی پھولتی پھلتی ہے! ہائے، وہ مقصد زندگی جو دنیا کی بہت ساری فضول باتوں سے توڑ کر یوں کام بنادے
سحر کی دیوی نے ابھی افق کی سیج پر کروٹ لی نہ لی کہ ان کام کی رسیاؤں کو کھیت کی محبت

کھینچ لیتی ہے۔ بے فکر دنیا ابھی لمبی تانے بے خبر ہی ہے کہ یہ گاؤں کی دلاریاں اسکے پیٹ پالنے کی فکر میں لگ جاتی ہیں۔ صبح کا نور چھاجوں برس رہا ہے۔ ہوا کے ٹھوکے گدگدا رہے ہیں۔ یہ اس لطف میں ڈوبی ہوئی تو ہیں لیکن کام سے غافل نہیں! تن من دھن اپنے آپے کی فکر سے زیادہ دوسروں کی خدمتگزاری میں لگا ہوا ہے! غرض اندھرا ماتا کی گود میں دیکھتے دیکھتے یوں ہی انکے آرام کا وقت بھی آجایا کرتا ہے۔ اور جب شام کی اداس خاموشی سہج سہج اپنا رنگ جمانے لگتی ہے، تو یہ بھی اپنے زمردیں ماحول سے نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ ڈوبتے سورج کے سنہری آنچل سروں پر پڑے ہوئے ہیں اور یہ خوشی خوشی اسطرح گھر واپس ہو رہی ہیں جیسے حیدرآباد کے سارے روایتی "حسن" یہی سمیٹ کر لئے جاتی ہیں!

اس لطیف منظر سے اِن بھولی بھالی گاؤں کی دیویوں کی محنت و ایثار پر رشک آنے لگا، جو ہے بھی یہ کہ دنیا کا سب سے مقدم کام ہے! ساتھ ہی خیال ہوا ان کام کی دیوتوں کے مقابلہ میں اپنا کیا دھرا عشرِ عشیر بھی نہیں رہتا۔ کیونکہ انکے شریف کام میں جہان کی بھلائی نظر آئی، جس میں الٰہی شان پڑی جھلک رہی تھی! چہ جائیکہ ہم میں سے بہت سے نستعلیق شہریوں کی لمبی چوڑی باتیں نری باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں۔ جو مداریوں کی طرح اسٹیٹ کر کر کے کاغذ، قلم، دوات کی مشیخت پر اینٹھے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ اور اُن سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ دو وقت کھانا نہ ملے تو پھر ان کاغذی گھوڑوں کی حقیقت معلوم! ویسے بھی ہماری بہت سی باتیں کارآمد تو در کنار معصوم بھی نہیں گنی جا سکتیں۔ اسبات کے لئے تو سب کی نظریں یا تو اس خوش و خرم انسان ہی کیطرف اٹھتی ہیں۔ جو بھلائی کے بیج بوتا اور محنت کے پسینے سے انھیں سینچتا رہتا ہے! یا نہیں تو پھر ایک ایک کر کے دوسرے بھی ایسے ہی کام سامنے آنے لگتے ہیں جو تتمۂ حیات ہیں۔ باقی رہی اور باتیں تو یہ سب کی سب بے فکری کا بے تکا پن ہیں! جس سے دِکھ سوائے مشکلات اور افکار کے کچھ حاصل نہیں۔ یہی چیز ہے جس سے ایک بہشت نصیب شاعر اس گرنتھ جگ میں کام کی ہی ساری برکت نظر آئی!

شاعر نے "جیت کی کنجی" عطا کرتے وقت کام کی بڑی پیاری اور پُر زور تعبیر کی ہے۔ دلّی کی ساہی زبان میں گویا خیال کی انتہائی پینگیں بڑھائی ہیں۔

"کام عبارت ہے سرگرمی سے کام دماغی بجلی ہے۔

اس زور سے ہر مشکل ٹلتی ہے۔

سارے زوروں کا زور یہی ہے یہ ہی جیت کی کنجی ہے۔

کام سے دنیا آگے چلتی ہے"

یہ سرگرمی، یہ دماغی بجلی، جیت کی کنجی سہی، مگر ایسے دکھ سکھ میں الجھی ہوئی ہے جن کا دوسرا نام زندگی ہے۔ شاعر کا یہ خیال صحیح خیال ہے کہ اس دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں میں مردانہ وار رہنا سہنا ہی "زیست" ہے۔

"دکھ اک سکھتا ہے جان کو یں دکھ آرام نہیں چین نہیں
سکھ خواب ہے گویا دکھ بیداری
ہر کام میں دکھ ہے دکھ میں سکھ ہے گر کام نہیں چین نہیں
ہے کام کی جگ میں برکت ساری"

<<<<<<<<<<

سکھ کا منشا ہے بس اتنا ہی سکھ کام کی ہے تیاری
سکھ سے تازہ دم کام کے قابل
دن بھر کام کا پھل رات کی نیند اس نیند کا ثمر بیداری
سکھ یا دکھ یکساں سمجھ عاقل"

<<<<<<<<<<

زیست کے معنی ہیں درد کا سہنا سکھ اٹھانا مردانا
ڈر کا پھل دنیا ڈر کا مٹانا
جان ہتیلی پہ رکھنا جینا ہارنا جی کا مرجانا
جان کا کھو دینا جان کا پانا"

غرض تو دیکھ سکھ کا یہہ گہرا مطالعہ گویا بالفاظ دیگر مطالعہ زندگی ٹھیرا جس میں یہاں سے وہاں تک کام کی روح دوڑی ہوئی ہے۔ لیکن شاعر کا دل انتہائی باتوں کا کھوجی اور ہر بات کی لم چاہتا ہے۔ اسلئے اپنی نگاہ کو محدود کرنا بدترین گناہ سمجھتا ہے۔ اُس کا ہر مراقبہ حیات کو لطیف سے لطیف تر، اور اسکی ہر داخلی کیفیت جذبات کو بلند سے بلند تر بناتی جاتی ہے۔ اس کا حوصلہ چاہتا ہے کہ کائنات کی پہیلیوں کو وہ دن کیطرح صاف و روشن کر دے۔ مگر عقل کی حد اسپر پردے پر پردے گرا کر حقیقت کو رات کیطرح چھپاتی جاتی ہے۔ غرض شاعر کے بطون کی یہہ کیفیت ایسی دھوپ چھاؤں ہے۔ جو دن رات کی طرح اٹل ہے۔ شاعر نے زندگی کو "کام" کا بنایا تو فطرۃً جی سیر نہوا اور آگے بڑھا۔ حوصلہ مند بصیرت چاہتی ہے کہ حقیقت کی نقاب الٹ دے مگر جیسا کہ اس راہ میں اچھے اچھوں کا حال ہوا۔ انکی آنکھوں میں بھی نور الٰہی سے ایسی چکا چوند لگی کہ زندگی "پہیلی" نظر آنے لگی۔ جس کا اظہار ایان کی یہہ ہے "کہ ایمان کی نشانی اور عین بن گی ہے۔

"ہے ایک پہیلی اپنا جینا ایک معمہ مرجانا
اک راز یہاں کا آنا جانا
خون جگر پینا تو جھنا اسکا صفت کا گویا غم کھانا
آخر یہی جانا کچھہ نہیں جانا"

ان خیالات سے طبیعت میں خلجان پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن سچ یہہ ہے کہ ہر کارے وہر مردے۔ ہمارا کچھ ہی کام کیوں نہو، خلوص نیت سے ہو تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ کائنات کی کوئی شے بیکار نہیں۔ مگر اُسے کام کا بنانا ہمارا کام ہے! اسلئے خلوص کی دو سطریں، دو بول بھی بشرطیکہ نیک نیتی سے نکلے ہوئے کام کے ہیں۔ اس اشارہ میں سوچ خاصا اونچا ہوآیا! انسان سے لگا کر چرند پرند تک اپنے اپنے کام سے لگ چلے، خیال کے یوں یکایک پلٹا کھا جانے سے میری بھی ڈھارس بندھی۔ خدا عمل کی بھی توفیق دے!

سید وزیر حسن

یادِ ایّام

تکلف عزازیل را خوار کرد

راوی کہتا ہے کہ "قدردان دیور" اپنے بھائیوں کی نظروں میں بہت مقبول ہوا۔ مگر معلوم نہیں کہ صرف قدردان دیور کی قدردانی پسند خاطر ہوئی یا صرف شریف بھابی جان کی مہربانی یا انصاف پسند ناظرین نے دیور اور بھابی کو تنہا چھوڑ کر چٹپٹے کبابوں کا نمکین مزہ اٹھایا۔ اگر اس ڈگر ہی کا مصلح معدہ اور مرغوب مضمون مطلوب ہے تو جناب :۔

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

نہ ہر دیور ایسا قدرداں ہو سکتا ہے نہ ہر بھابی ایسی مہماں نواز، نہ ہر حاضر الوقت ایسا نمک حلال نہ یہ کہ ساوی مناسبت کے ساتھ کباب ہی مزے کے ہوں اور انکے ساتھ انصاف کرنیوالا بھی مخلص ہو اور نظم بھی فوراً تیار ہو جائے مختصر یہ کہ جبتک دوبارہ اسی قسم کا خوشگوار اور خوش ذائقہ واقعہ پیش نہ آئے کسی دلچسپ تحریر کا ارادہ کرنا مشکل ہے۔ وہ زمانہ تو گیا جب دروغ مصلحت آمیز پر عمل کر کے رات دن سب اکٹروں ڈاکٹروں اور استادوں سے جھوٹ بولنا پڑتا تھا یا ڈبیٹنگ سوسائٹی ( ) میں امتیاز حاصل کرنے کیلئے جھوٹے اور فرضی دلائل پیش کئے جاتے تھے۔ اب وہ زندگی ہے نہ جھوٹ بولنے کی مشق ہے، اسلئے بلا کسی واردات کے بوستانِ خیال کے مصنف کا منہ چڑانا یقینی اگر غلطی نہیں تو کوئی عقلمندی بھی نہیں ہے۔

محض اشتیاقِ ناظرین کی خاطر ایسا خوش ذائقہ واقعہ کہاں سے لایا جائے۔ تذکر نہیں تو منظر بھائی کی "کباب مکرر" کی فرمایش بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور پھر شرط یہہ کہ رنگ بھی وہی اور لطف بھی وہی ہو۔ میں نے تو اپنے طور پر مصمم ارادہ کیا تھا کہ منظر بھائی کے ارشاد کا بہترین جواب خاموشی ہی ہوسکتا ہے (دیرانہ بایگا) مگر دوبارہ حکم نافذ ہوا۔ مجبورًا دماغ اور حافظہ پر زور دینا پڑا اور ایک واقعہ فورًا یاد آگیا۔ خوش ذائقہ یا خوشگوار واقعہ ہے یا نہیں اسکا فیصلہ خود منظر بھائی فرمالیں لیکن اسمیں شک نہیں کہ یہہ واقعہ اگرچہ رنگ میں مختلف مگر مزہ کی حد تک مماثلت ضرور رکھتا ہے! اور چونکہ تعمیل ارشاد میں پیش کیا جارہا ہے اسلئے اگر اوروں کو نہ سہی تو منظر بھائی کو مجبورًا اور اخلاقًا ماننا پڑے گا کہ کبابوں کا لطف نہو مگر دلچسپ ضرور ہے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے شعر

تکبر عزازیل را خوار کرد
بزندانِ لعنت گرفتار کرد

کے متعلق اکثر احباب کہتے ہیں کہ انسان چونکہ غلطیوں سے مرکب ہے اسلئے کچھ عجب نہیں کہ شیخ علیہ الرحمہ نے خود غلطی نہیں تو سو میں ننانوے (۹۹) بار کاتب نے ضرور غلطی کی ہے اور "تکلف" کے بجائے "تکبر" لکھ دیا ہے۔ وزن کے اعتبار سے تکلف بھی بلا تکلف موزوں ہوجاتا ہے اور معنی کی اعتبار سے بھی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ شیطان نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے میں تکلف کیا اسلئے خوار ہوا۔ بہرحال ہماری غرض بھی یہاں تکلف سے ہے تکلف ہی کو ترجیح مناسب ہے، اور اس میں کوئی ہرج نہیں کہ فرض کرلیا جائے اسلئے کہ فرض کرنا کوئی گناہ نہیں دوسرے یہہ کہ زمانہ تعلیم میں بھی ہمیشہ استادوں نے فرض کرنے کی تعلیم دی ہے اور پڑھے ہوئے پر عمل نہ کرنا بڑی غلطی ہے (یاد کیجئے اسباق اقلیدس جبر مقابلہ۔ وغیرہ وغیرہ) خلاصہ تحریر یہہ کہ فرض کر لیجئے کہ تکبر کے بجائے تکلف ہی ہے تو اب دیکھنا یہہ ہے کہ روزانہ زندگی میں تکلف کہاں تک کامیاب ہوسکتا ہے۔

اس واقعہ کا جو آگے آئیگا صحیح سنہ تو یاد نہیں مگر زمانہ وہی تھا جب کالج اور اسکول کے لڑکوں میں رہنے کی تفریق نہ تھی، اور یکی بارک میں کالج والوں کے ساتھ اسکول کے لڑکے بھی رکھتے تھے۔ دوسرا اتا پتا اس واقعہ کے زمانہ کا یہہ ہوسکتا ہے کہ اسوقت تک نواب وقار الملک مرحوم سکرٹری نہیں ہوے تھے، اور نہ ابھی تک امپوزیشن اور جرمانوں کے اعتبار سے اسکول کے لڑکوں کیلئے تین وقت کی اور کالج کے لڑکوں کیلئے صرف دو وقت کی نماز

فرض تھی۔ آخری بلکہ اہم توضیح اُس زمانہ کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُس وقت "ممتاز" مشہور فیرینی والا زندہ
تھا اور بلا ناغہ اپنا خوانچہ سر پر لیکر روزانہ گشت لگایا کرتا تھا۔

حُسنِ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک خاندانی امیرزادہ غالباً لکھنؤ یا اسکے اطراف کے
رہنے والے داخلِ اسکول اور یکی بارک کی ۶، ۷ یا ۸ نمبر کے کسی کمرہ میں مقیم ہوئے۔ نوگرفتار تھے کبھی بورڈنگ
کی زندگی سے سابقہ نہیں پڑا تھا شرافت کے ساتھ ساتھ باہمی تعلقات بڑہانے کا شوق اور ہر دلعزیزی
پیدا کرنیکا ذوق تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، ہم لوگوں نے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر خوب آؤ بھگت کی۔
یار لوگوں کی عید آ گئی اور حلقۂ احباب کی وسعت کے ساتھ ساتھ اخلاق اسقدر وسیع ہوتے گئے کہ
انکی سیر چشمی کی خاطر بعض بعض اوقات نئے دوستوں کو ڈائننگ ہال ایسے اہم مقام کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔
اچھے اور بڑے گھر کے لاڈلے بیٹے تھے یادرانہ احتیاطوں کے عادی تھے گھر پر عمدہ گرم شوربا
چپاتی نپا تلا ملتا تھا۔ معدہ کو اس سے پہلے کبھی افزائش کا موقع نصیب نہیں ہوا تھا تبھی آزادی ملی تھی۔
پیسہ کی کمی نہیں تھی تقاضائے ہاضمہ کے نشوونما میں ترقی ہونے لگی اور کشادہ دلی سے احباب کی خاطریں
ہونے لگیں۔ تعریفوں کے پُل باندہے جاتے تھے خوانچے والوں کی سنت پوری ہوتی تھی، اور "ممتاز"
فیرینی والے کی خاص طور پر سرپرستی فرمائی جاتی تھی۔ ایک دن خاص دعوت کا مقرر ہوا۔ مہینے کی شروع
تاریخوں کی وجہ سے منی آرڈر ایک ہی دن قبل آ چکا تھا۔ امتحان کا زمانہ سر پر تھا دماغی ترقی بھی ملحوظ خاطر
تھی، اسلئے دعوت کیلئے بادام کی فیرینی کا انتخاب ہوا اور حسبِ "ممتاز" کو مطلع کر دیا گیا۔ دعوت کا مسئلہ اور
فیرینی کا انتخاب ہر دو پر شور سے بالاتفاق و بلا اختلاف طے پایا کہ آجتک گورنمنٹ آف انڈیا لیجسلیٹو
اسمبلی کا کوئی رزولیوشن بھی اس شان سے کبھی پاس نہوا ہوگا۔ الغرض شام کے وقت کے ساتھ ساتھ
وہ نیک گھڑی بھی آ پہونچی اور ممتاز بھی حاضر ہو گیا۔ احباب نے خوب دل کھولکر نہایت خلوص سے
فیرینی کھائی اور اسپر وہ سب سے زیادہ خود میزبان صاحب نے ممتاز کو ممنون فرمایا۔ تعریفیں ہوئیں قصیدہ گوئی
ہوتی رہی دعائے ترقی مال و دولت مانگی گئی، اور ممتاز فیرینی والا اپنا خوانچہ خالی کرکے خندہ پیشانی کے
ساتھ سلام کرکے رخصت ہو گیا۔ اسکے چند گھنٹے بعد اس شان سے کہ ڈائننگ ہال کی کوئی گھنٹی بھی سنائی

نہیں دی۔ شکم سیر احباب ٹانگیں پسار کر سو گئے (رات بھر کیا واقعات پیش آئے معلوم نہیں)

صبح صادق کا ذکر کرنے سے پیشتر اس نوبت پر لکھنؤ کا تکلف والا ریل چھٹ جانے کا واقعہ یاد دلانا ضروری ہے اور اسکے بعد ناظرین اولڈ بوائے کی توجہ بیچی بارک کے اُن جو گوشیہ بیت الخلاؤں کیطرف منعطف کیجاتی ہے جو ۲۰ ۲۱ نمبر کے کمروں کے مقابل دو باغیچوں کے بیچ میں قائم ہیں۔ صبح ان باغیچوں کیطرف چہل پہل ہونے لگی صاحبزادے صاحب بھی مع احباب کے لوٹا لیکر پہونچے۔ مگر بدقسمتی سے چاروں بیت الخلا بند پائے۔ "جائے تنگ است مرداں بسیار" کا مضمون تھا انتظار کی شدت بڑھتی جاتی تھی کہ اسی درمیان میں صاحبزادہ صاحب اور انکے رفیق نے مشرق رویہ بیت الخلا کی امیدواری اسلئے منظور کی کہ امتحان بھی قریب تھا اسکی اندرونی دیواریں نسبتاً صاف تھیں۔ اور شرط قبض اقلیدس کی شکلیں دیواروں پر پنسل سے بنا کر حل کرنیکا اچھا موقع ملتا تھا۔ بدقسمتی سے اسی بیت الخلا میں بھی ایک ایسے صاحب رونق افروز تھے جو ثابت قدمی اور استقلال کے اعتبار سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے کم نہ تھے اور مستحکم قبضہ کئے ہوئے تھے۔ بعد انتظار شدید و مدت مدید در اجابت وا ہوا تو دونوں امیدواروں میں تکلفانہ مراسم بھی شروع ہو گئے۔ بڑی دیر تک تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ گا نزہی جی کا خلوص مسلمہ ہے لیکن ان دونوں حضرات نے جس اخلاص سے مراسمانہ تکلف کو ادا کیا وہ بھی قابل صد آفرین تھا۔ ایک دوسرے سے یہی کہتا تھا کہ "آپ ہی پہلے تشریف لیجائیے تکلف نہ فرمائیے" صاحبزادہ صاحب اپنی ہر دلعزیزی کے شوق کی حد تک ایثار پر تلے ہوئے تھے۔ دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کسیطرح یہہ قضیہ طے نہوا۔ اخلاق میں طرفہ زیادتی ہونے لگی اور اس مقابلہ کی نوبت آئی کہ کون فتح پاتا ہے اور کسکی شکست ہوتی ہے۔ نوبت بانیجا رسید کہ صاحبزادی صاحب کی دستگیری کیلئے قدرت کو مداخلت کرنا پڑا بعدہٗ الحمد للہ صاف ہو گیا۔۔۔۔۔ یہہ فرما کر نیچے گردن کئے ہوئے شرماتے ہوئے آہستہ خرامی سے اپنے کمرہ میں واپس گئے اور داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ اسکے بعد صحیح طور پر خدا جانے کیا ہوا لیکن قیاس یہی چاہتا ہے کہ کپڑے بدلے گئے ہونگے۔

نثر نگاری کا میں بہت کم مرتکب ہوا ہوں باستثنا تعمیل کر دیگئی ہے آئندہ اگر منظر بھائی کو ضرورت ہو تو مصرعہ ذیل پڑھکر حاجت رفع فرما لیا کریں

- ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے -

وفا

ہمارا کالج

۱۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کے پرائیوٹ سکرٹری نے ذریعہ پیام برقی پریس کو مطلع کیا ہے کہ
جو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے کاروبار کے متعلق جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا، اور اس نے جو رپورٹ پیش کی تھی
اس کو علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال امیر جامعہ (چانسلر) نے بہت ہی غور کے ساتھ تمام و کمال پڑھا
اب ضرورت اسکی ہے کہ عہدہ داران یونیورسٹی بھی اس رپورٹ پر غور کریں، کیونکہ یہہ مناسب معلوم
ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں یونیورسٹی کے متعلقہ انتظامات ہیں ان کو بھی موقع دیا جائے
کہ غور و خوض کے بعد وہ بھی اس معاملہ میں اپنی رائے ظاہر کر سکیں۔ اسلئے نائب امیر جامعہ (وائس
چانسلر) ضروری کارروائی کر رہے ہیں کہ جیسے ہی عہدہ داران یونیورسٹی اس باب میں غور کریں،
ایک جلسہ طلب کیا جائے جس میں ان عہدہ داروں کو بھی شریک کیا جائے۔ اس رپورٹ پر علیا حضرت
امیر جامعہ کے خیالات اور انکی رائے، اور عہدہ داران یونیورسٹی کی رائے کے ساتھ، اصل رپورٹ
کو عامتہ الناس کی اطلاع کی غرض سے شایع کیا جائیگا۔ یہہ امید کیجا رہی ہے کہ رپورٹ اور عہدہ داران
متعلقہ کے آرا کی اشاعت .... کسی وقت ممکن ہوگی۔ (رپورٹ شایع ہو گئی)

۲۔ برادر مکرم ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے، اولڈ بوائے کو مکرر جاری کرنیکی تجویز سے
اتفاق کرتے ہوئے، ضروری امداد کا وعدہ فرمایا تھا۔ پچھلے دنوں ہم نے ایفاء وعدہ کا تقاضہ کیا تو جواب
میں ارقام فرماتے ہیں "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے اولڈ بوائے کی معاونت جیسا میرے جی میں تھا نہ کر سکا۔
مناسب یہ ہوگا کہ آپ اس یونیورسٹی کے طلبا میں سے اپنے کسی شناسا طالب العلم کو اپنا نمایندہ مقرر کریں،

اور وہ ضروری معاونت کیلئے ہمیں وقتاً فوقتاً متوجہ کرتے رہیں"۔ اس کام کے لئے اپنے عزیز طلبہ میں سے ہم کسی کا انتخاب کرتے لیکن ابتک جو خبریں ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے استعفار داخل کر کے عزم سفر حج بیت اللہ فرمایا ہے۔ خدا ہمارے بھائی کا حج قبول فرمائے۔ اپنی آئندہ زندگی میں ڈاکٹر صاحب کا کیا قصد ہے۔ ہمیں اسکی اطلاع نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر اے ایل کے حیدر عارضی پرووایس چانسلر بنائے گئے ہیں۔

۳۔ ہم یہ معلوم کر کے خوش ہوئے کہ ہمارے چھوٹے بھائیوں میں سے مسٹر سید مہربان علی صاحب متعلم ایم اے وایل ایل بی (علیگڈھ) کو رائل اکنامکس سوسائٹی لندن نے اپنا فیلو مقرر کیا ہے۔ ہمارے یہ عزیز معاشیات کی تعلیم پانے میں مشغول ہیں۔ مبارک ہو۔

برادر مخدوم و مکرم مولوی شیخ عبداللہ صاحب نے مسلم گرلس انٹرمیڈیٹ کالج علیگڈھ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۵ اپریل ۲۸ء میں پیش کرنے کی غرض سے جو رپورٹ بابتہ ۲۷ء تیار فرمائی ہے اسکا ایک مطلوبہ نسخہ ہمارے پاس بھی بھیجا ہے۔ یہ رپورٹ ایجنڈا کی شکل میں ہے، اور اس سے علیگڈھ کی زنانہ تعلیم کے باب میں کما حقہٗ وضاحت ہوتی ہے۔ رپورٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سال مذکور میں امتحان میٹرک میں اس مدرسہ کی جو لڑکیاں شریک ہوئی تھیں انکے منجملہ ایک دختر ثروت آرا بیگم ہماری یونیورسٹی میں اول آکر اسی کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں اس سال پھر ایک لڑکی شریک ہوئی تھی، اور کامیاب ہوگئی۔ مڈل کے امتحان کیلئے پانچ لڑکیوں نے کامیاب کوشش کی۔ ایجنڈا کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ درس گاہ ناکافی اسٹاف کے ساتھ چلائی جارہی ہے اور اسکول و کالج کی چودہ جماعتوں میں ایک ایک کلاس کے لئے ایک ایک استانی بھی نہیں ہے۔ ہیڈ مسٹرس کی سعی قابل شکر گزاری ہے کہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ درسگاہ کے کاموں پر صرف کرتی ہیں۔ اور اس اچھی مثال نے دوسری معلمات میں تازہ روح پیدا کردی ہے۔ آمدنی اکیس ہزار چھ سو پانوے روپیہ ہے اور اسکے مقابلہ میں پیش نظر خرچ تئیس ہزار تین سو ستاسی روپیہ۔ اسیطرح وظائف فنڈ کی آمدنی ایکہزار نوے روپیہ ہے، اور خرچ سولہ سو چھپن۔ زنانہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس موقعہ پر اپنی دریا دلی کو کام میں لائیں۔ ہم شیخ صاحب اور

ساتھ ہی انکی بانوئے محترمہ کے اسلیئے زیادہ منت پذیر ہیں کہ ایک ہی مقصد اور ایک ہی کام کیلیئے ان کے وقت کا زیادہ حصّہ صرف ہوتا ہے، اور اسطرح یہ دونوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں اپنے ہمدرد و معاون پیدا کر لئے ہیں ۔

پچھلی ولایتی ڈاک سے ہمیں جو خطوط وصول ہوے ہیں ان میں ایک تو برادرم مسٹر حضور عالم کا خط ہے، اور دوسرا اخی مسٹر سید محمد طاہر رضوی کا۔ آخر الذکر نے ہمیں ہدایت فرمائی ہے کہ ہم اولڈبوائے اُن کے لندن کے پتہ پر جاری کردیں۔ البتہ برادرم حضور عالم صاحب نے اپنے حالات کو وضاحت سے بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ "کالج پہنچتے ہی علی بابا کے چالیس سواروں (؟) میں داخل ہوگیا تھا۔ آخر تک ساتھ نبا ہا ۔۔۔ بعد کو پچھلے پلٹن کی سرداری نصیب ہوگئی تھی"۔ اپنے زمانہ کے اہم واقعات میں تحریر فرماتے ہیں "سنہ ۱۹۲۱ء کی وہ ہرتال جب کہ ڈائننگ ہال ہفتوں بند رہا، میری ہشت سالہ زندگی کے اہم مگر دلچسپ واقعات میں ہے۔ انشاء اللہ کبھی فرصت میں اس کی کیفیت مفصل لکھوں گا، بشرطیکہ بھائی آفتاب اور بھائی حاذق برا نہ مانیں"۔ ہمیں امید ہے کہ برادرم حضور عالم بلا پس وپیش ان دلچسپ واقعات کو ہمارے حوالہ فرمادینگے۔ ہمارے بھائی کا قصد ہے کہ چھ مہینے انگلستان میں بسر کرکے، سال بھر کیلیئے جرمنی جائیں، اور پھر چند ماہ امریکہ میں بسر کریں۔ ان مقامات پر ان کا مطالعہ چرم اور چرمی اشیائے متعلق ہوگا۔

برادرم حافظ منظور احمد صاحب (سہارنپور) ہم سے دریافت فرماتے ہیں کہ "کہو تو سہارنپور کے اولڈبوائز کی فہرست بھیجدوں"۔ حافظ صاحب اپنے قصد کو ضرور پورا کریں اور جو بھائی اب تک خاموش رہے ہیں، وہ بھی اپنے اپنے مقام کے کھلنڈروں کی فہرست ضرور بھیجدیں۔

یہ خبر ہمارے لئے فکر سے خالی نہ تھی کہ برادر مکرم میجر سعید محمد خاں صاحب کے فرزند اکبر میاں اقبال سلمہٗ کو موٹر سے سخت چوٹ آئی اور جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ مریض کا مزاج اب رو باصلاح ہے۔

اولڈ بوائز

حیدرآباد میں رائٹ آنریبل لارڈ ہیڈلے کی تشریف فرمائی سے تعلق بہت سے تفریحی مشاغل انجام پذیر ہوئے۔ انکے منجملہ برادر محترم نواب رفعت یار جنگ بہادر اور برادر مکرم مولوی سید مظہر اللہ صاحب کے افطار صوم کو خصوصیت خاص حاصل ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مفید کام یہہ ہوا کہ مسجد نظامیہ لندن کے لئے ایک رقم کثیر کا انصرام اس عیدالمیلاد سے ہوگیا۔ حضور پرنور نے اس کار خیر میں اپنی جانب سے پانچ لاکھ روپیہ عطا فرماکر متوسلین دولت سے یہہ خواہش ظاہر فرمائی کہ باقی رقم کی فراہمی کا انتظام بھی ممالک محروسہ سے ہوجائے تو خوب ہے۔ اپنے آقائے ولی نعمت کی اس خواہش کی تکمیل بطیب خاطر مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر، نواب فخر الملک بہادر، اور نواب ولی الدولہ بہادر نے پانچ پانچ ہزار روپیہ عنایت کرکے فرمائی۔ دوسرے عمائد و معززین سے اس کار خیر میں مدد لینے کی غرض سے جو کمیٹی زیر صدارت برادر محترم نواب فخر یار جنگ بہادر قائم کی گئی ہے اُس میں فرزندان علیگڈھ کا ہاتھ بھی کام کررہا ہے۔ برادران نواب رفعت یار جنگ بہادر، نواب عابد نواز جنگ بہادر، مولوی محمد اصغر صاحب، مولوی احمد محی الدین صاحب، مولوی سید عسکری حسن صاحب، ڈاکٹر حامد علی صاحب، اور مولوی مظہر اللہ صاحب کے نام مجلس انتظامی میں شریک ہیں، اور یہ حضرات وابستگی کے ساتھ فرائض کمیٹی کو انجام دیتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس کام میں لارڈ ہیڈلے کو خاطر خواہ کامیابی ہوگی، اور پندرہ لاکھ کے منجملہ جو رقم باقی ہے، وہ بھی ممالک محروسہ ہی سے فراہم کی جائے گی۔ لارڈ صاحب اب حیدرآباد کو خدا حافظ کہہ چکے ہیں، باوجود اسکے ہمیں اُمید ہے کہ کام تیزی کیساتھ جاری رہے گا۔ (دوسرے شرکا کے نام آئیندہ درج ہونگے)

ماہ مبارک رمضان میں ہمیشہ عبادت کی بہار ہوتی ہے اور مسلمانوں کا ایک حصہ کثیر روزہ نماز میں اپنے

وقت کا بیشتر حصہ صرف کیا کرتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس سال روزہ کھا کر اگلے سال کے دغدغے میں پڑے رہتے ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

مرے اس لئے ہیں یہ سب آہ و نالے ۔۔۔ کہ یہ پھر بھی ہیں پارسال آنیوالے

مبارک ہیں وہ ہستیاں جو وقت کو ضایع ہونے نہیں دیتیں۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر ہمارے فوجی بھائیوں نے اس مرتبہ غیر معمولی وابستگی کا اظہار فرمایا ہے۔ فرسٹ رسکٹڈ اور پتھر ٹولا نسر میں جہاں کرنل قادر بیگ، کرنل عظمت اللہ، اور میجر عبد الصمد جیسے دل زندہ رکھنے والے خوش سلیقہ حضرات موجود ہوں اور جن کے ساتھ علیگڈھ کے کھلنڈروں کی کافی تعداد موجود ہو، وہاں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے مواعظ کامیاب ثابت ہوں تو ہمارے لئے تعجب کی کوئی گنجایش نہیں۔

کہتے ہیں کہ برادر عزیز مسٹر مرزا اسحاق بیگ پر حال ہی میں ڈگری ہوئی ؛ یا با لفاظ دیگر انکے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ خدا انھیں مبارک کرے۔ اس ولادت پر برادرم ڈاکٹر سید عبد الرحمٰن صاحب ہماری دلی مبارکباد قبول فرمائیں باپ کو مبارکباد خالی پیٹ نہیں دیتے۔

برادر عزیز مسٹر صدیق الزماں کا تبادلہ صوبہ اورنگ آباد سے صوبہ میدک کو ہونے کی اطلاع ہمارے پاس آئی ہے۔ ہمارے دل سے تو یہ پہلے بھی قریب تھے، اب جسم سے بھی قریب ہو گئے ہیں۔ اولڈ بوائے کے ضعیف میں مسٹر صدیق الزماں نے اتنا کام کیا ہے کہ اس موقعہ پر ہم اُن سے بھابی کے کبابوں کی فرمایش نہیں کر سکتے۔ البتہ خود انھیں کیلئے مسٹر احمد الدین سے فصل کی چیز کی فرمایش ہے، جس کا لطف وہ کنٹرہ ضلع اورنگ آباد سے عالم پور ضلع رائچور پہنچ کر اٹھار ہے ہونگے۔ یہ بھائی اگر عالم پور کا تحفہ کسی کو روانہ بھی کریں سکینڈ گورگیری جلد میں مسٹر علی حسین بلگرامی کی گرفت سے کوئی پارسل بچ نہیں سکتا۔ ہمارے ان بھائی کا تبادلہ وجاپور ضلع اورنگ آباد سے حیدرآباد کا ہو گیا۔

سر ہار کورٹ بٹلر کا نام ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ گھروں میں پہنچ چکا ہے مسلم یونیورسٹی کی بنا قائم کرنے کے زمانہ میں وہ وایسرائگل کونسل کے رکن اور ہماری اس تحریک کے ساتھ بڑی سرگرمی کا اظہار کرنیوالے لوگوں میں تھے۔ پھر صوبہ متحدہ کے گورنر کی حیثیت سے انھوں نے علیگڈھ کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار فرمایا

گورنری برما کی مدت ختم کر کے کمیٹی ریاستہائے ہند کے صدرنشین مقرر ہوئے اور اسی سلسلہ میں حیدرآباد آئے تو برادر مکرم نواب مسعود جنگ بہادر نے اُن سے انجمن ترقی اردو کی رفتار ترقی کا ذکر فرمایا۔ سر ہارکورٹ اردو کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، اسلئے اس زبان کیساتھ اپنے میلان طبع کے اظہار کی خاطر انھوں نے انجمن کو مبلغ پچاس روپیہ کا عطیہ نواب مسعود جنگ کے ذریعہ سرفراز فرمایا۔ دوسرے عطایا کے ساتھ یہ عطیہ اگر اپنے جائز مصرف میں آئے، تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔

کھانے کے باب میں ہمیں اپنے ان بھائیوں سے کامل اتفاق ہے جو بھوک کے وقت، کہیں ملے، اور کچھ ملے، ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ اس میں اپنے اور غیر میں تمیز بیکار ہے، مگر کھانا ہضم کرنے کیلئے تھوڑی ورزش ضروری ہے۔ اس تھوڑی سی تمہید سے ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے برادر محترم مولوی محمد یعقوب صاحب سے یہ دریافت کریں کہ انھوں نے نئی دلی میں کسی کے ساتھ کھانا کیوں کھایا، بلکہ ہم اُن کو اصول حفظان صحت کے مطابق یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ کھانا ہضم کرنے کی فکر سے غافل نہ رہیں۔ برادرم توم براہ کرم ہاضمہ کا چورن آدھے پیسہ کا ٹکٹ بھیج کر ہم سے منگا لیں، البتہ اولڈ بوائے کی خاطر دماغی ورزش کے لئے، خود اپنے کمرہ میں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے، تیار ہو جائیں، اور جناب نیازمند کی دماغ سوزی پر خود بھی تھوڑی سی خامہ فرسائی فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

تھیاصوفیکل سوسائٹی حیدرآباد میں مختلف اقوام و ملل کی خواتین کے سامنے، روزہ کی حالت میں مولانا شوکت علی صاحب نے، ایک لمبی چوڑی مگر اثر خیز تقریر کی، اور اس کو، افطار کے بعد، اپنے دوستوں میں دہرایا۔ مطالب بہت خوب تھے، اور ان میں شوکت علی کی زبان نے چٹخارہ پیدا کر دیا تھا۔ اسی سلسلہ میں فرمانے لگے کہ "میں عورت ہوتا تو اس ڈیل ڈول کے ساتھ مجھے کون قبول کرتا؟" اسپر دوستوں کی صف سے ایک فرشی قہقہہ پڑا، اور یہ سوال حل ہونیکی غرض سے زیر بحث آگیا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ شوکت علی، مسٹر شوکت علی، اور مولانا شوکت علی کے چاہنے والے ہمیشہ ہر حصہ ملک میں موجود پائے گئے ہیں۔ زبسکہ ایک طرف، خود اپنے ہی ملک میں گاما جیسا کوئی سورما لجاتا، اور اب تو ہمیں انکی شادیوں کیلئے بہت سے ہندوستانی خواہش مند پائے جاتے ہیں کیسی کیکر سنگھ کو بڑا کچھا لوگ امیدواری کے لئے کھڑا کر دیتے۔ اس سے قطع نظر کیجائے تو بھی مرد کی چٹکی ایسی ہے کہ ایک زبردست عورت کا

کا بھی تیا پانی کر دیتی ہے۔ ہمارے لکھنڈروں میں سے کوئی صاحب مولانا کے اس سوال کو حل فرماویں گے تو ہم مع اپنے ناظرین کے، اُن کا بہت بہت شکریہ ادا کریں گے، اور بنارس سے رس گلے منگا کر انکے نام پارسل کر دیں گے۔ شرط یہ ہے کہ مسٹر کوجی راؤ اور مس ملر کا نام درمیان میں نہ آئے، جن کی شادی ۱۰ مارچ کو بڑودا میں ہوئی ہے۔ یہ مس صاحبہ بغیر گائے کا گوبر اور پیشاب پئے ہوئے اشدہ ہو گئی ہیں۔

عہدہ داران مافوق کے لمبی رخصت لینے کے باعث، ہمارے بھائیوں میں سے مسٹر سید اصغر حسین کو سیشن ججی گونڈہ پر، مسٹر سید اعجاز علی کو ڈپٹی کمشنری سلطانپورہ پر، اور مسٹر خورشید احمد خاں کو ڈپٹی کمشنری پرتاب گڑھ پر ترقیاں ملی ہیں۔ خدا کرے یہ سب اپنی اپنی جگہہ مستقل ہو جائیں۔ ان بزرگواروں کو ضلعے ایسے ملے ہیں کہ ہم کوئی فرمایش بھی نہیں کر سکتے۔

برادران رضا نواز جنگ بہادر و سید علمدار حسین صاحب کا ہم سب کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ اوائل اردی بہشت ۱۳۳۱ف میں چوک اورنگ آباد کی دکانوں میں آگ لگنے کے موقعہ پر اپنی ذات سے اُس کے فرو کرنے میں حصّہ لیا۔

حال ہی میں مصالحت پر ایک مقدمہ کا تصفیہ حیدرآباد ہائیکورٹ میں ہوا ہے۔ گلبرگہ شریف کے معلمین و وکلاء کے درمیان نزاع لفظی پر، اسکی ابتداء گلبرگہ ہی کی عدالتوں سے ہوئی تھی، گروہوں کی خودداری اور ضد کے باعث مقدمہ کا تصفیہ ایک مدت کے بعد اب ہوا۔ مدعی و مدعا علیہ دونوں جماعتوں میں اولڈ بوائز موجود تھی، ان دونوں کے پیرو کار، وکلا میں بھی اولڈ بوائز شریک غالب تھے، اور رجوع کر لیتے تو اجلاس پر بھی ایک اولڈ بوائے، آنریبل ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر ہوتے۔ انکے بجائے آنریبل نواب ہاشم یار جنگ بہادر کے اجلاس پر مقدمہ چلتا رہا، اور وہیں ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنتہ بہادر کے ارشاد پر مصالحت ہوئی۔ ہم کو ہز اکسلنسی کی اس مال اندیشی اور خیر طلبی کا اعتراف ہے، اور خدا کا شکر کرتے ہیں کہ دونوں تعلیم یافتہ جماعتیں مقدمہ بازی کے مہلکہ سے بچ گئیں۔

مولوی احسان اللہ صاحب عباسی جو پایا کوئی گویل گورکھپور ہمارے اسکول کے ان فرزندوں میں تھے۔ جن کو ابتدا قیام کے وقت شرکت کی عزت نصیب ہوئی تھی، ہمارے ان بھائی نے ۲۷ مارچ

کو دنیا کے ایک بحرؔ ناپیدا کنار عالم کو چھوڑا۔ مرحوم ایک نامور وکیل، ایک باعمل عالم، اور ایک شہرۂ آفاق مصنف تھے، اور اپنی زندگی کی ابتدا سے آخر تک ان میں سے ہر ایک صنف میں وابستگی کے ساتھ کام کرتے رہتے ہم مرحوم کیلئے دعا مغفرت کرتے ہیں اور اُن کے پسماندوں کے ساتھ اپنی دردمندی کا اظہار!

برادر عزیز مسٹر سید محمد جواد (محبوب نگر) کی ترقی اور شادی کے سلسلہ میں انکے بہت سے عزیزوں اور دوستوں نے کھانے پینے کی باتیں کیں۔ مگر مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعمیرات ضلع محبوب نگر نے بھی گلپوشی کی رسم ادا کر کے اپنی برادرانہ محبت کا ثبوت دیا تھا۔ اس موقع پر مستقر ضلع کے تقریبًا تمام بھلے آدمی شرکت کرنے آئے تھے۔ جناب عیشؔ بھی ان مہمانوں میں تھے۔ میزبان کا سن پچاس کے لگ بھگ ہے، اور اس عمر میں خدا نے انکو بھی فرزند کی نعمت سے برومند فرمایا ہے۔ مہمانوں کی پذیرائی کرنے کی غرض سے سید علی اکبر صاحب گھر سے باہر تشریف لائے تو گود میں بچہ بھی تھا۔ جناب عیشؔ سے خاموش نہ رہا گیا، فورًا محفل کی ضیافت طبع

"Gentleman, too late!"

کے چست فقرے سے کروائی۔

نواب ارسطو یار جنگ بہادر کا نشتر ناحیدرآباد کیا، دور دور مشہور ہے۔ انگریز جراحوں نے بھی اس نشتر کا لوہا مان لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے تقریبًا پون درجن بچوں میں سے دو کو علیگڈھ کے حوالہ کیا تھا اور اب یہ سرکار آصفیہ کے صیغۂ زراعت و عدالت میں مفید عہدہ دار ثابت ہو رہے ہیں۔ برادرم مولوی منظور حسین صاحب ناظم زراعت، اور مولوی فدا حسین صاحب منصف کو اب بھی کبھی کبھی علیگڈھ کی یاد آجاتی ہے۔ آخر الذکر حال ہی میں سفر عتبات عالیات سے مع الخیر واپس تشریف لائے ہیں اور اپنی خدمت پر رجوع ہو چکے ہیں۔ اس قافلہ میں نواب صاحب موصوف بھی مع ایک کنبہ کے شریک سفر تھے۔ ہم اپنے بھائی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

برادرم مسٹر مسعود علی نے اپنے بچے اصغر مسعود کے عقیقہ میں باقرخانیوں کی تقسیم کی۔ دفتر اولڈ بوائے کو بھی ان سوغاتوں کا حصہ روانہ فرمایا تھا۔

Regd : No. M.2335

نشان اُپیہ سرکار آصفیہ

اولڈ بوائے

جلد ۲ — نمبر ۲

فہرستِ مضامین بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

علیگڈھ اولڈ بوائز کا ادبی، تاریخی، تعلیمی اور تفریحی ماہنامہ

[illegible] ناشر [illegible] سلطان پورہ حیدرآباد دکن سے [illegible]

ہندوستان

کا کوئی موقر مجلہ آپ کی نظر سے ایسا نہ گذرا ہوگا جس نے مولوی عظمت اللہ خان بی۔ اے (مرحوم) کی دلکش نظمیں شوق و تقاضے سے شایع نہ کی ہوں اور ان کو اردو شاعری کی نئی تراش خراش کے دلدادوں نے مقبولیت کی نگاہوں سے نہ دیکھا ہو۔ ممکن ہے کہ آپ نے بھی مرحوم کی نظمیں اور منظوم ترجمے دیکھے اور پسند کئے ہوں اسی لحاظ سے بصرف زر کثیر ان تمام نظموں کو یکجا کر کے نہایت اعلیٰ پیمانے پر اسکی طباعت کا انتظام کیا گیا ہے۔ مصنف مرحوم خود انکی طباعت کا ارادہ رکھتے تھے مگر وہ اپنی بیوقت موت سے مجبور رہے ان نظموں کے مجموعے کے لئے

سُریلے بول

انہیں کا مجوزہ نام ہے جس میں انوکھی اور غیر مانوس ہندی بحروں کو اردو شاعری میں اس خوبصورتی سے یکجان کیا گیا ہے کہ ہر اردو اور ہندی داں اس جدت پر بے اختیار "واہ" کہہ اٹھتا ہے۔ ہماری گذشتہ استدعا پر جن حضرات کی اب تک فرمایشات آچکی ہیں وہ محفوظ کر لی گئی ہیں۔ اس کی قیمت صرف دو روپیہ مقرر کیگئی ہے آپ بھی اپنی فرمایش پتہ ذیل پر محفوظ کرا دیجئے۔

منیجر اولڈ بوائے سُلطانپورہ حیدرآباد دکن

یہ امر بحث کا محتاج نہیں۔ کہ بچوں کے نشو و نما کیلئے کھانا سب سے ضروری عنصر ہے۔ لیکن کالج اور یونیورسٹی میں کھانے کے متعلق ہمیشہ شکایات رہی ہیں۔ اسمیں شک نہیں۔ کہ ایک ہی باورچیخانہ میں ہندوستان کے مختلف حصص اور بیرونجات کے رہنے والے طلباء کے حسب پسند کھانا نہیں پک سکتا۔ لیکن شکایات کھانے کے ذائقہ تک محدود نہیں، بلکہ بیان کیا جاتا ہے، کہ کھانا کافی نہیں ملتا۔ اور ناقص ہوتا ہے۔

یہ شکایات اسقدر عام ہو رہی ہیں۔ کہ اندیشہ ہے کہ طلباء کے والدین اور ولی اُن سے متاثر ہونگے، اور یونیورسٹی کو نقصان پہونچیگا۔

جناب والا کالج اور یونیورسٹی کے تواریخ کے ہر شعبہ اور مرحلہ سے واقف ہیں، اسلئے پرانے قصوں کے دہرانے کی ضرورت نہیں، صرف اسیقدر عرض کرنا کافی ہوگا۔ کہ ڈائننگ ہال کی اصلاح کیلئے وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن محض اسوجہہ سے کہ اصل مرض کا علاج خیال میں نہ آیا، وہ سب عبث ثابت ہوئیں۔

مخدومی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی ۵سالہ وائس چانسلری کے کام اور تجربہ کے متعلق جو نوٹ حال میں ممبران یونیورسٹی کورٹ کے لاحظہ کے لئے شایع فرمایا ہے، وہ یقیناً جناب والا کی نظر سے گذرا ہوگا۔ اسکے باب دوازدہم صفحہ ۸ پر ڈائننگ ہال کا تذکرہ ہے۔ موصوف نے قابل اعتراض امور درج کرکے اپنی ناکامی کی وجوہات بیان کئے ہیں۔

صورت موجودہ کا خاکہ میڈیکل افسر صاحب نے یونیورسٹی کی رپورٹ بابت سنہ ۲۶ء کے ضمیمہ

صفحہ ۲۵ پر ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

"ہاضمہ کے مریضوں کی تعداد کم کرنے کے ذرائع مجھ کو ابھی تک نہیں ملے، میں خاص طور سے توجہ دلاتا ہوں، کہ باورچیخانہ میں اصلاح کرنے کیلئے ہر قسم کی کوشش ہونی چاہیے، تاکہ کھانا خوش ذائقہ اور کھانے کے قابل ہو۔ اسطرح سے ہسپتال کے کام میں بہت تخفیف ہو سکتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ تندرست طلباء یونیورسٹی میں داخل ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد ادائے ہاضمہ اور پیچش وغیرہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں"

میڈیکل افسر صاحب کی رپورٹ بنام پروو وسٹ صفحہ ۳۴ پر درج ہے۔ اسکی ملاحظہ سے جناب والا پر روشن ہو جائیگا، کہ انھوں نے باورچیخانہ، کھانا پکانے کے طریقہ، اور کھانے پر سخت اعتراضات کئے ہیں۔

ڈائننگ ہال کے نقائص بدستور موجود ہیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ یہ محکمہ چند پختہ کاروں کے قبضہ میں ہے۔ جو ہر ایک اصلاح میں نہایت کامیابی سے روڑے اٹکاتے ہیں، اور بچوں کے شکایات کو ادھر اُدھر کی باتوں سے ٹال دیتے ہیں۔ جن اصحاب کو بچوں کے پیٹ کاٹ کر اپنی جیب بھرنے کا چسکا پڑ گیا ہے، ان سے اصلاح کی توقع عبث ہے۔ اس بارے میں اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے نومبر گذشتہ میں سکول کا کھانا علحدہ کیا۔ اور میری چند تجاویز پر عمل فرمایا۔ مجھ کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ یونیورسٹی اسٹاف اکونٹنٹ آفس اور باورچیوں نے ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کیں۔ ہوس ماسٹر صاحبان بھی امداد پر چنداں آمادہ نہ ہوئے۔ لیکن انتظام میں بچوں کا دخل زیادہ تھا اسلئے کھانے میں رفتہ رفتہ اصلاح ہو گئی۔

علی گڈھ میں اور دیگر مقامات پر جب میں طلباء سے ملتا ہوں تو یونیورسٹی کے حالات دریافت کرتا رہتا ہوں۔ ڈائننگ ہال کی بابت مجھے معلوم ہوا ہے کہ :

(۱) عملہ کو ٹھیکہ دار مختلف طریقوں سے خوش رکھتا ہے۔ اسوجہ سے ناقص جنس قبول کر لیجاتی ہے۔

(۲) کھانے کیلئے پوری جنس نہیں دیجاتی۔

(۳) نگرانی کرنے والوں کو باورچیخانہ کا عملہ خوش رکھتا ہے۔ اسواسطے بازپرس نہیں ہوتی۔

(۴) کھانے کی تیاری کے وقت باورچی مختلف طریقوں سے گھی اور کھانا غائب کر لیتے ہیں۔

(۵) اساتذہ کے مقبول طلباء عموماً مانیٹر مقرر کئے جاتے ہیں۔ جن کو باورچیخانہ کے منتظم اچھا اور

انواع و اقسام کے کھانے دے کر خوش رکھتی ہیں اسلئے بچوں کی شکائت افسرانِ مجاز تک نہیں پہنچ سکتیں اور اگر پہنچ بھی جاتی ہیں تو شنوائی نہیں ہوتی۔

میری رائے ناقص میں ڈائننگ ہال کی اصلاح اُسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کا انتظام کم و بیش فوجی طریقہ پر کیا جاوے۔ یعنے جنس یک جا ایک کمیٹی کی نگرانی میں خریدی جاوے۔ اور یونیورسٹی میں متعدد (Mess) بنائے جاویں جن کو راشن تقسیم کیا جاوے اور کھانا کھانے والوں کی نگرانی میں تیار ہو۔

جنس خریدنے والی کمیٹی کے صدر ایک ممبر کورٹ ہوں مثلاً کرمی خواجی محمد صالح خاں صاحب جن کی دیانت ہمدردی اور تجربہ مسلمہ ہے۔ اس کمیٹی کے تین ممبر ہوں۔ ایک طلباء یونیورسٹی کا نامزد کردہ دوسرا طلباء انٹرمیڈیٹ کالج کا اور تیسرا طلباء سکول کا۔ ہر مہینے کے بعد یہ طلباء بدل دیے جائیں۔ ہر ایک بورڈنگ ہوس کا باورچیخانہ علیحدہ ہو جسکی عمارت اور سامان اصول حفظان صحت کے مطابق ہو۔ ہر ایک باورچیخانہ میں روزمرہ تین طلباء نگرانی کریں۔ پہلے کا فرض ہوگا کہ طلباء کی تعداد کے مطابق جنس وصول کرے اور اطمینان کرے کہ جنس نمونہ کے مطابق اور عمدہ ہے۔ دوسرا کھانا پکنے کے وقت اور تیسرا کھانا اتارتے وقت موجود ہے۔

ان طلباء کے تقرر کا مدار اساتذہ کی مہربانی اور پرورش پر نہ ہو بلکہ ہر ایک طالبعلم باری باری اس فرض کو انجام دے۔ یہ چنداں مشکل نہیں اگر ایک بورڈنگ ہوس میں ایک سو طلباء رہیں۔ تو ہر ایک طالب علم مہینے میں ایک دن نگرانی کا ذمہ دار ہوگا۔ اس طریقہ سے کسی طالب علم کو جرأت نہ ہوگی کہ عملۂ ڈائننگ ہال سے مل کر بچوں کا پیٹ کاٹے کیونکہ باقی طالب علم اس کو فوراً اسید ہا کر سکتے ہیں۔ اساتذہ کے نامزد طلباء کو اطمینان ہوتا ہے کہ ان کا آسانی سے کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ جب انتظام خود کھانے والوں کا ہوگا۔ تو بہت سی شکایات رفع ہو جاویں گی۔ علاوہ ازیں بچوں میں کھانے کا اہتمام کرنے کا مادہ پیدا ہوگا۔

یونیورسٹی کے موجودہ فضا کے لحاظ سے میں اس امر کا سخت مخالف ہوں کہ کھانے کا انتظام اساتذہ کے یا اُن نامزد طلباء کے ہاتھ میں ہو۔ دنیا کی آجکل کے روشنی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ رعایا یا بالفاظ دیگر طلباء کے نامزد کردہ طالب علموں کے ہاتھ میں یہ کام ہو۔ اس وقت ڈائننگ ہال کی کیفیت ایک مطلق العنان بادشاہی کی ہے جس میں رعایا کی شنوائی نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ ڈائننگ ہال کی اصلاح میں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہو۔ پرانے ماہرینِ فن طرح طرح کے رکاوٹیں پیدا کریں گے، اور علحدگی کی دھمکیاں دیں گے لیکن مجھے یقین ہو کہ حوصلہ اور استقلال سے جناب والا ان سب مشکلات پر قابو پا سکیں گے۔ ممکن ہے کہ نئے انتظام سے خرچ کچھ بڑھجائے لیکن موجودہ فیس پر بچوں کا پیٹ بھرنے سے یہ بدرجہا بہتر ہے، کہ ان سے ایک روپیہ ماہوار زیادہ لیکر پیٹ بھر اچھا کھانا دیا جاوے۔

ایک طرف یونیورسٹی کی شہرت اور قوم کے بچوں کی نشو و نما ہے اور دوسری طرف چند خود غرض ہستیاں، جن سے بہتر آدمی آسانی سے مل سکتے ہیں تاریخ اس امر کے شاہد ہے کہ ایک دو یا دس بیس آدمیوں کے علحدگی سے دنیا کے کاروبار کبھی نہیں رکے۔

اس کار خیر میں قوم کے ہمدردی اور بچوں اور انکے والدین کی دعائیں آپکے ساتھ ہونگی! اور آپ کی سعی باعث خوشنودی ہوگی اس پاک بے نیاز کی جس نے یہ بارِ امانت آپکے کندھوں پر رکھا ہے۔

"نیازمند"

کلکتہ۔ پہلی اپریل (فولز ڈے) ۲۰ء ۔ سہ پہر۔

بجتیا میک (کارڈ) کاش (شکریہ) میری حالت میں فرق ہے۔ گر ابتک نہ مرض گیا ہے اور نہ لکھنے پڑھنے کا حکم ملا ہے۔ یہ دو سطریں اس طرح چوری سے لکھ رہا ہوں جسطرح کبھی چھوکریوں کو پرزہ اڑایا جاتا تھا!

اولڈ بوائے کا تازہ نمبر دیکھ کر پھڑک گیا۔ تم کمبخت اب بہت خوب لکھنے لگے۔ جورو آکو سلام اور بچوں کو دعا کہدو۔ چاچا اور چاچی۔ امیر نواب کا گڈ آفٹرنون قبول کریں۔

'ن'

کلامِ ضامن

به کور دل همه گر طور توتیا بخشند — سواد چشم شعورش که از کجا بخشند
نصیب زاغ و زغن باد طعمهٔ مردار — بس است اینکه به ما قسمت هما بخشند
نشان منزل مقصود شان مجوی از موج — زمام اختیار خدائی به ناخدا بخشند
نثار رحمتِ آنانکه ناشنیده سوال — نظر به حال گدا کرده مدعا بخشند
سواد دیدهٔ دل گر نصیب شیخ شود — هر آنچه وعده به فرداست حالیا بخشند
مگو که دشمن جانست ادای معشوقان — فراغ از غم هستی به یک ادا بخشند
ق
نخواهد اینکه کرامت کنند منطق طیر — زبان حیرت و آهنگ بی صدا بخشند
سزاست تخت صبا شوکت سلیمان را — مرا رسد ار سبک جانئی صبا بخشند
بیاد تن برضا ده که هیچ نتوان گفت — که مالکان قضا و قدر چها بخشند
نه دیده که به اعمیٰ دهند سرمهٔ طور — به چشم دیده وران زود و دل عمیٰ بخشند
ز نوک خار به پهلوی گل شگاف زنند — به آب و رنگ دل سنگ را ضیا بخشند
چه حیله ها که به صیاد سفله آموزند — به عندلیب نوا گر اگر نوا بخشند
کریم را الف خاکی به جیب اندازند — لئیم را خبر از راز کیمیا بخشند
به لخت دل صلحا را کنند روزه گشا — ز مرغ و بره به اشرار ناشتا بخشند
عنید و دوش گرانبار خلعتِ زرتار — شهید را کفن از خاک کربلا بخشند

مجال دم زدن اینجا نباشد ای ضامن
به لطف هرچه ببخشند بیش بجا بخشند

ضامن کنتوری

گوالیاری کھلنڈرا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

ڈیر منظر۔ السّلام علیکم۔ جنوری کا پرچہ آج ۱۰ مارچ کو پہنچ گیا۔

رسالہ میں بھائی سلطان حیدر جوش کی چند سطریں سیلانی میاں کی یاد آیّام ہمارا کالج، اولڈ بوائز کے حالات پڑھکر ایک گونہ خوشی ہوئی۔ بھیّا منظر میں نے پیارے کالج کے بورڈنگ میں (۲۲) برس گزارے اور دل چاہتا ہے کہ کچھ حالات لکھدیا کروں مگر گوالیار کی گرمی الامان الحفیظ۔ یہ گرمی وہ گرمی ہے کہ جس نے میرے چند حیدرآباد کے دوستوں کو باوجود انکے وعدوں کے گوالیار اسٹیشن پر اُترنے سے روک دیا اور صرف کھڑکی گراکر گوالیار اسٹیشن کی شکل دیکھی ہی تھی کہ معلوم ہوا کہ دوزخ کا منہ کھول دیا گیا ہے۔ سنا ہے کہ فوراً کھڑکی کا دروازہ بند کردیا گیا اور گوالیار پر یا اپنے دوست انصاری پر (ڈاکٹر انصاری پر نہیں) لعنت ملامت کرتے ہوئے اور ڈاک گاڑی کے پنکھوں کی گرم گرم ہوا کھاتے ہوئے روانہ ہوگئے۔ بھیّا منظر سنا ہے کہ اسوقت آپ بھی موجود تھے۔ اب آپ انصاف کیجیے کہ کون شریف آدمی ایسی گرمی میں مضمون نگاری کرسکتا ہے۔ یہاں مارچ سے اکتوبر تک گرمی کی یہی حالت رہتی ہے۔ رہے سردی کے چار مہینے وہ ایسے کھیل کود کے انتظامات میں صرف ہوجاتے ہیں کہ نہ اپنی خبر رہتی ہے نہ دوسرے کی۔

خدا کے فضل سے اولڈ بوائز کی تعداد اسوقت بڑی زبردست ہے اگر دوسرے تیسرے مہینہ بھی ایک آدھ اپنے پرانے زمانہ کے حالات لکھدیا کریں تو بھی غنیمت ہے۔

مجھے سخت تعجب ہے کہ برادران بھوپال کیوں خاموش ہو رہے ہیں۔ اپنے پیارے بھائی سید محمد خاں سے سخت شکایت ہے کہ جب سے حیدرآباد سے اولڈبوائے نکلنا شروع ہوا ہے انکا چٹکیلا مضمون ایک بھی نہیں نکلا۔ میں خاص طور سے حسب ذیل احباب کی طرف ایک توجہ دلاتا ہوں کہ ان سے اپیل کی جاوے کہ وہ اپنے رام کہانیاں اولڈبوائے کو سنادیں تاکہ اسکی طرف دلچسپی بڑھے۔

سید محمد خاں، حسن محمد حیات صاحب، اُستاد وزیر صاحب، قاری سرفراز حسین صاحب، بھونڈو، اسلم، ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب، خان بہادر عبدالحمید خاں ڈپٹی کلکٹر جھوپا، آفتاب عمر صاحب پیش، فاروق صاحب علی گڈھ، حافظ بشیر صاحب ڈپٹی کلکٹر، محبوب عالم صاحب ڈپٹی کلکٹر، انور علی صاحب ڈپٹی کلکٹر، علی رضا صاحب بلگرامی، عزیز اللہ صاحب گلاب جامن، عبدالوہاب صاحب انجیری دہلوی، سید باسط علی صاحب، میر اقبال علی صاحب میسوری، قاضی تلمذ حسین صاحب، محسن علی صاحب کلکتہ، احمد کمال خاں صاحب فتحپوری، نذیر الاسلام صاحب، کہاں تک نام لکھوں آپ اپیل کیجئے شاید یہ صاحبان رام ہو جاویں۔

ایک میری تجویز آپ کیلئے یہ ہے کہ ہر ماہ کے اولڈبوائے میں اخیر میں اُن تمام اولڈبوائز کے نام مع پتہ کے شایع کر دیا کیجئے کہ جو اولڈبوائے کو خرید رہے ہیں۔ اسیطرح جو ایک دو نام زیادہ ہوتے جاویں شایع کرتے رہئے تاکہ اس سے کم از کم پرانے دوستوں کے نام ہی پڑھ کر طبیعت خوش ہو جایا کریگی، کہ کون کون زندہ ہے کہاں ہے کیا کر رہا ہے۔

خدا کے فضل سے حیدرآباد میں اس وقت سب سے زیادہ اولڈبوائز ہیں اور قابل ہیں کیا وہاں اتنے شاعر نہیں کہ کبھی کبھی کوئی مشاعرہ ہو جایا کرے اور انکی غزلیں اولڈبوائے میں شایع ہو جایا کریں

اپنے پیارے کالج کے موجودہ کپتانوں اور یونین وغیرہ کے افسروں سے اپیل کیجئے کہ وہ اپنے مختصر حالات تحریر فرمادیا کریں تاکہ ان کو پڑھ کر ایک گونہ خوشی ہوا کرے۔

یہ کوشش ہونی چاہیے کہ چاروں طرف کے اولڈبوائز کے حالات شایع ہوا کریں ورنہ اولڈبوائے صرف حیدرآبادی اولڈبوائے ہو جاویگا۔

ایک خدمت جو آپ انجام دے سکتے ہیں اس کو بھی اپنے ذمہ لیجئے جن اولڈبوائز کو خداوند عالم نے اس

اس قابل کیا ہے کہ وہ دوست بھائیوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں ان سے اولڈ بوائے پوئنٹ چھپوایا کیجیے تاکہ اکثر بھائی آپ کے ذریعہ سے کسی کام پر لگ جائیں۔ اور ان کو اچھے کام کرنے والے اپنے بھائی مل جائیں۔ (ضرور۔ اولڈ بوائے)

اولڈ بوائے کے ذریعہ سے شادیاں کرائیے اسکی تدابیر آپ خود سوچ سکتے ہیں۔

بہت سے اولڈ بوائز ولایت آتے جاتے رہتے ہیں انکے مختصر حالات تحریر کیجیے تاکہ دوسروں کو کم از کم ناول کا ہی مزہ آجاوے۔

آپ کے اکثر اولڈ بوائز حج شریف کو بھی جاتے رہتے ہیں اُن سے عرض کرکے وہاں کے حالات درج کیجیے تاکہ آئندہ جانے والوں کو اُن سے فائدہ حاصل ہو اور معلومات بڑھیں۔

روشنائی بوجہہ گرمی کے سوکھ گئی ہے اسوجہہ سے پنسل سے کام لیا ہے۔ اردو میں بالکل بھول گیا ہوں کیونکہ یہاں مرہٹی اور ہندی سے سابقہ پڑتا ہے اسوجہہ آپ مہربانی فرماکر اس مضمون کو بھی درست کر لیجیئے گا۔ میں نے صرف خیالات ظاہر کیئے ہیں۔

ہاکی ٹیم ہندوستان سے منتخب ہو کر ولایت گئی ہے اس میں ہمارا ایک اولڈ بوائے فیروز (لاہوری) بھی گیا ہے مگر علی گڈھ میں انھوں نے اس کھیل کو نہیں سیکھا ہے اسوجہہ سے علی گڈھ کو کوئی فخر نہیں ہو سکتا۔ فخر اس وقت تھا کہ کم از کم نصف درجن علی گڈھ کے ہوتے۔ اس سے یہ ضرور ثابت ہے کہ ہمارے علی گڈھ کے گیمس فی الحال زوال میں ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں جہاں طلبہ ہوں۔ وہاں سے نصف درجن ہاکی کھیلنے والے ایسے نکلیں کہ ہندوستان کی منتخب ٹیم میں شریک ہو سکیں۔ سوئے افسوس اور کیا ہے۔

اولمپک گیمس کی بھی ایک ٹیم ولایت جانیوالی ہے اس میں ایک بھی ہمارا نام لیوا نہیں ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب علی گڈھ میں اسپورٹس ہوا کرتے تھے اور رُڑکی والہ آباد و لکھنؤ سے مقابلہ کیلئے آیا کرتے تھے تو مجھے خوب یاد ہے کہ ہر اسپورٹس میں ہمارے بھائی نمبر لیجایا کرتے تھے۔ گر پول جمپ میں ہمیشہ ہارا کرتے تھے۔ عبد المجید خاں فٹ بال کپتان، اشرف خاں، علی رضا بلگرامی، محمد حیدر آبادی، صمد حیدر آبادی اس بات کے شاہد ہیں۔ اخیر میں میرے عزیز دوست ممتاز علی خاں کا جواب بھوپال میں ہیں ملنا

اچھا رہا۔ بیسٹ آل راؤنڈ اتھلیٹ تھے۔ مسٹر محمد محسن حیدرآبادی بھی میرے زمانہ علی گڈھ میں اچھے اتھلیٹ رہے۔ معلوم نہیں یہ سب اب کیا کر رہے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں سب سے پہلے اولمپک گیمس (آل انڈیا) دہلی میں ہوئے، جہاں میں بھی جج کی حیثیت سے موجود تھا، اور امید کر رہا تھا کہ ضرور کوئی اتھلیٹ علی گڈھ سے آیا ہوگا۔ مگر میری امید پوری نہ ہوئی۔ ایک بھی اتھلیٹ موجود نہ تھا۔ قریب چھ اتھلیٹ منتخب کر کے فرانس روانہ کر دیے گئے تھے۔ پچھلے سال پھر کلکتہ میں ایسا ہی مقابلہ ہوا۔ وہاں بھی کوئی اپنا اتھلیٹ موجود نہ تھا۔ اب فروری ۱۹۲۸ء لاہور میں پھر ایمسٹرڈم بھیجنے کیلئے کچھ آدمی چھانٹے گئے، مگر افسوس ہے کہ وہاں بھی کوئی علیگ موجود نہ تھا۔ حضرات آپ اسطرف بھی توجہ کیجیے۔ اسوقت حیدرآباد ہمارا دوسرا علی گڈھ ہو رہا ہے۔ ہر محکمہ میں علیگ کھلاڑی افسروں کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ان کی توجہ اسیطرف مبذول کیجیے کہ آخر یہ زوال اسپورٹس کیجانب کیوں ہے۔ ہندوستان سے ہاکی اور اسپورٹس کی ٹیمیں ولایت جائیں، اُس میں علی گڈھ، حیدرآباد، بھوپال سے ایک بھی شریک نہو سکے۔ علی گڈھ نے اتنا نام محض کھیلوں کی بدولت حاصل کیا تھا۔ آج وہ زمانہ ہے کہ اسکا نام لیوا ایسے بڑے بڑے مقابلوں میں ایک بھی نہیں ہے۔ میں اپنے دوست محمود حسن خاں (علیگ) کی توجہ اسطرف خاص طور پر دلاتا ہوں کیونکہ وہ اپنے زمانہ علی گڈھ میں ہائی جمپ و ریس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک محمد عثمان حیدرآباد کے بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ اب چونکہ ہر تیسرے چوتھے برس اتھلیٹ ولایت بھیجے جایا کریں گے، اسوجہ سے میں حیدرآباد کے (علیگ) افسران سے جو فوجوں میں ہیں یا مدرسوں و کالجوں میں ہیں ملتجی ہوں کہ برائے خدا اسکی طرف توجہ کریں اور دوسروں سے اس مقابلہ میں پیچھے نہ رہیں۔ میں چونکہ آل انڈیا اولمپک کمیٹی کا ممبر ہوں اسلئے اگر کسی مشورہ یا مدد کی ضرورت کسی اتھلیٹ بھائی کو ہو تو مجھے خوشی سے اطلاع دیں۔ اتنی زبردست ریاست حیدرآباد اتنے کالج و اسکول! تعجب ہے کہ وہاں اسپورٹس کا زور نہو۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان کی توجہ اسطرف دلائیے، اور ہر فوجوں کے افسروں کو لکھیے۔ آیندہ ایسے آل انڈیا مقابلہ میں اگر علی گڈھ نہیں تو حیدرآباد حیدرآباد تو پکارا جاوے اور اتھلیٹ کی حیثیت میں ولایت کی سیر ہو اور ہم سب کا نام ہو اور حیدرآباد کا ڈنکہ بجے۔

ناظر حسن انصاری (از گوالیار)

بھائی ناظر کی تکلیف فرمائی کے ہم ممنون ہیں، اسیطرح دوسرے حضرات بھی توجہ فرمائیں تو ہم شکرگزار ہوں گے۔ خود ہماری حالت یہ ہے کہ رسالہ کے ہر صیغہ میں ہمیں ہر طرح کا کام کرنا پڑتا ہے، اس لئے اپنے بھائیوں سے امداد کا متوقع ہونا ہمارے لئے ضروری ہے اطلاعات کی احتیاج ہمیں بطور خاص ہے۔ ہمارے وہ بھائی فرشتہ ہیں جن پر کوئی واقعہ نہیں گزرتا ہم مختصر سے مختصر اطلاع کے شایع کرنیکے لئے بھی تیار ہیں۔۔۔۔

اولڈبوائے

مہذب شاعری

شوق کالر کا ہوا خبط ہے نکٹائی کا
پڑگیا آپ پہ سایہ کسی عیسائی کا

تانگہ کرلائے یہیہ ہے قرض تنائی کا
ریل چھٹ جائے یہ ہے کام خود آرائی کا

رنگ دنیا سے الگ ہے ترے سودائی کا
کھاتا پھرتا ہے مزا کھیر میں بالائی کا

خط تھا چندے کیلئے وصل کی کب خواہش تھی
کیوں پہاڑ آپ بناتے ہیں بھلا رائی کا

سرد مہری سے تری جاتی رہی سب تجزیر
خوب ہاتھ آیا یہ نسخہ مجھے ٹھنڈائی کا

مختلف فرقے ہیں عشاق کے تیرے اے شوخ
کوئی کشتہ ہے بدھائی کا کوئی سائی کا

بھاگ کر بچ نہیں سکتا وہ مرے پنجہ سے
شکر صد شکر ہوا اسکو مرض پائی کا

شیخ جی پہونچے جو جنت میں تو خاطر یہ ہوئی
روٹی بیسن کی تھی اور ساگ تھا چولائی کا

اسکے بھائی کو ٹرانکی سفارش کردے
آرزو پوری کرے لال کوئی مائی کا

توبہ توبہ کوئی کاٹک نہیں خالی جاتا
کام ہر سال ہے اس شوخ کو اکتائی کا

بڑھ گئے ناخن و موتن یہ لنگوٹی نہ رہی
یہی حاصل ہے مری بادیہ پیمائی کا

کہتے تھے صبح شب وصل۔ بدن دکھتا ہے
جسطرح ہی آتا ہے جھونکا کوئی پروائی کا

بل ادا کرنے میں حیلہ جو کیا کچھ خفاش
دور تک جائیگا غوغا تری رسوائی کا

خفاش کرمانی

ہمارا بینٹ

ہم کو اس سے بڑی محبت ہے کیونکہ صرف یہی ہمارے پاس رہ گیا ہے، ورنہ چھری، کٹار، خنجر، شمشیر، تیر، کمان سب کے سب ہم سے چھین لئے جا چکے ہیں۔ کسی کو معشوق کی ابرو بنا دیا گیا، کسی کو پلک اور کسی کو کمر، غرضکہ معشوق کیا ہے، مجسم اسلحہ خانہ ہے۔ اب ان شاعروں سے لڑے کون۔ لڑے تو اس سے جو سامنے آئے۔ انکے خیال کی پرواز کا تو یہ عالم ہے کہ ہوائی جہاز بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہذا مجبور ہو کر ہتھیار ڈالدینے پڑے اور پھر یہ طے کیا، کہ کوئی ایسا آلۂ ضرب ایجاد کیا جائے، جو انکے تخیل ہی میں نہ آسکے۔ بڑے غور و فکر کے بعد، یہ "بینٹ" وجود میں آیا، اور بیچارے کو ہر پہلو سے ان خیالی ڈاکوؤں سے بچانے کی کوشش عمل میں لائی گئی پہلی بات تو یہ ہے کہ اسکی شکل ایسی بنائی گئی ہے کہ اس کو معشوق کے کسی عضو سے تشبیہہ دی ہی نہیں جا سکتی۔ کیسا بھون کیا پلک کہیں کھپتا ہی نہیں۔ اب رہی اسکی "کاٹ" تو اسمیں بھی اس امر کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کہیں سے بھی آڑا پن نمایاں نہ ہو، ورنہ یہ ظالم اچک ہی لے جائیں گے۔ چنانچہ اس ڈر کے مارے لفظ کاٹ، تک کو اڑا دیا گیا، اور اسکے بجائے، ایک نہایت سادہ لفظ "بھونک دینا" سے خانہ پری کی گئی، جسکی مدد سے یہ بیچارہ اپنے اس سادگی کے پردہ میں اغیار کی نگاہوں سے بچکر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اتنی قلعہ بندیوں کے بعد اس کی جان بچ سکی، ورنہ اس غریب کو بھی اس خیالی اسلحہ خانہ میں پہونچکر، تمام دنیا میں ہرجائی کیطرح مارا مارا پھرنا پڑتا اب وہ ہمارے پاس محفوظ ہے، مگر کسے معلوم کہ کب ان خدائی فوجداروں کی نگاہ اس پر پڑ جائے، اور اس کو بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اڑا لیجائیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس کو بھی مذہبی رجسٹری خانہ میں رجسٹرڈ کر کے سکھوں کی کرپان اور گورکھوں کی کگڑی کی طرح، لباس قدسیت میں ملبوس کر دیتے، اسوقت بیشک یہ مجال نہ تھی کہ یہ

رہزا اسکی طرف نگاہ بھر کے دیکھ سکتے۔ خیر سُر ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" ابھی تک تو وہ ہمارا ہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں، کہ سینکڑوں خنجر اسکے سیدھی پن ہی کو دیکھ کے منہ کی کھاتے ہیں، اور اپنی گردنیں اُسکے سامنے جھکا دیتے ہیں۔ اسکی چمک پر ہزاروں شمشیریں اور کٹاریں نثار ہوتی رہتی ہیں اور اس کی جھنکار پر لاکھوں بینڈ قربان۔ سب سے بڑی خوبی اسمیں یہ ہے کہ یہ ظالم نہیں جو اپنے زخمیوں کو دوسروں کے مانند تڑپا پا کرے بلکہ اسکا زخمی میٹھی اور دائمی نیند سوتا ہے۔

خواجہ علاء الدین (از بھوپال)

غزل

ہم ازل ہی سے پریشان چلے آتے ہیں / اسطرح بے سروسامان چلے آتے ہیں
دل کی آغوش میں پیکان چلے آتے ہیں / آج مہمان پہ مہمان چلے آتے ہیں
شیخ فردوس میں جانے کیلئے مرتا ہے / ہم وہیں سے تو پشیمان چلے آتے ہیں
شمع سے خوب لگائے ہوئے لو پروانے / جلتے ہیں، ہوتے ہیں قربان، چلے آتے ہیں
اپنی محفل میں جو آتے ہوئے دیکھا مجھکو / کہتے ہیں "جان نہ پہچان" چلے آتے ہیں
رہ کے جنت میں بھی کچھ پر و ترے جناب واعظ / جو سمجھدار ہیں انسان، چلے آتے ہیں

بات کیا ہے، کہ سوئے گورِ غریباں اصغر
وہ بہت ہو کے پریشان چلے آتے ہیں

حضرات! کوئی دلچسپ مضمون عنایت ہو .... اولڈ بوائے

لاہور سے

بھائی منظر علی صاحب۔ السلام علیکم۔

اولڈ بوائے تو غالباً اکتوبر سے نکل رہا ہے مگر مجھ بدنصیب کو کل معلوم ہوا کہ اللہ نے اس کو تیسری بار آپکے وزیعہ سے زندگی بخشی۔ مبارک ہو۔

میں مضمون نگار نہیں اور نہ فسانہ ساز۔ آپ کے اور اپنے علی گڑھ کا خالص کھلنڈرا ہوں اور بس۔ مجھ سے مضمون کی توقع عبث ہے طبیعت اس قسم کی خشک کاموں کیطرف مائل ہی نہیں ہوتی جسکا ثبوت میری عرضداشت سے بہم پہنچ جائے گا۔ اولڈ بوائے کے چار پرچے اپنے میزبان بھائی آغا محمد صفدر صاحب سیالکوٹی کی کوٹھی پر ملے۔ بخار اتر رہا تھا انھوں نے خوشخبری سُنا کر چاروں پرچے میرے پاس رکھدیئے۔ اس تھوڑی سی تکلیف کو بھول گیا اور پرچوں کی صفحہ گردانی میں ایسا مشغول ہوا کہ شب کے گیارہ بجے نیند کے جھونکوں نے محسوس کرایا کہ رات زیادہ گذر گئی ہے اب سو رہو۔ اسں تیہ اچھی نہیں ہے جنم لیا ہے۔ اور توقع ہے کہ اولڈ بوائے کو عمر ابدی ملیگی۔

ہزاروں بڈھے لڑکے وہاں موجود ہیں اور اگر دوسرے صوبوں کے بھائی اپنا فرض فراموش بھی کر دیں تو کھاتا گوشت کھانے والے بھائی پرچہ کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ جو خدمت مجھ سے ہوگی اسکے لئے حاضر ہوں۔

آجکل اپنے کام کے سلسلے میں پنجاب کا سفر کر رہا ہوں۔ ہر جگہہ اولڈ بوائز سے ملاقات ہوتی رہتی ہے، پرچہ کی اشاعت بڑھانے میں پوری کوشش کروں گا مگر اس شرط پر کہ اولڈ بوائے کو ایک ادبی رسالہ نہ بنایئے۔ یہ تو علی گڑھ کے پیارے کھلنڈروں کا رسالہ ہے اور اسکی واحد غرض یہی ہونا چاہیے کہ ایک بھائی کا حال

دوسرے کو معلوم ہوتا رہے اور اسکے ساتھ ہی ہماری پرانی روایات اب علیگڈھ سے کیا کہوں، غائب
ہوتی جاتی ہیں۔ اگر اب موجودہ طلباء کو تناسُوا الاولیٰ علی گڈھ میں رہنا ہے تو وہ اولڈ بوائے کو پڑھکر
سیکھیں مگر ان کو مرنے نہ دے۔ اس لمبی چوڑی تمہید کے بعد آپ سے بسر مطلب کا گنہگار ہوتا ہوں مثلاً
خواب پریشاں یا اس قسم کی سرخی کے جو صحیح یاد نہیں آتی ایک مضمون ہمارے ایک بڑے بھائی کا ہے
برادر معظم عنایت اللہ صاحب معاف فرمائیں یہ آثار قدیمہ سے گڑے مردے اکھیڑکر ہم لوگوں کے ساتھ
کیوں ایسا خشک مذاق کرتے ہیں اقلیدس صاحب سے تو برسوں تعارف رہا مگر اس وقت بھی میں انکا مداح نہ تھا
ساتھیوں سے شمیدسس کا نام بھی سنا اگر یہ ماوالبحر کی قسم کے بخار یا بخار اور کسی کا مینڈھا اور ادعوسہ کا
بندرگاہ یا سندربال کی زبان معلوم ہوتی ہے اور قصہ بھی غالباً اسی زمانہ کا ہے جبکہ ادقیانوس بوقیانوس
وغیرہ سے دلچسپی لینے والے لوگ قرول باغ دہلی کے طبیہ کالج کے اولڈ بوائز ہو گئے نہ کہ علیگڈھ کے
کھلنڈرے۔ میں غالب مرحوم کا بہت مداح ہوں اور اگر اس میں کوئی کمی تھی تو بجنوری مرحوم مغفور کی شاگردی
نے پوری کردی تھی اور انکی بہت سی غزلیں ازبر یاد ہیں اور میں انکے بہت سے اشعار بلا سمجھے پڑھ جایا کرتا
تھا اور ہوں مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ آپسے (Protest) نہ کروں اگر غالب مرحوم کو اپنے
کلام کیلئے ہمارے پرچہ میں جگہہ دلوانا منظور تھی تو چند روز اور جئے ہوتے تاکہ علی گڈھ میں پروفیسر ہو کر
اسکے حقدار ہو جاتے (یہ علیگڈھ کے پڑھے ہوئے بڑے بھائی صاحب کے بستہ میں کیسے گھس گئے کہ انہیں کھلنڈروں
کی گوں کا مضمون دینا یاد نہ رہا) آپ سوال کرینگے دو پرچہ کے صفحات کیونکر سیاہ کئے جائیں۔ تو میں یہی
عرض کرونگا کہ کھلنڈروں کیطرف رجوع کیجیے مثلاً خوب لکھ سکتے ہیں اور جوتوں کے نعل کے ساتھ ممتاز کی
فیرنی سوہن لعل کے بتیلے۔ انکے شش کا شیو اور ہر شیو کے ساتھ اپنے پنشن کا ذکر میر صاحب کا تیل بلا چمیلی
ایک خاص سُرون میں ادا کرنا یہ واقعات ہیں کہ لکھیں۔ جوش صاحب کا عذر قابل سماعت ہے کیونکہ ہوم رول
کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ ہے مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ مہینہ میں ایک مرتبہ انکو اتنا وقت نہیں مل سکتا کہ وہ ادبیت
کو چھوڑ کر ایک واقعہ نگار کی حیثیت سے نہ لکھ سکیں۔ سلطان حیدر صاحب کے ذکر کے ساتھ شفقت صاحب
کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ بھائی اسکو دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ہمارے دونوں بھائی ایک وقت میں مراد آباد

ٹریننگ میں ڈپٹی بنائے جارہے تھے۔ جوش صاحب کے صاحبزادے صاحب بھی موجود تھے شفقت صاحب نے اپنے بھتیجے کو بلاکر پوچھا کہ میاں بتاؤ۔ ماموں کی فارسی کیا ہے۔ بچہ نے حسب لیاقت جو کچھ بھی بتایا ہو، مگر شفقت صاحب نے فوراً اسکی صحت کے بعد کہا کہ ماموں کی فارسی ہے "عرق نانا"۔ کہئے کیا رائے ہے۔ ایک اور لطیفہ سنایا تھا وہ یاد نہیں رہا۔ اس کو شفقت صاحب سے دریافت کیجئے۔ شفقت صاحب بھونڈو۔ حیات صاحب سعید پسر مولوی مسعود علی صاحب جواب ماشاءاللہ "رکیا" حال ہوگئے ہیں یہ سب لکھ سکتے ہیں۔ اور کیوں نہ لکھیں۔ انسے لکھوایئے۔ کسی کے اتنے مشاغل نہیں ہیں جو ماہ میں ایک مرتبہ تھوڑا سا نہ لکھ سکیں اور اس بیباکی سے لکھیں جس کو میں کام میں لایا ہوں بمبئی والے محی الدین آزاد پر زور دیجئے کہ وہ اوّل کی طرح وہ بھی اس جانب متوجہ ہوں۔

ڈائرکٹری کیلئے جو "میں کون ہوں اور کیا ہوں" کے سوالات ہیں اس کا جواب لکھنا بہت مشکل بلکہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ پندرہ برس کی سرگذشت اور مختصر الفاظ میں میرے امکان و لیاقت سے باہر ہے۔ ایک معقول سکرٹری تلاش کرلوں اسکے بعد اسپر داستان کو لکھواؤں گا۔ سکرٹری کا ہونا میرے لئے نئی بات نہیں ہے۔ خدا اقبال احمد خاں سہیل اور زین العباد کو خوش رکھے دونوں نے مجھے اچھا خاصہ شاعر بنا رکھا تھا۔ سہیل خستہ جاں تو بہت اچھے شاعر ہیں اور زین تک بندی اور مہمل گوی کے اُستاد۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ایسے سکرٹریوں کے ہوتے ہوئے میرا کیوں عمدہ شعرا میں شمار نہ کیا جاتا۔ اس داستان کو کسی دوسرے موقعہ کیلئے ملتوی کرتا ہوں۔

یہاں پر ختم کر رہا تھا مگر یاد آیا کہ جو بات لکھنے بیٹھا تھا وہ بھول ہی گیا۔ سرابراہیم کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوگئی اسکا نتیجہ اس حد تک نکل آیا کہ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب مستعفی ہوگئے۔ جو کچھ ہو رہا ہے الما میٹر کیلئے اچھا ہو رہا ہے۔ ہم کو ان در و دیوار سے محبت ہے اور ذاتیات سے کوئی تعلق نہیں۔ اب وقت ہے کہ ہماری ایسوسی ایشن میں ہمارے وہ بھائی بھی اسی شان و خلوص کے ساتھ شریک ہوجائیں جس جوش کیساتھ انھوں نے اسمیں تازہ روح پھونک دی تھی اور نیز یونیورسٹی کے حالات کو درست کرنیمیں وہی حصہ لیں جو وہ ۱۹۲۰ء سے قبل لیتے رہے تھے۔ اس طولانی داستان کی معافی چاہتا ہوں۔

اشفاق علے

جزیرۃ العرب

ذیل کا مضمون ایک امریکن مستشرق مسٹر الگزنڈر پاول کی جدید مشہور و مستند کتاب ۔

The struggle for power in Muslim Asia

کے گیارھویں باب کا ترجمہ ہے۔ مصنف موصوف بقید حیات ہیں اور مشرقی معاملات میں انکی رائے نہایت مستند تسلیم کیجاتی ہے۔ ترجمہ نذر ناظرین کیا جاتا ہے اور کیا عجب ہے کہ اس باب کے بعد دیگر کسی حصہ کا ترجمہ شایع کیا جائے۔ ہم اپنے دوست جناب "غازی" کی اس تکلیف فرمائی کے ممنون ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ اس کتاب کو دوسرے حصہ خاص کر ترکی اور نجی حیا بھی ترجمہ کرینگے۔ ۔ اولڈ بوائے

حیرت ہے کہ کتنے ہی لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ملک عرب کا رقبہ ان تمام ریاستوں کے رقبے سے بڑا ہے جو دریائے مسی سی پی کے مشرق میں واقع ہیں، نیز وہ لوگ جنھیں اپنی جغرافیہ دانی پر ناز ہے وہ نقشے میں اس ذیلی براعظم کے ابعاد پر نظر ڈالتے ہیں تو لفظ "جزیرۃ العرب" پڑھکر انھیں تعجب ہوتا ہے۔ تمھیں یہہ بات معلوم ہے کہ اگر تم ریگستان شام کی شمالی حد سے جنوب کی طرف چلنا شروع کرو، تو تمھیں اتنی مسافت طے کرنی پڑیگی، جتنی خلیج ہڈسن سے خلیج میکسیکو کے درمیان ہے، بیشتر اسکے کہ تم عمان کے ساحل کے قریب پہونچکر بحر ہند کی متلاطم موجوں کا شور سنو۔ کیا تم اس بات سے بھی واقف ہو کہ ایک شیعہ زائر جو بغداد سے اپنے اونٹ کا منھ مکہ کیطرف پھیرتا ہے اس کو اتنا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے، جتنا ردد بار انگلستان سے دریائے ڈینوب کے درمیان ہے، بیشتر اس کے کہ اسکی نگاہیں مقدس حرم کعبہ پر پڑیں۔ اگرچہ عرب میں تین براعظموں کے لوگ آکر یکجا ہوتے ہیں، اور گو نہایت مشہور و معروف بحری راستے اسکے سواحل کے اطراف

تین ہزار میل تک چلا گیا ہے ۔ اسپر بھی اس سرزمین سے بین الاقوامی تجارت کا تعلق مطلق نہیں ہے۔
اسکی طبعی خصوصیات ہی کیوجہ سے خشکی کے قریب ترین راستہ پر دور دراز بحری سفر کو ترجیح دیجاتی ہے! اسکے
باوجود اسکے مقابلہ میں دنیا میں چند ہی ممالک ایسے ہیں گے جنھوں نے تاریخ انسانی میں اس سے زیادہ حصہ لیا ہو
کیونکہ عرب نہ صرف یہودیت اسکے بعد عیسائیت اور پھر اسلام کے بانی ہوئے ' بلکہ اس قلیل عرصہ میں جب وہ اسلام
کیلئے ملک گیری کے واسطے نکلے تو، انھوں نے مختلف مفتوحہ ممالک کو' اپنی قوم اپنی زبان اور اپنی خصوصیات
میں ملا لیا جسکی نہ کوئی مثال پہلے سے موجود تھی اور نہ اب ہے! اور یہہ بات یونانی، رومانی اور انگلوسیکسن اقوام
سے بھی نہ ہوسکی۔

جزیرہ نمائے عرب کا رقبہ ساڑھے بارہ لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ ہے۔ یہہ ایک وسیع بلند اور ہموار
سرزمین ہے جو مغربی اور جنوبی حدود پر سب سے زیادہ بلند ہے اور یہاں پہاڑوں کے سلسلے آٹھ ہزار فٹ سے بھی
زیادہ بلند ہوگئے ہیں۔ یہ پہاڑ شمال اور مشرق کیطرف بتدریج ڈھلوان ہوتے ہوتے دریائے فرات کے پاس تک
چلے جاتے ہیں۔ چونکہ بحر روم اور بحر ہند کی بیشتر تری ان مغربی اور جنوبی پہاڑوں کے ڈھالوں سے ٹکرا کر
رک جاتی ہے اسلئے یہاں کے علاقے سرسبز و شاداب رہتے ہیں۔ جزیرہ نما کے زیادہ تر حصے کا انحصار بیشتر ان
غیر یقینی انجرات پر رہتا ہے جو ہوا کے ذریعہ کردی پہاڑوں یا خلیج فارس سے آجائیں پس ملک عرب
روئے زمین پر ایک طرف تو بارش سے محروم رہنے والا اور دوسری طرف باعتبار اپنے عرض البلد کے نشیب
میں واقع ہونے سے انتہائی گرم ملک ہے۔ طبیعی حیثیت سے اس میں صرف یہی تقسیم نہیں ہے بلکہ اس کے
پورے رقبہ میں کوئی حقیقی شان رکھنے والا دریا بھی نہیں ہے گو اس میں وادیاں بکثرت ہیں جو ہمارے جنوبی
مغربی علاقے کے نالوں کیطرح سال بھر میں صرف چند ماہ تک ضرور بہتی رہتی ہے۔ قریب قریب تمام جزیرہ نمائے
عرب میں کسی ایک جگہہ جم کر رہنا مشکل ہے۔ یہہ بات تو صرف اسی جگہہ ممکن ہے جہاں پانی میسر آسکے۔
دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ملک عرب میں بجز ساحلی مقامات کے کہیں بھی مسلسل کاشت نہیں
ہوتی کہیں کہیں ایسے چھوٹے چھوٹے نخلستان ہیں جو اطراف میں ریت کے ٹیلوں سے گھرے ہوتے ہیں اور
ان میں سبزہ بہت کم پیدا ہوتا ہے! ایک نخلستان سے دوسرے نخلستان کے درمیان میں ایسے ریگستان بھی موجود ہیں

جن کی ریت ہمیشہ اِدھر اُدھر اُڑتی رہتی ہے اور جہاں کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہہ واضح رہے کہ ملک عرب سیاسی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اُسکا نام اس بڑے مستطیل یا قائم الزاویہ خطۂ زمین پر عائد ہوتا ہے جو براعظم ایشیا کا جنوبی مغربی گوشہ ہے اور اسکے حدود اربعہ یہہ ہیں کہ:۔ شمال مغرب میں فلسطین اور شام کے محکوم علاقے ہیں، شمال مشرق میں دریائے فرات واقع ہے، مشرق میں خلیج فارس اور خلیج عمان اور جنوب میں بحیرۂ عرب ہے اور مغرب میں بحر احمر ہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہہ وسیع خطۂ عرب ریاستوں کا ایک سلسلہ ہے جو کم و بیش مستقل حکومتیں اور انکی کچھ نہ کچھ متعینہ حدود بھی ہیں۔ ان ریاستوں کے اطراف صحرا اور خشک پہاڑ اور ریگستان ہیں جن میں گو بہت سے خانہ بدوش قبائل آباد ہیں لیکن انکے علاقوں کی نہ کوئی سیاسی حدود ہیں اور نہ کوئی انکا انتظام حکومت ہے۔

عرب کی خود مختار ریاستیں آٹھ ہیں۔ شمال مغرب میں فلسطین اور ریگستان شام کے درمیان ماورائے اردن ہے جو اُس وقت کرک کی ریاست کے نام سے موسوم ہے اور یہہ سرزمین گائی لینڈ کے مابین علاقے سے مطابقت کرتی ہے۔ اسکا حکمراں حجاز کے شاہ حسین کا بیٹا امیر عبداللہ ہے۔ اس ریاست کا صدر مقام شہر عمان ہے جو دمشق سے مدینہ جانیوالی ریل کی سڑک پر واقع ہے۔ فلسطین اور کرک کے جنوب میں طویل اور ریتیلا حجاز کا خطہ ہے جس کا رقبہ نسبتاً کیلیفورنیا کے رقبہ سے بڑا ہے۔ حجاز پہلے ترکی سیادت میں تھا جنگ عظیم میں خود مختار ہوگیا۔ سیاسی اعتبار سے اسے اسلئے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں مکہ اور مدینہ جیسے مقدس شہر واقع ہیں۔ مدینہ کا ریلوے کے ذریعہ دمشق سے سلسلہ ملا ہوا ہے! ان مقدس شہروں میں اسلامی دنیا کی ہر حصے سے ہزاروں زائرین آتے ہیں۔ حجاز کے جنوب میں بلاد عسیر واقع ہے۔ یہاں کی امارت ادریسی خاندان میں منقسم ہوگئی۔ عسیر کے جنوب میں یمن واقع ہے جس کا صدر مقام صنعا اور اسکے امیر کا نام یحییٰ محمد حمید الدین ہے اس علاقے میں پہاڑوں سے دوامی چشمے بہتے رہتے ہیں اسلئے یہاں کی کاشت کا تمام و کمال انحصار آب پاشی پر نہیں ہے مغربی اور جنوبی حصوں میں حضرمی باشندوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ بدو یہاں نہیں پائے جاتے بلکہ یہاں ایسے لوگ آباد ہیں جنھوں نے خود اک سکونت اختیار کرلی ہو۔ پہاڑوں کے مناظر دلفریب ہیں۔ ان پہاڑوں جنگلوں اور وادیوں کے بیچ بڑے بڑے خوشحال اور آباد شہر اور گاؤں واقع ہیں۔ ایسے شہر

اور گاوں بجز عمان کے کسی اور حصے میں نہیں پائے جاتے۔ جانوروں کے چرنے اور گیہوں، جوار، باجرہ، مکئی اور روئی
کی کاشت کیلئے بڑے بڑے رقبہ واقع ہیں۔ کافی خاص طور پر مشہور ہے۔ اسوقت حدیدہ اور عدن سے ہو کر
موشیح بھیجی جاتی ہے اور ان شہروں سے یمن کی کافی کے نام سے مشہور ہے لیکن اب اسکی شہرت جاتی رہی۔
یمن کے جنوب مشرق میں عدن واقع ہے جو برطانوی علاقہ ہے۔ یہہ مقام اگرچہ جھلسی ہوئی چھوٹی سی آتش فشاں
پہاڑی ہے لیکن بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کو بحر احمر کا جنوبی پھاٹک سمجھنا چاہیے اور مشرق بحری راستہ کی
حفاظت کے لئے برطانیہ کی یہہ فوجی چوکی بھی ہے۔ ۱۹۱۴ء کی برطانوی ترکی آویزش کے بعد سے برطانوی علاقہ
عدن سے لیکر خلیج فارس میں اس مقام تک وسیع ہوگیا جو بحرین کے مقابل میں ہے لیکن اس میں ربع الخالی کا کچھ
حصہ بھی شامل ہے جس کو کوئی اہمیت نہیں دیجا سکتی۔ اب اسکے جنوبی ساحل سے بحر ہند ٹکراتا ہے اور یہہ علاقہ حضرموت
کے نام سے موسوم ہے۔ اس خطہ میں خوشبو کی چیزیں بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔ بیان ہوا ہے کہ یہی علاقہ شاہان سبا
کی ملکہ بلقیس کا مسکن تھا اگرچہ سیاسی حیثیت سے جہانتک کہ حکومت کا تعلق ہے حضرموت "اجکل وکسی کی ملک
نہیں ہے"۔ اسپر بھی یہہ تربیت یافتہ اور منظم جماعت کا مسکن ہے۔ اسکی وادیوں میں بھی اسطرح حضرمی باشندے
آباد ہیں جسطرح یمن کے بہترین حصوں میں۔ یہہ مقام زمانہ قدیم سے مسالہ کیلئے مشہور چلا آرہا ہے۔ جنوبی مشرقی گوشہ
میں عمان واقع ہے۔ یوروپی نوآبادی کا ملک عرب میں یہہ پہلا منظر ہے۔ اسکا صدر مقام مسقط ہے۔ اسپر پرتگالیوں
کا سنہ ۱۵۰۸ء سے سترہویں صدی عیسوی کے وسط تک قبضہ رہا۔ اسکا بیشتر حصہ زرخیز ہے میلوں کے رقبے میں روئی
اور گنے کے کاشت ہوتی ہے۔ پانی کے چشمے ہر سمت بہتے ہیں۔ گذشتہ صدی عیسوی کے وسط تک عمان کے
سلاطین افریقہ کے ساحلی علاقے پر قابض رہے۔ سقوطرہ اور زنجبار کے جزائر بھی انکے زیر نگیں رہے۔ سنہ ۱۸۵۶ء
میں خاندانی آویزش کے باعث انکا ملک دو حکومتوں میں منقسم ہوگیا۔ سالہا سال سے عمان اور برطانیہ میں خوشگوار
تعلقات چلے آرہے ہیں۔ مسقط میں ایک برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ رہتا ہے۔ خلیج فارس کے اس ساحل پر جو
(Pirate coast) کے نام سے مشہور ہے کویت کی چھوٹی سی ریاست ہے۔ بغداد ریلوے کے قضیئے کے
سلسلے میں اُسنے تھوڑی بہت اہمیت حاصل کرلی ہے۔ سلطان کو ترغیب دی جارہی تھی کہ وہ برطانوی حفاظت
میں آجائے اسلئے کہ جرمنی اپنے منصوبے کے مطابق کویت کو برلن اور خلیج فارس نظام کے سلسلے میں کہیں مستقر

زنہ باے۔ ان ساحلی ریاستوں سے گھری ہوئی دو بڑی سلطنتیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو مملکت نجد احسا ہے اور دوسری مملکت جبل شمر انکے حالات سے لوگ بہت کم واقف ہیں اور واقعی یہہ دونوں عرب کے نہایت دلچسپ خطے ہیں۔

نجد کے جنوبی حصے کو فقط دو یا تین یورپ سیاحوں نے دیکھا ہے! اور اسکے پُر اسرار صدر مقام ریاض کا ذکر ایک انگریز محقق پالگریو نے مندرجہ ذیل عبارت میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہمارے سامنے ایک وسیع اور کشادہ وادی تھی اور ان پہاڑوں کے نیچے جن کی چوٹی پر ہم کھڑے ہوکے تھے میدان میں بڑا اور مربع صدر مقام کا شہر واقع تھا جو اونچے اونچے میناروں اور مضبوط فصیل سے ڈھکا ہوا تھا چھتوں اور بلند مکانوں کے جھرمٹ میں فیصل کا شاہی محل کھڑا تھا جس کو اسکے بیٹے نے بنایا اور آباد کیا تھا۔ اس شہر کے گرد میدانوں میں پورے تین تین میل کے رقبے میں لیکن زیادہ تر خصوصاً مغرب اور جنوب کی طرف ہرے بھرے کھیتوں اور سرسبز و شاداب کھجور کے درختوں کا سمندر لہرا رہا تھا۔ اسکی مخالف سمت میں بجانب جنوب یہہ وادی وسیع اور زیادہ زرخیز یمامہ کے میدانوں میں جاکر کشادہ ہو جاتی ہے اور یہاں گاؤں زیادہ قریب قریب آباد ہیں۔ اس سرزمین میں منفوحہ کا بڑا شہر جو ریاض سے رقبے میں بمشکل کم ہوگا آسانی سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ اس سے اور آگے ٹیڑھی پہاڑیاں اور ریتا مجمر گئیاں ہیں"۔

ملک عرب کے نہایت طاقتور حکمراں ابن سعود کا یہہ صدر مقام ہے جو جزیرہ نمائے عرب کے اس بڑے حصے پر جو حجاز اور خلیج فارس کے درمیان واقع ہے۔ اس زمانہ سے حکمراں ہیں جب کہ ۱۹۱۳ء میں انہنے ترکوں کو احسا سے بیدخل کیا تھا۔ اسکے علاقے کے جنوب میں بڑا حصہ بلند اور بنجر میدانوں کا ہے جس میں بہت نخلستان ہیں اور ان نخلستانوں میں مستقل آبادی ہے۔ باوجودیکہ اس علاقے میں بجز کھجور اور جانوروں کے دوسری پیداوار کم ہوتی ہے۔ اور یہہ علاقہ آگے جاکر ربع الخالی کے لق و دق ریگستان میں گم ہو جاتا ہے۔ اس سلطنت کے شمال میں جبل شمر کی مملکت ہے جس کا صدر مقام حائل ہے۔ اس علاقے میں بہ مقابلے جنوب کے زیادہ تر بدوی آبادی ہے۔

ملک عرب کی طبعی حالت وہاں کے باشندوں (خصوصاً وسط عرب کی آبادی) کو بھوکا پیاسا خانہ بدوشی کی حالت میں رکھتی ہے۔ یہاں کے باشندے پانی اور چراگاہ کیلئے جو زندگی کا واحد ذریعہ ہیں گشت کرتے رہتے ہیں

اور اپنی اُس آزادی پہ نازاں جو عرصہ دراز سے انکے لئے مخصوص چلی آرہی ہے۔ ساحل کی ریاستوں میں جو نسبتاً سرسبز و شاداب ہیں حضری باشندے آباد ہیں جن کی آبادی تقریباً چالیس لاکھ ہے اور انکا ذریعہ معاش گلہ بانی زراعت مچھلی کا شکار اور تجارت ہے لیکن جزیرہ نمائے عرب کا اندرون حصہ بہت وسیع ہے اور اسکے حالات سے لوگ بہت ہی کم واقف ہیں۔ گو اس میں مختلف تانی شہر کہیں کہیں واقع ہیں اور ان شہروں میں کئی کئی منزلہ عمارتیں بھی ہیں جن میں چھوٹے بڑے بہت سے بدوی قبائل آباد ہیں جن کی تعداد معلوم نہیں۔ انکا واحد ذریعہ معاش اونٹ گھوڑوں اور بھیڑوں کی پرورش ہے۔ لفظ "بدو" کا اطلاق عرب کے تمام باشندوں پہ نہیں ہوتا جیسا کہ عموماً لوگوں کا خیال ہے۔ بلکہ خانہ بدوش قبائل کے افراد کیلئے یہہ لفظ مستعمل ہے تاکہ حضری اور نیم حضری باشندوں سے تمیز ہو سکے۔ بدو لوگ اپنے گلے کیلئے پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں موسم کے اعتبار سے ایک مقام کو ہجرت کر جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جاڑے کا موسم اپنے ہی وطن وسط عرب میں بسر کرتے ہیں لیکن موسم بہار کے شروع ہوتے ہی کردستان اور اناطولیہ کے علاقوں تک چلے جاتے ہیں۔ موسم گرما بھر یہاں کی سرسبز وادیوں میں اپنے جانوروں کو موٹا تازہ کرتے اور جاڑے کے شروع ہوتے ہی اپنے جنوبی علاقے کیطرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ بدو خود خانہ بدوش نہیں ہوتے بلکہ ضرورت کے اعتبار سے وہ ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں اس خیال سے کہ یا تو وہ ہجرت کر جائیں یا بھوکے مر جائیں۔

نامعلوم زمانہ سے عربی قبائل ایک دوسرے سے آپس میں لڑتے چلے آرہے ہیں۔ یہہ ترکوں سے بھی جنگ آزما ہوئے مگر ترک بالآخر جزیرہ نمائے عرب کے اچھے خاصے حصے پر کچھ عرصہ تک اپنی سیادت کو برائے نام قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن اس عرصہ میں بھی فاتح اور مفتوح دونوں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے۔ ملک عرب چونکہ دوسرے ممالک سے ترقی کے میدان میں پیچھے اور قدیم ہے اس بنا پر یہہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ سیاسی تصفیوں اور خاندانی جھگڑوں سے پاک ہوگا جیسی یورپ میں لڑائیاں ہوتی ہیں اسیطرح چھوٹے پیمانہ پر یہاں بھی ہوا کرتی ہیں۔ اُن میں اور اِن میں صرف فرق اتنا ہے کہ یہہ لڑائیاں نسلاً بعد نسل جاری رہتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں جو قبائل میں خون بہا کی رقم کی عدم ادائی یا چراگاہ اور پانی کے قضیوں سے متاثر ہو کر یا لوٹ مار کی خواہش کے سلسلے میں ہوا کرتی ہیں ان لڑائیوں کو اُن بڑی لڑائیوں کی

مثل نہ سمجھ لینا چاہئیے جو بڑے بڑے سلاطین میں سیاسی سے زیادہ عموماً خودغرضی کی بناء پر ہوا کرتی ہیں۔ عرب میں بڑی بڑی جنگوں کے نہ صرف ایسے خونیں واقعات پیش آئے جن میں ہزاروں لوگ ضائع ہوئے اور فوت شدہ افراد کی باہر والوں کو صرف اڑتی ہی سی خبر پہونچی بلکہ بعض بڑی بڑی لڑائیوں کے معاملات کی گونج یورپ کی عدالتوں میں بھی پہونچی جس کی وجہہ سے بعض بڑی بڑی سلطنتوں کی حکمت عملیاں متاثر ہوئیں۔ یہہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ عرب کے ایک بڑے حکمراں نے جس کا اور جسکے ملک ــــــ کا نام قریب قریب عرب کے باہر لوگوں کو معلوم نہیں حال ہی میں مدبرین یورپ کے نہایت حریصانہ منصوبوں کا سدباب کرنے میں کامیابی حاصل کی اگرچہ کہ انکا قطعی استیصال نہ ہوسکا ہو۔ یہہ ایک دلچسپ قصہ ہے۔ (باقی)

"غازی"

طاعون نے حیدرآباد کا تختہ الٹ دیا۔ بھاگنے والوں میں بڑی بڑی نام نظر آتے ہیں مولوی عنایت اللہ صاحب بی۔ اے کو کون نہیں جانتا کہ کیسی شاہ قلم ہیں مالیکن یہہ شاید بہت تھوڑی لوگوں کو خبر ہو گی کہ ایسے موقعہ پر کسی کی نہیں سنیئے۔ اس موقعہ پر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بلی کے بھاگوں چھینکا توڑا گیا تھا، اور چھینکے سے مٹھائی کی ٹوکری پیر رودنہ کی سرگرمی تھی۔ ہمارے دوسرے بھائیوں میں سے مولوی مسعود علی صاحب بی۔ اے نے بھی وقت کو ہاتھ سے نجانے دیا اور رمضان کی پوری تعطیل لنکا کی سیر میں گزار دی جہاں باون گز سے کم جسامت کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ جناب جوش ملیح آبادی نے بھی ان دونوں سے چند قدم آگے ہی اپنے آپکو دکھایا اور ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا "البتہ برادرم اکبر ناظریار جنگ بہادر نے اپنے اصول کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، اور صرف مقررہ ایام کیلئے باہر گئے اور اندرون مدت واپس آگئے لیکن بھائی قاضی تلمذ حسین صاحب رخصت اور استفادہ کے باب میں بالکل قاعدہ قانون کے پابند نظر آئے، اور جہاں تک ہوسکا، اپنے وقت سے ایک منٹ کو بھی ضایع نہونے دیا، ہمارے من نوازی کے بدلہ گورکھپور سے حیدرآباد واپس جب سے تو گورکھپوری کھلنڈرنگی نظر بچاکر حلوے کا ڈبہ بکس میں ساتھ لائے، اور تمباکو کی ٹوکری اس لحاظ سے بی بی کی حوالے کر آئے کہ کالی قبر سے مزار شریف تک اس خوشبو تمباکو کا دہواں جائیگا، اور مولوی عبداللہ عمادی صاحب کے اوراد میں خلل واقع ہوگا۔ اولڈ بوائے کے ناظرین کو ایک بات سن کر حیرت ہو گی کہ اسم بیتہ حکیم پریم صاحب کے مشورہ سے یا خدا معلوم اس خیال سے کہ اوس جی کی سنگھٹن میں شریک ہوجائیں گدر کی ایک چادر بھی ساتھ لائی ہیں۔ ہمیں اڑتی سی خبر ملی ہے کہ قاضی صاحب نے دانستہ یا نادانستہ حضرت پیر گاما صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے اور اس کوشش میں ہیں کہ دوسرے بھی انکے پیر بھائی بنجائیں۔ ہمیں خوشی اسکی ہے کہ اسطرح سے ہمارے بھائیوں کی بھیک غرب کہیں جاسکیگی۔

فلڈرس بیچتا ہوں

فتحیاب انمیں یہہ کل جاکی صدا دی ہمنے
فلڈرس بیچتا ہوں! ہے کوئی لینے والا

سُرخ ٹیونک ہے برنگ شفق صبح بہا
رنگ وہ رنگ کہ شرمندہ ہو جس سے لالہ

کف زر ساعد سیمیں کیطرح اور کالر کہ
خوشنما جیسے حسینوں کے گلے میں مالا

اک بریچز بھی ہے اور ایک بلو
اور۔ اُووَر آل بھی ہو نہ بھی ہے کالا کالا

سیاش بھی بلٹ بھی ہے دو کرچ ہے تیشکل
یوں پکتی ہے کہ بس سر دارم کا ڈالا

فلڈرس پاک ہے پایا ہے نماز ونکا ثواب
مے کبھی پی نہیں ہیں نے۔ نہ پھر استوالا

کبھی گرمی کبھی برسات کی دیکھی ہے بہا
اور جاڑوں سے کئی بار پڑا ہے پالا

پاس سے کھتا نہیں کچھ شادی غم ہیں بیچا
نہ مری جیب میں کنجی ہے۔ نہ گھر میں تالا

کیا کروں! دست زمانہ نے کیا ہے مجبور
ٹالتا ہوں اُسے۔ پہلے تو بہت کچھ ٹالا

چیخئے چیخئے۔ یہہ آگ بھڑک اٹھے ہے
آگئے پاؤں میں چھالے تو زباں پر چھالا

کیا ڈرس کی کسی صاحب کو ضرورت نہ رہی
کسی جانب سے صدا ہی نہیں آتی۔ لا۔ لا

کاش لا۔ لا ہی کہے کوئی تو دے مجکو جواب
مفت مانگے جو کوئی مفت ہی دے۔ ڈے ڈالا

زندگی! نکہت و امان ہوائے گلزار
نذر ہی! نخل گلستان وفا کا جالا

خورسالی سے محبت تھی بہت ورزش سے
ناتواں کرگئے لیکن میری بچپن سالہ[1]

---

[1] حضرت شہرت کی خورسالی اور یہہ سالہ دونوں ناظرین کی توجہ کے محتاج ہیں۔ بی بی کے بہن بھائی ان سے یقیناً مراد نہیں۔

اب نہ وہ شان سواری ہے نہ شمشیر زنی ناتواں ہاتھ میں اٹھتا نہیں ہرگز بھالا
اب قلم چلتا ہے۔ یا تیغ زباں چلتی ہے گولی رائفل کی چلی جاتی ہے بالا بالا
اب رہا کیا۔ وہ مثل آگئی صادق شہرت
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالہ

شہرت

ایک کھلا تار

بخدمت اراکین مسلم یونیورسٹی کورٹ علیگڈھ

براہ مہربانی ہماری پرخلوص مبارکباد اپنے ان عاقلانہ تجاویز پر قبول فرمائیے جن کو آپ نے علیگڈھ یونیورسٹی کی اصلاحات کیلئے لائحہ عمل کی طور پر منظور فرمایا۔ اس حیثیت سے کہ ہم کو اس کا حق اور شرف رہا ہے کہ ہم نے علیگڈھ کالج میں بزمانہ سر سید اعظم اور بعد ازاں تعلیم حاصل کی اور پھر اسکے ساتھ ہم کو بہت قریبی تعلق بھی رہا ہے ہم ایک استدعا کے پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں جس سے نہ صرف یونیورسٹی کی مشکلات حل ہو جائیں گی بلکہ ساتھ ہی ہر نقطہ خیال کے مسلمانان ہند کو بلکہ ساری دنیا کے ان مسلمانوں کو جنھیں علیگڈھ سے دلچسپی ہے اسبارے میں اطمینان ہو جاسکتا ہے۔

بالیقین یہ امر آپ پر ظاہر ہے کہ نواب مسعود جنگ بہادر سید راس مسعود صاحب جو سر سید علیہ الرحمہ کے پوتے ہیں حیدرآباد سرکار نظام کی خدمت نظامت تعلیمات سے ایک نہایت قابلانہ عرصہ کارگزاری کے بعد وظیفہ حسن خدمت کے حصول پر سبکدوش ہو رہے ہیں۔ سررشتہ تعلیمات حیدرآباد تقریباً (۶۰) لاکھ کی رقم ہر سال تعلیمات عامۃ الناس پر خرچ کرتا ہے نواب مسعود جنگ بہادر کی نظامت سررشتہ تعلیمات حیدرآباد کو اسکے موجودہ اعلیٰ معیار کارگزاری پر پہنچانے کا سہرا ہے بلکہ جامعہ عثمانیہ کے عالم ظہور میں آنے اور پھر اسکے موجودہ نظم و نسق کے جو بہترین نتائج رونما ہوئے اسکے وہی ذمہ دار ہیں۔

ہم خیال کرتے ہیں کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کو موصوف سے زیادہ تعلیمی تجربہ اور انتظامی قابلیت کا فرد جو ایک یونیورسٹی کا نظم و نسق چلا سکے نہیں مل سکیگا اور اسی بنا پر ہم انکا نام نامی یونیورسٹی کی وائس چانسلر کی خدمت کیلئے پیش کرتے ہیں جنھیں اسکا کامل اختیار دیدیا جائیگا کہ وہ پرو وائس چانسلر اور پروفیسروں کا آپ انتخاب کریں اور یونیورسٹی کا ایسا انتظام کریں جو ایک قومی یونیورسٹی کی شایان شان ہوگا اور اسطرح سر سید مرحوم اور عالم اسلام کی تمناؤں کو پورا کرے گا۔

میں علیگڈھ میں

بخدمت شریف مدیر صاحب "اولڈ بوائے" ! السلام علیکم

آپکی عنایت اور میری خوش قسمتی سے "اولڈ بوائے" کے ماہانہ رسالہ کا خریدار ہونے کا مجھے بھی اس مرتبہ اتفاق ہوا۔ اور اسی اولڈ بوائے کے بعض نمبروں میں میں نے پڑھا ہے کہ آپ نے اپنے اکثر احباب سے خواہش کی ہو کہ وہ اپنے زندگی کے کچھ حالات "اولڈ بوائے" میں درج کیے جانے کی غرض سے آپکی خدمت میں بھجوائیں۔ آپکی یہہ خواہش کسی کیلئے مخصوص تو شاید نہیں ہے اسلئے میں بھی بحیثیت اولڈ بوائے ہونے کے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے زندگی کے حالات۔ اب اسے آپ حالات سمجھیں افسانہ سرگذشت یا داستان درج رسالہ کرنے کی غرض سے آپ تک پہنچا دوں۔ اگر زحمت نہ ہو اور درج کرنے کے لائق واقعات ہوں تو لکھدیجیے ورنہ کوئی شکوہ نہیں۔

میری تاریخ پیدایش ۱۷ ذیقعدہ ۱۳۱۴ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۸۹۷ء ہے۔ مقام پیدائش اور سکونت حیدرآباد فرخندہ بنیاد۔ والد قبلہ کا نام نواب اظہر جنگ بہادر ہے تعلیم کی ابتدا نظام کالج سے ہوئی تین چار سال یا اس سے کچھ زیادہ زمانہ کنڈر گارٹن میں گذرا اسکے بعد اسکول میں قدم رکھا۔ دو ایک سال اسکول کے کلاسوں میں کامیابی حاصل کرکے سنہ ۱۹۱۰ء میں علیگڈھ بھجوایا گیا۔ اسکول اور کنڈر گارٹن میں چونکہ میری سیرت اور رفتار تعلیم اچھی اور قابل اطمینان تھی اور مسٹر سیٹن پرنسپل وقت خود اسکول میں ہمارے انگریزی کلاس کے معلم تھے اسلئے ان کو میری انگریزی مضمون میں خاص ترقی کرنے کا پورہ ثبوت مل رہا تھا اور یہی وجہہ تھی کہ جب میں علیگڈھ جاتے وقت صاحب موصوف سے ملنے گیا تو انھوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں اپنی تشفی بخش

تعلیم کا سلسلہ انتظام کالج سے منقطع نہ کر دوں [illegible] تو انہوں نے ایک خط میرے والد ماجد کو لکھکر بھیجوایا جس میں میری تعلیم سے کامل اطمینان ظاہر [illegible] خواہش کی کہ میرا نام اُس اسکول سے نہ نکلوایا جائے اور میں کسی اور [illegible] بھیجا جاؤں لیکن یہہ کس کو معلوم تھا کہ ہم بھی کسی آئندہ زمانہ میں علیگڈھ اولڈ بوائے کہلائے جائیں گے۔ [illegible] ۱۹۱۰ء میں ہم علیگڈھ پہنچے اس زمانہ میں بھائی غلام حسین وہیں زیر تعلیم تھے [illegible] کو قبل از وقت اطلاع کر دی گئی تھی۔ [illegible] کورٹ میں بھائی غلام حسین ہی کے کمرہ میں ہم رہنے لگے اور [illegible] میں شریک کئے گئے۔ ہمارے کمرے کے [illegible] مرزا محمود علی مرحوم کا کمرہ تھا یہہ میرے حیدرآباد کے بہتر دوستوں سے تھے۔ بھائی غلام حسین اور محمود مرحوم ہم کلاس اور ایک جگہہ ملکر پڑھتے تھے۔ امتحان ہوا نتیجہ نکلا۔ چونکہ میری اور محمود علی مرحوم کی خوب دوستی تھی اسلئے قسمت نے یا شاید ہم ہی نے ایک دوسرے کا اُسوقت بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ محمود بھی فیل ہوئے اور ہم بھی۔ اس زمانہ میں ٹیوڈر اوون صاحب پرنسپل کا دور دورہ تھا۔ آدمی محبت کے اور [illegible] تھے خصوصاً [illegible] کے لڑکوں پر زیادہ مہربان رہا کرتے۔ جب ہمیں نتیجہ امتحان سناتے وقت اُن لڑکوں [illegible] لیا گیا جو امتحان میں ناکامیاب ہوے تھے تو پرنسپل صاحب نے اخیر میں میرے پاس آکر فرمایا کہ تم نے تمام مضامین میں اچھے نمبر حاصل کئے سوائے ریاضی کے۔ اور جاتے وقت ہنستے ہوے یہہ بھی کہا کہ پھر کوشش کرو۔ قصہ مختصر ہم وہاں سے مغموم اپنے کورٹ واپس آئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ میاں محمود بھی اسی کشتی کے سوار مگر نہایت بشاش احباب سے ہنسی مذاق کرتے بیٹھے ہیں گفتگو اور مذاق کے ڈہنگ سے یہہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کامیاب شدہ احباب کے کامیابی پر ہنس رہے ہیں اور انکو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ایسے موقع پر میرا بھی ان کے کمرہ میں سیدھے چلا جانا اور انکا دوڑ کر گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملانا ثابت کر رہا تھا کہ میرا ایسے وقت بھی ان کا ساتھ دینا ان کیلئے باعث تشکر ہے۔

میں نے اسوقت جو کچھ آپکو بتلایا وہ تو صرف ہمارے علیگڈھ میں ابتدا اور انتہا کی حالت کے متعلق ہے مگر جو درمیانی زمانہ گذرا اسکے نسبت اسقدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ڈائننگ ہال کے گوشت اور دال چپاتی کا مزہ اب تک یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہیگا۔

جمعہ اور پیر کے پلاؤ اور زردہ میں بھی خاص لطف تھا۔ بیمار پڑنے کی میں نے بھی اکثر مرتبہ کوشش کی اور ڈاکٹر صاحب کی مہربانی اور رحم و کرم کی وجہہ سے غذا میں تبدیلی بھی ہوئی۔ آخر کب تک صحت ہو ہی گئی یا یوں سمجھئے کہ خود بخود اچھا ہو جانا پڑا۔ اور پھر وہی دال چپاتی کا بول بالا۔

میری کم عمری تھی۔ اسلئے یہہ تو یاد نہیں کہ اسکول۔ کالج اور بورڈنگ کا ہر ایک دروازہ، دیوار اور ہر کونہ کیا تھا۔ کس سال کونسا کمرہ یا ہال تعمیر پایا، اور کب ٹوٹا۔ کس تاریخ مرمت ہوی۔ اینٹوں کے ڈھیر کس مقام پر کس عرصہ تک پڑے رہے، اور کس سال انکو کام میں لایا گیا اور کب اٹھائے گئے۔ فلاں زمین پر کس سن میں کیا تھا۔ اب کونسی عمارت بنائی گئی ہے وہ بڑا میدان (Lawn) فلاں عمارت کے کس جانب ہے۔ یہہ تاریخی اور جغرافیائی بیان تو غلام پنجتن صاحب ہی کا حصّہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہم "اولڈ بوائے" اور ناظرینِ "اولڈ بوائے" کو اُن کی جاں فشانی اور محنت کی داد دیتے ہوئے مشکور ہونا چاہیے جنہوں نے صرف ہمارے معلومات کی خاطر اپنے زبردست حافظہ کا ثبوت دیدیا۔

میرا دل پسند کھیل فٹ بال تھا۔ بعض اوقات بورڈنگ ہاؤس ہی کے موسم کورٹ پر ٹینس کھیلا کرتا۔ فٹ بال یا ٹینس کو جانے کے قبل میرا ملازم "جانکی" حلوائی سے (جو ہر روز سہ پہر کو ہارس کورٹ ہوتے ہوئے ممتاز ہاؤس اور دوسرے مقامات جایا کرتا) میرے لئے کچالو اور کچھ میوہ ضرور خرید لیا کرتا۔ یہہ میرا معمول تھا کہ ہر وقت اسکا ناشتہ کرکے کھیل کے لئے جایا کرتا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اُس زمانہ میں فرسٹ الیون کے مشہور فٹ بال کپتان سید محمد اعظم صاحب تھے۔ میرے قیام علیگڈھ کے زمانہ ہی میں نمائش بھی ایک مرتبہ ہوئی۔ اس نمائش کے پراٹھے اور کباب تو شاید ہی عمر بھر تک بھولیں وہ گرم اور نرم پراٹھے اور وہ لچھے دار پیاز کے ساتھ گرم گرم کباب اور اسوقت کی از خود رفتہ کرنے والی بچپن یا عنفوان شباب کی بھوک اور پھر یہہ ضد کہ ہم پراٹھے اور کباب ہر دو کو کبھی بھوک پر غالب نہونے دیں گے۔ روز کھاتے تھے اور خوب کھاتے تھے۔ بعض اوقات شہر کو بھی بھائی غلام حسین اور بہبود مرحوم کے ساتھ چلے جایا کرتے۔ نماز کی پابندی حتی الامکان ضرور ہوا کرتی تھی۔ نماز کی حاضری پکارتے وقت لبیک کی صدا وہ مجھ سے اکثر سنا کرتے۔

امتحان کے بعد ہم بڑی تعطیلوں میں اپنے گھر آئے۔ یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد حضرت غفران مکاں نے

عالم فانی سے رحلت فرمائی اور اعلیٰحضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہ کے دور عثمانی کا آغاز ہوا۔ اس وقت ارشاد مبارک ہوا کہ میں ہر روز صبح شام ڈیوڑھی مبارک پر حاضر رہا کروں۔ اسی زمانہ میں مجھے حضرت اقدس و اعلیٰ کے ہمراہ زمانہ دہلی دربار بمبئی۔ اجمیر شریف، اورنگ آباد، گلبرگہ شریف اور ورنگل اکثر بار رہنے کی عزت حاصل ہوتی رہی۔ جب تعطیلات موسم گرما کی بہت اختتام کو پہنچیں تو والد ماجد نے بندگانِ حضرت سے عرض کیا کہ حکم ہو تو صمصام الدین کو واپس علیگڈھ بھجوا دیا جائے۔ ارشاد ہوا کہ اب علیگڈھ بھجوانے کی ضرورت نہیں ہیں مسٹر اسٹرچ کو لکھ کر صمصام الدین کو نظام کالج میں شریک کرا دونگا۔ چنانچہ نواب سر امین جنگ بہادر کو حکم ہوا کہ وہ حسب الحکم اعلیٰحضرت قدر قدرت مسٹر اسٹرچ کو لکھ دیں کہ مجھے نظام کالج میں شریک کر لیا جائے۔ دوسرے روز جب میں اسکول کو مسٹر اسٹرچ سے ملنے گیا تو وہ مجھ سے نہایت مہربانی کے ساتھ پیش آئے اور علیگڈھ میں میری تعلیم کے متعلق حال دریافت فرمایا۔ بہرحال مجھے پری میڈل کلاس میں شریک کر لیا گیا۔ فائنل کامیاب ہونے کے بعد تھوڑے عرصہ تک انٹرمیڈیٹ میں تعلیم پاتا رہا اسکے بعد ہی میرے متعلق فرمان مبارک صادر فرمایا گیا کہ میں سول سروس کلاس میں شریک کیا جاؤں۔ یہ سنہ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے۔

محمد صمصام الدین حیدر

معاملات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

نواب مسعود جنگ بہادر کو وائس چانسلر مقرر کرنے کی تحریک

گذشتہ پنجشنبہ کو نواب ناظر یار جنگ بہادر کے بنگلہ پر معاملات علیگڈھ پر غور و خوض کرنے کیلئے ایک ابتدائی مشورتی جلسہ منعقد ہوا۔ معاملات متعلقہ پر ایک گھنٹہ تک بحث ہوتی رہی۔ بالآخر نواب ناظر یار جنگ بہادر کے محررہ مسودہ پر تمام حاضرین نے دستخط کئے اور قرار پایا کہ اس پر دیگر حضرات کے دستخط لئے جائیں اس اعلان کی کافی طور پر اشاعت کیجائے۔ حاضرین کیلئے پرتکلف عصرانہ کا انتظام تھا۔ نواب صاحب ممدوح کی تحریک حسب ذیل تھی۔

نواب محسن الملک نواب وقار الملک مولوی عزیز مرزا مرحومین یکے بعد دیگرے خلیفہ محسن خدمت ریاست حیدرآباد کے بعد علیگڈھ کالج اور مسلم لیگ کے سکرٹری ہوئے اور اب بھی پوری توقع ہے کہ ریاست حیدرآباد کے خلیفہ یا نواب مسعود جنگ بہادر کو وائس چانسلر

(۳۵)

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

شرح "یعنے شامِ ہجر کی ہیبت ہر ایک کا زہرہ آب کرتی ہے تو کیا تعجب ہے کہ چاندنی کا زہرہ بھی آب ہو جائے اور وہ میرے گھر کیلئے سیلاب ہو جائے۔" شارح کی عبارات زائد کے ساتھ معنے تو پیدا ہو جاتے ہیں مگر بہ تکلف۔ میرا خیال ہے کہ جس وقت یہ اشعار نظم کئے گئے ہیں اُس وقت مصنف کے پیش نظر مرزا بیدل کی یہ غزل ضرور ہوگی ؎

بہ خاکِ راہ کہ گردید قطرہ زن مہتاب — کہ خوں فشاند بہ یکدشت پیرہن مہتاب
بہ صد بہار سر و برگ ایں تصرف نیست — جہاں گرفت بہ یک برگِ یاسمن مہتاب
دراں بساط کہ شمعِ طرب بود خاموش — ز پنبۂ سرِ مینا بروں فگن مہتاب
وگرچہ چارۂ حجز آتش زدن کیست بہ ہوش — فتادہ است بہ فکرِ کتانِ من مہتاب
شہیدِ نازِ تو در خاک بے تماشا نیست — ز موجِ خونِ چمنے دارد از کفن مہتاب
بہ گلشنے کہ حیا شبنمِ بہارِ تو بود — گداخت آئینہ چندانکہ شد چمن مہتاب
مباش منکرِ فیضِ گریہ ام بیدل — کہ شستہ است جہاں را بہ اشکِ من مہتاب

اب بیدل کے مقطع سے اس شعر کو ملا لیجئے۔ اور تیسرے شعر سے مطلع کو۔

(۳۶)

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط

شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

شرح ہے "ا ے" نظر عتاب جو ضبط نالہ و آہ کا اشارہ کرتی ہے اسکے ڈر سے عجب نہیں کہ شعلہ خس میں اسطرح چھپ رہے جیسے رگ میں خون"۔ یہ شرح متن سے بالکل منافی ہے۔ اگر شعر کی نثر بنائے تو اسطرح ہوگی:" اگر نگاہ گرم تعلیم ضبط فرماتی رہے تو شعلہ خس میں اسطرح نہاں ہو جائیگا جیسے رگ میں خون" اب سوال یہ ہے نگاہ گرم کس کو ضبط کی تعلیم دے؟ عاشق کو یا خس کو؟ شارح کے بیان سے یہہ مترشح ہوتا ہے کہ خس کو ضبط کی تعلیم دیجائے تو اُس میں سے شعلہ نہ اُٹھے اگر ایسا ہے تو معشوق کیلئے یہ شغل بیکار ہی کتنا اچھا ہے کہ جما کو خس میں چنگاری ڈال کر آگ کھڑے رہنے کے بدلے اسکو گھورتی رہیں کہ اس میں سے شعلہ بلند نہونے پائے۔ ہاں اگر فرماتی رہے کا مفعول ثانی عاشق (محذوف) ہے تو جو شرح حضرت شوکت نے کی ہے وہ ٹھیک اُترتی ہے یعنے" اگر نگاہ گرم اسیطرح ضبط سوز دل کی تعلیم دیتی رہے تو خون آگ بنکر رگوں میں اسطرح چھُپ جائیگا جیسے شعلہ خس میں"۔ انھیں معنوں کا لحاظ کرتے ہوے آپ نے اس مصرعہ کو یوں تحریر فرمایا ہے جس سے التباس معنوی دور ہو جاتا ہے۔ ع شعلہ جیسے خس میں خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا۔ بہت ممکن ہے کہ مصنف نے اسیطرح مصرع کو نظم کیا ہو اور متعارف مصرعہ میں سہو کتابت ہو۔

(۳۷)

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

شرح "وہ اشارہ ہے غرور حسن کی طرف" مراد شاعر یہی معلوم ہوتی ہے لیکن بیان تشنہ ہے یہی مطلب حضرت والہ مرحوم نے وثوق صراحت میں بیان کیا ہے لکھتے ہیں" صنم کی بندگی میں اپنی بھلائی جو نہ ہوی گویا صنم کی صاحبی نمرود کی خدائی تھی جس سے پرستاروں کا بھلا نہ ہوا"۔ میں کہتا ہوں کہ جب غرور حسن یا بت کی خدائی کیطرف کوئی لفظی اشارہ نہیں ہے تو پھر بندگی سے بندگی الٰہی کیوں مراد نہ لیں اسپر ایک منطقی اعتراض

وارد ہوتا ہے کہ فعل ماضی (تھی) ان معنوں کے منافی ہے۔ میں کہوں گا کہ شاعر نے حکومت ابدی و ازلی کے صرف اس جزو زمانی کو لیا ہے جس میں اس نے بہ تحکم خود بندگی کی اور اس بندگی کا کوئی ثمرہ اپنے حسب مراد نہ دیکھا۔ غالب کے پاس ایسے زمانہ شعر بہت ہیں اور وہ بارہا اپنے بدقسمتی کے معاملہ میں اللہ میاں سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ دیکھئے کیسی شوخی سے کہتے ہیں

عمر اپنی جو اسی طرح سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

ایک جگہ ایک فارسی قصیدہ میں کہتے ہیں ؎

بر منبرے کہ زینۂ زیاں نفس بود　　ہوئے چو سالکان قلندر برآورم
ناچار چوں خدائے بہ آدم نمی رسد　　من نیز کار خویش ز نمرود برآورم

شوکت مرحوم نے اس شعر کا مطلب مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے لکھتے ہیں (۱) جب بندگی میں بھلا ہوا کرتا تھا تو شاید وہ نمرود کی خدائی تھی اب خدا کی بندگی میں میرا بھلا نہیں ہوتا اس سے تو نمرود ہی کی خدائی بہتر تھی (۲) میں نے خدا کی بندگی نمرود کی خدائی سمجھ کر نہیں کی پھر میرا بھلا کیوں نہیں ہوتا (۳) نمرود کی خدائی کیا اچھی تھی کیونکہ اس میں بھلا ہوا کرتا تھا۔ اب بندہ بن کر میرا بھلا نہیں ہوتا۔ تو میں نمرود بن کر خدائی کا دعویٰ کروں تب بھلا ہوگا۔ تیسرے معنے نازک ہیں اور غالباً غالب کا یہی مطلب ہوگا شعرا اپنی ترنگ میں شرع و ورع کا کھٹراگ نہیں پالتے۔"

بہر حال کچھ ہی ہو اکثر شارحوں نے شعر کے معنے بیان کرنے کی کوشش کی ہے مگر کوئی صاف صاف نہ بیان کرسکا کہ شاعر کے ذہن میں کیا معنے تھے۔ اسی کو المعنی فی بطن الشاعر کہتے ہیں۔

(۳۸)

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

شرح۔ یعنے شوق دل میں سما کر تنگی جا کی سبب سے جوش و خروش نہیں دکھا سکتا، گویا دریا گہر میں سما گیا

اب تلاطم نہیں باقی رہا" شاعر کا مقصود وہی چاہے کچھ ہی ہو لیکن شرح منافی متن ہے اسلئے اگر تلاطم باقی نہیں رہا تو گلہ اور بھی یہ دونوں لفظ بیکار اور حشو قبیح ٹھہرتے ہیں۔ جو کہ اگر حقیقی معنی لئے جائیں اور دوسرے مصرعہ کو مشابہ مان لیں تو نفی شوق ہوتی ہے مگر پہلا مصرعہ شوق مفرط کے وجود کو ثابت کر رہا ہے ہم کہتا ہے کہ "دل جو اسقدر وسیع ہے (دل کی وسعت معروف ہے بلحاظ گنجایش کے نہ بلحاظ جسامت یا ابعاد) کہ اس میں دنیا و مافیہا سما سکتے ہیں اسکی وسعت کو بھی میرا شوق تنگی سے تعبیر کر کے گلہ مند ہو رہا ہے حالانکہ دریا کا اضطراب و طوفان ایک موتی میں جو دل کے مقابلہ میں نہایت کم حوصلہ اور چھوٹی سی شے ہے گم ہو جاتا ہے"!

یہ خیال بجنسہ مرزا بیدل کے پاس سے لیا گیا ہے وہ فرماتے ہیں ؎

دل آسودہ ما شور امکاں نفس دارد گہر دزدیدہ است اینجا عنان موج دریا را

لیکن غالب نے جو معنوی فرق پیدا کیا وہ قابل داد ہے۔ فارسی کے شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے مصرع کی توضیح کر رہا ہے اور تمثیل کے حکم میں داخل ہے۔ غالب نے اول میں بھی کہکر طنز یا استعجاب کا پہلو پیدا کیا ہے بیدل اپنے انتہائی اطمینان نفس کا اظہار کر رہے ہیں اور غالب اپنے انتہائی بے اطمینانی و بیقراری کے شاکی ہیں یہ ایک لفظ بھی کا کرشمہ ہے جسنے اسقدر توافق لفظی کے باوجود معانی میں اتنی بعید مغایرت پیدا کر دی ہے۔ یہ نکتہ اہل کلام کیلئے قابل غور ہے۔ حضرت شوکت نے پہلے مصرعہ کی شرح تو ہمارے موافق مراد کی ہے لیکن دوسرے مصرعہ کو مشابہ سمجھکر یوں کہہ گزرے ہیں کہ "شوق عاشق اتنا وسیع ہے کہ دل اسقدر وسعت پر بھی تنگی کا شاکی ہو کر مضطرب ہے پس اضطراب دریا گویا گوہر میں محو ہو گیا ہے یعنے سما گیا ہے" اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ معنے شعر کی ترکیب لفظی سے کسقدر مغایر ہوا اسلئے کہ جب شوق کو دل میں جگہ ملگئی تو پھر گلہ کس بات کا رہا یہی مراد اگر غالب نے بھی لی ہے تو شعر بیمعنی اور شاعر قسم کا مرتکب ہوتا ہے۔

(۳۹)

قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا

خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

شرح ہے: گرنگی بستگی و تنگی و ضبط نفس حیرت کے لوازم ہیں، اور جب اہر ا قطرہ مے میں حیرت کی

سبب سے یہہ صفات پیدا ہوے تو وہ موتی بن گیا اور پیالے میں جو لکیر تھی وہ عقد مروارید ہو گئی
اس بیان سے فقط حیرت کی شگرف کاری کا اظہار مقصود ہے لیکن یہہ حیرت حسن ساقی کو دیکھ کر پیدا ہوی ہے
یہہ مضمون مصنف کے ذہن میں رہگیا۔ شارح نے شعر کو حل تو فرما دیا کہ (حسن ساقی کو دیکھکر) دہر قطرہ مے
ایسا حیرت زدہ ہوا کہ بستگی حاصل کر کے گوہر بنا جس سے خط ساغر سلک مروارید ہو گیا اور یہہ بھی فرما دیا کہ
حسن ساقی کو دیکھکر یہہ حیرت پیدا ہوی یہہ مضمون مصنف کے ذہن میں رہگیا لیکن یہہ نہ فرمایا کہ نفس پروری سے
ضبط نفس کے معنے کیونکر نکلے تھ اور جب نفس پروری ضبط نفس کے معنوں میں نہیں ہے تو پھر جو کچھ مطلب
شارح علامہ نے بیان فرمایا یہہ کہاں سے نکلا؟ علاوہ بریں قطرہ مے سے ہر قطرہ مے کس قاعدہ نحوی یا صرفی
کے تحت مراد لی گئی؟ جبتک یہہ اعتراضات مرتفع نہوں اس عبارت زایدہ کو پڑھا کر بھی جو شارح نے بڑھائی
ہے شعر با معنی نہیں کہا جا سکتا۔ ہے یہہ کہ شاعر نے نفس پروری بسکون دوم سے نفس پروری بہ تحریک دوم
دھوکا کھایا اور فاحش غلطی کی۔

ضامن کنتوری

ڈاکٹر ضیاء الدین کے آئندہ ارادے

دہلی ۱۴ اپریل ڈاکٹر ضیاء الدین نے ایک اخبار کے نمایندہ سے بیان کیا کہ میں مئی کے
وسط میں یورپ کو جاؤنگا اور وہاں جا کر دو کتابیں لکھوں گا یا ممالک یورپ کے طریقہ ہائے تعلیم کا مطالعہ کرونگا
اور اندازہ کروں گا کہ جو تبدیلیاں وہاں گذشتہ چند سال میں ہوئی ہیں وہ ہندوستان کیلئے موزوں ہیں یا نہیں۔

آپ نے یہہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ہندوستان کی اہم ترین ضرورت یہہ ہو کہ ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا جائے
اور اس کیلئے میں انگلستان میں کوشش کرونگا۔ ۱۹۰۲ء کے کمیشن کی سفارشات کو آپ نے غیر مکمل ظاہر کیا۔ کیونکہ
اسکی سفارشات ابتدائی اور ثانوی تعلیم تک محدود تھیں۔ اسطرح کلکتہ یونیورسٹی کے کمیشن کی سفارشات بھی آپکی
نظر میں غیر موقع ہیں کیونکہ اس نے جو کچھ لکھا یونیورسٹی کی ابتدائی تعلیم کے متعلق لکھا۔ آپکے خیال میں ہندوستان
کو ایسے کمیشن کی ضرورت ہے جو تعلیم کے تمام شعبوں پر من حیث المجموع نظر ڈالے۔

ہملٹ سے دو دو باتیں

ازالم در سینہ خوں گشتہ نشتر داشتی
زیر خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتی

منگل کو آدھی رات گئے، جب تھیٹر سے نکلا ہوں تو اے جوان مرگ ہملٹ، غم نصیب شہزادے! اُبھر سے شوک پیارے اور سُریلے بول خود بخود میری زبان سے بھی نکلے جاتے تھے۔

"خدا حافظ' پیارے شہزادے! فرشتوں کی پرواز الہی تجھے چین کی لوری سنائے"

ایمان کی یہہ ہے ہم تجھ سے یوں ہی رخصت ہونا چاہیے بھی تھا۔ کیونکہ تیری سنگت سے وہ رات عجب مزے میں گذری! واقعی، اے شہزادہ ہملٹ! تو بڑا پیارا پیارا شہزادہ ہے۔ تو ایک حسین ہے مگر غمگین یا ایسا حسین جس کا غم کسی خوبصورت سوگوار کے بکھرے بالوں اور ننگی کافوری کلائیوں سے بھی زیادہ مارے ڈالتا ہے! تو سب کچھ جانتا ہے، مگر کر کچھ نہیں سکتا، تجھ پر رشک بھی آتا ہے اور ترس بھی۔ تو ہم سب جیتے جاگتو چلتے پھرتوں سے بُرا بھی ہے اور بھلا بھی۔ تو ہمارے لئے تو سب کچھ ہے، مگر اپنے لئے کچھ بھی نہیں!

فطرتِ انسانی کی تو اک ایسی انوکھی تصویر ہے جس میں اسرار قدرت کے بے گنتی رنگ بھرے پڑے ہیں۔ یہہ سچ ہے، تجھ میں گوشت پوست والے آدمیوں کی طرح جان کی گرمائی نہیں نہ سہی، پھر بھی تو تو ایک انسان ہے! نوع انسان ہے! عطر انسانیت ہے!! تیرا مصنف ہستی شیکسپیر ہو یا لارڈ ڈربی، ایک آدمی تھی جسکے پیچھے قدرت کا انجان مگر زبردست ہاتھ کام کر گیا۔ یہی وجہ ہے ہم جو خود شیکسپیر آج تجھ سے زندہ ہے۔ آفتاب تخلیق کی مبارک کرن! صدیاں گزر گئیں مگر زمانہ تجھ پر خاک نہ ڈال سکا، تو رہتی دنیا چمکیگا!

اچھا، یہہ بات بھی نہیں کہ تیری باتوں کا ایک میں ہی رسیا ہوں، میں نے ہی ان کا مزا لوٹا، نہیں! یقین مان کئی اور منچلے بھی وہاں اس میں میرے شریک تھے۔ تیری باتیں ہی کچھ اس بلا کی موہنی ہوتی ہیں کہ جب تک ہم اپنا دل و دماغ ان سے مسحور نہ کرلیں تجھے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہی جو دیکھ لے! آج تین دن سے میں ہوں اور تیرا پیارا خیال اور پھر سے

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا۔
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میرے شہزادے! جونہی میں نے تجھے دیکھا تو ایسا معلوم ہوا اک عجیب اداس خوشی جی موہ لیتی ہے۔ اور سچ کہتا ہوں وہ ایسی خوشی ہے جو ہماری ہی ہی ہا ہا سے کہیں بڑی چیز ہے۔ آ، میں تجھے ایک اور بات سناؤں۔ دیکھیو تھیٹر میں بہت سے تیری باتوں سے ناک بھوں چڑھاتے بھی معلوم دیتے تھے۔ مگر خیر، ہمیں ان سے نہ تو زیادہ شکایت ہی ہونی چاہیے اور نہ حیرت۔ کیونکہ وہاں تو اکثر "چودھویں صدی" کے رنگیلے جمع تھے۔ تیرے پاس جب آجکل کے قیمتی کپڑے نہ تھے۔ تو تماشہ بینی کا رسیا نہ تھا کسی "گلبن نزاکت" کا بھیجا ہوا پیارا پیارا پھول تیرے زیب سینہ نہ تھا، تو بھلا ایسی صورت میں وہ خوش عیش تجھ سے کیونکر جز بز نہ ہوتے۔ اسی لئے تیری چوٹی کی باتیں بھی انھیں مزہ نہ دے سکیں۔ آہ! انھیں کیونکر بتایئے کہ تیری باتیں فیشن ایبل نہیں بلکہ تیرا اسوا تو انسان کی احوالی سرگذشت ہے!

تیرا سب سے بڑا اور ناقابلِ معافی گناہ یہہ ہے کہ تو خواہ مخواہ بچارگی بتا ڈھا دیتا ہے پھر بھی وہیں اور اسی وقت چند ایسے دردمند موجود تھے، جو تیری باتوں سے کلپ کلپ گئے۔ کیونکہ تو نے ان کو اپنی بپتا کیا سنائی گویا خود انکی بپتائیں انھیں سنادیں! یہی وجہ ہے کہ وہ تجھے دنیا کی اور تمام تجھ جیسی مخلوق سے زیادہ سراہتے اور پیار کرتے ہیں۔ زہے نصیب! کہ اس رات میں بھی ایک ایسی ہی برگزیدہ ہستی کے پہلو بہ پہلو تھا۔ یہہ خود ایک شاعر ہیں۔ اور اسی لئے میرے عزیز شہزادے! تجھے رسے سائیں کیطرح جانتے پہچانتے ہیں یقین ہے، میں بھی تجھے سمجھ لیتا ہوں، کیونکہ تازہ تازہ سمندر کی سیر کرکے چلا آرہا ہوں۔ مگر کہیں یہہ نہ سمجھ لینا، اس سے میں نے تیرے دو سمندر پار ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نہیں یہہ تو صرف لفظوں کا کھیل ہے جس سے تو بے نیاز ہے۔

کہنا صرف یہہ مقصود ہے، میں تجھے اس لئے سمجھ لیتا ہوں کہ چین اور شانتی کے دو چھینٹے پر فضا مقامات میں گزارے ہیں۔ جب سے طبیعت ساوی بنکر پچی! سمندر، اہم اور گہری چیزوں تک رسا ہونے لگی ہے ورنہ جاڑے میں تو پیرس والے دل لگی آراستہ پیراستہ اور پربہار چیزوں پر بات کی بات میں رال ٹپکانے لگتے ہیں۔ حالانکہ انسان کا احساس دیہاتوں کی اننت گلگشت اور ساحل و سمندر کی نفیس فضاؤں سے نکھرتا اور نازک بنتا ہے۔ اور جب ہم وہاں سے لوٹتے ہیں۔ تب کہیں شیکسپیر کی خداداد اور نادر ذہانت سے رسم وراہ کے قابل بنتے ہیں۔ اسلئے تو اے ہملٹ! میں تجھے خوش آمدید کہتا ہوں! اور یہی وجہ ہے، جو تیرے خیالات ایک طرف میرے نوکِ زبان ہیں تو دوسری طرف انھوں نے مجھے یاس ہراس اور شاعری میں گھیر رکھا ہے!

اچھا! تو نے یہہ بھی دیکھا، تیری اس اُداسی کی لم کی نسبت کیسی کیسی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ کہتے ہیں، تیری یہہ اُداسی اتنی گہری ہے کہ گھر کا ڈراؤنا سا ڈراونا کھ درو بھی اسے اتنا گہرا نہیں بنا سکتا۔ ایک بڑے جید پولیٹیکل اکنومسٹ کا تو یہہ کہنا ہے کہ یہہ اداسی ایک پولیٹیکل اکنومسٹ کا ساہی ملال ہے جنھوں نے ثبوت میں ایک اُڑنگل بھی لکھ مارا۔ فرماتے ہیں: سنہ ۱۸۱۵ئہ کے اچانک ابتلا کے بعد ان کا اور ان کے دوست کا بھی یہی حال ہوگیا تھا اگر شہزادہ ہملٹ! غاصب کلاڈیسن کے ہاتھوں ڈنمارک کی جو تباہ حالی ہوئی، اسکے واسطے حق یہہ ہے، تو نے اِن دونوں سے زیادہ کڑی جھیلی!

یہہ سچ ہے، تیرا سارا تردد ملک کی قسمت سے وابستہ تھا۔ چنانچہ فورٹن براس کے ان الفاظ کو جنھیں اسنے چار کپتانوں کو تیری لاش کے اسٹیج پر لے آنے کا حکم دیتے وقت منہ سے نکالا تھا، میں بجد سر رکھتا ہوں۔

"اگر ہملٹ جیتا رہتا تو بتاتا کہ بادشاہت یوں کیا کرتے ہیں"

مگر میں نہیں سمجھتا تیرا ملال اس پولیٹیکل اکنومسٹ کا ساہی تھا۔ یقیناً یہہ اُس سے شریف تر اور نسبتاً معقول تھا۔ جسے مقدر کی وقت نظر نے صبح ازل کی روشنی میں تجھ میں پھونک دیا تھا۔ چنانچہ ایک ٹارک رہی کیا دنیا، تجھے دکھیاری نظر آنے لگی تجھے کسی چیز پر بھروسہ نہ رہا تھا! اس میں کسی کو شبہ ہو تو لاؤ اسے تیرے موت سے سرو ہونے والے ہونٹوں کی لطیف گرو لدو زدُعا سنا دیں!

اُسے اللہ! میرے شیو کو ـــــ آہ! کیسا دلربا نام ہے! میرے بعد زندہ سلامت رکھیو۔ میرے شیو! کبھی ہماری یاد آجائے تو دیکھنا، ذرا کی فرشتہ والی سے منہہ موڑ کر اس دکھیاری دھرتی پر ہمارا افسانہ بھی سُنا کر دل دکھا لینا!"

یہہ تیرے واحد الفاظ تھے اور اس شخص سے مخاطب ہو کر کہے گئے تھے، جسکے خاندان پر تیری طرح جرائم کا زہر نہیں چیڑا تھا۔ وہ تیری طرح قاتل نہ تھا۔ بلکہ ایک آزاد مرد، سمجھدار اور باوضع طبیعت کا مالک تھا۔ اس دکھیاری فضائیں کوئی خوش و خرم ہو سکتا تھا، تو وہ ایک خوش و خرم انسان تھا۔ مگر اے شہزادہ ہملٹ! تو کسی کو ایسا نہیں جانتا تھا۔ تیرا یہہ عقیدہ تھا کہ دنیا میں چوطرف برائی پھیلی ہوئی ہے۔ اور اصل بات یہہ ہے، تیری آنکھوں پر برائی کی کچھ ایسی عینک چڑھ گئی تھی جس نے ہر چیز میں تجھے برائی ہی برائی نظر آتی تھی۔ اسمیں شک نہیں، تیری قسمت میں ہی یہہ لکھا تھا، تو یوں یاس کی زندگی بسر کرے اور دکھ درد سہتا رخصت ہو جائے مگر یہہ تو نے بھی اپنے آپ کو اس کیلئے بالکل تیار بنا لیا تھا۔ یہی چیز ہے، جس سے دنیا تجھے اتنا سراہتی ہے۔ تو اس لئے پیدا ہوا تھا، دکھ کا مزہ چکھے۔ چنانچہ اس ضیافت پر جیسی تیری خاطر کی گئی ویسا دیسا تو نے اس دکھ کا مزہ لوٹا۔ اور بڑی خندہ پیشانی سے اُسے جھیل لیا۔ سمجھ میں نہیں آتا اُسے کیسا حُسنِ ذوق کہوں؟ واقعی، تو ایک درد کا رسیا ہے!

شیکسپیر کی زبردست ہستی نے تجھے اسی رنگ میں پیدا کیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں، تیری پیدائش کے وقت وہ بمشکل رجائی (Optimist) رہا ہوگا۔ ہے بھی یوں سنہ ۱۶۰۱ء سے سنہ ۱۶۱۰ عیسوی تک اسکے ساحر ہاتھوں نے جو جو چیزیں بنائی ہیں وہ یا تو دکھ درد یا مار دھاڑ کی پرچھائیوں کا ایک خاصا بڑا جھرمٹ ہیں۔ کہیں دیکھنے لگا کہ ڈسڈیمونا بدذات آئگو کے ہاتھوں تباہ ہو رہی ہے۔ اور لیڈی میکبتھ کے نازک ہاتھ باپ جیسے بزرگ بادشاہ کے خون میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ کہیں بچارے کو رڈیلیا، ٹمن آف ایتھنز اور شیکسپیر کے چاہیتے یعنی تم ہو!

اب لو یہہ لکھ رہا ہوں، جرمنی کی تیری ایک پُرانی تصویر سامنے ہے۔ جس میں بمشکل میں تجھے پہچان سکا۔ یہہ تو اس زمانہ کی "یادِ ایام" معلوم ہوتی ہے۔ جب سنہ ۱۹۱۳ء میں تو برلن کے تھیٹر میں نظر پڑا تھا۔ لیکن اس میں تو وہ

ٹھیٹ ماتمی لباس پہنے ہوئے نہیں ہے۔ جس کا ذکر تیری عیار والدہ نے کیا ہے یعنی یہی کہ نہ وہ بالابر ہے نہ موزے ہیں، نہ وہ ٹوپی ہی ہے۔ بلکہ اٹھارویں صدی عیسوی میں تو تو برلن کے اچھے لوگوں کے سامنے ایک ایسے پہناوے میں آیا تھا، جو ہمیں آج بالکل عجیب غریب معلوم دیگا۔ چنانچہ تصویر سے پتہ چلتا ہے کہ تو فرانس کے تازہ ترین فیشن میں تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے پٹیاں جمی ہوئی ہیں، جن سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی ہونگی۔ زردوزی کالر، ساٹن کی گھٹنا برجس، ریشمی موزے، بکسوے دار بوٹ اور دو بار یوں کا سا چھوٹا سا بالابر، مختصر یہہ کہ سر سے پاؤں تک ورتیلز کے مصاحبین کا ماتمی لباس تھا۔ لو اور سنو: تیسری ہنری چہارم والی ٹوپی تو میں بھول ہی گیا، جو اسٹیٹ جنرلوں کے زمانے کے شرفا کی یاد دلاتی ہے۔ غرض یوں پہن اوڑھ کر خیر سے تو بھولی بھالی اوفیلیا کے نازنین گلے کا ہار بن گیا! لیکن دفعتہً رنگ بدلا، اور خوبصورت اوفیلیا کے ارمان بھرے سینہ کو تو نے دور کر دیا۔ وہی معصوم اوفیلیا جو اصل یہہ ہے، اپنے گھیردار گوں اور پرانی وضع کی پروں دار اونچی ٹوپیاں میں گو مارے ڈالتی تھی، لیکن بحیثیت عورت وہ تیری دغاباز والدہ کی یاد تازہ کر دیتی تھی! تیرے دوسرے ساتھی بھی اپنے اپنے مرتبہ کے موافق کپڑے لتے پہنے ہوئے اگوبزا گا اور پھندنا والی طرحداری میں تیرے ساتھ موجود تھے۔ جہاں تیری لوئی شانز دہم والی خوبصورت کرسی خالی ہے۔ اور اسکے پچھلے گل بوٹے دکھائی دے رہے ہیں۔ اپنے چچا یعنی بادشاہ وقت کے چہرے پر تو نے نظریں گڑھو دیں۔ اور پیٹ کے بل رینگ رینگ کر اسکے اعتراف گناہ اور پشیمانی کا رنگ دیکھنا شروع کیا۔ کیونکہ اسی سے بدلہ لینے کیلئے تو تجھے ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی بڑے ٹھاٹھ سے ہنری چہارم والی شاندار ٹوپی ڈاٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ تجھے شاید خیال ہوگا۔ میں ان باتوں سے تیری کھلی اڑا کر اپنے زمانے کے لباس اور زر زیور کی شیخی بگھارنا چاہتا ہوں، مگر نہیں یہہ غلطی ہے۔ اگر میرے پاس والی تصویر کیطرح تیرا پہناوا نہیں ہے تو نہ سہی، یقین جان، مجھے اسکا مطلق قلق نہیں۔ میں تو ایسے باتوں سے کوسوں دور رہتا ہوں۔ اور تیرے موجودہ پہناوے کو دل سے چاہتا ہوں۔ سچ یہہ ہے کہ لباس تیرے نزدیک بیکار سی چیز ہے۔ تیرے جو جی میں آئے پہن لے۔ اگر پوشاک سندر ہی تو ضرور وہ تجھے سج کر رہے گی۔ تو تو ہر زمانے اور ہر ملک کا باشندہ ہے! تیری روح ہماری روحوں کی ہم عُمر ہے، تو ہمیں میں کا ایک ہے اور ہماری ہی طرح دنیا کی

کلفت میں گرفتار، تیری باتوں اور طور طریق پر حرف گیری کیجاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ تیری باتیں نامعقول ہوتی ہیں۔ اس لئے تجھ سی بعید از عقل ہستی کو کیونکر سمجھا بوجھا جائے۔ کیونکہ کبھی تو تو از منہ وسطی کے ایک پاپ کی طرح سوچنے لگتا ہے۔ اور کبھی دم کے دم میں دور جدید کا فاضل بن بیٹھتا ہے۔ تیرا دل و دماغ ایک طرف فلسفہ میں رچا ہوا ہے تو دوسری طرف کچھ بھی نہیں۔ تو جھوٹی باتوں کا مجسم خطرہ نظر آتا ہے۔ اسلئے تیری زندگی ایک مسلسل جھوٹ ہے۔ یہہ تو صاف ہے کہ تو ڈھلمل یقین ہے لیکن ساتھ ہی بعض نقاد تجھے صاحب الرائے بھی کہہ اٹھتے ہیں جو ناقابل تردید ہے۔ آخر میں تو اے شہزادہ ہملٹ! انھوں نے کہدیا کہ بجائے انسان کے تو خیالات اور اضداد کا مجموعہ ہے۔ مگر ان عقل کے ہیٹوں سے کون کہے کہ یہی تو تیری انسانیت کی نشانی ہے۔ تو چست بھی ہے سست بھی سمجھدار بھی ہے، سادہ لوح بھی۔ مہربان بھی ہے قہرمان بھی۔ تو ایک چیز میں یقین بھی کرتا اور شک بھی۔ تو سیانہ بھی ہے، دیوانہ بھی۔ خلاصہ یہہ ہے تجھ میں جان کی گرانی ہے کوئی بتائے تو سہی ہم میں سے کون ایسا ہے۔ جو تجھ جیسا نہیں؟ کون ایسا ہے جس کا قول و فعل کبھی کچھ اور کبھی کچھ نہیں۔ اسلئے کون ایسا کٹر ہوگا، جیسے ترس، دردمندی، خوف و تعریف کے ساتھ یہہ کہتے بن نہ آئے گی کہ :۔

خدا حافظ، پیارے شہزادے! فرشتوں کی پرواز تجھے چین کی لوری سنائے۔

(ماخوذ) سید وزیر حسن

ہمارے بھائی مولوی عبدالستار صاحب بی۔ اے، خوشی کی بات ہے کہ رکن دارالترجمہ مقرر ہوئے ہیں کام تو ایک مدت سے کر رہے تھے لیکن تقرر کا تصفیہ اب ہوا ہے۔ وہ ہماری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ دعوت کے معاملہ میں وہ اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالرزاق صاحب کی ایک نہ سنیں، اور دوستوں کی خاطر سستی فاتحہ کا انتظام کریں۔

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ برادرم مسٹر انوار الہدیٰ سب انسپکٹر پولیس کا تبادلہ تھانہ مسافر خانہ سے تھانہ بیرپور ضلع سلطانپور کا ہوگیا ہے۔

ہمارا کل

مسلم علی گڈھ یونیورسٹی کا جلسہ

علی گڑھ (۱۵ اپریل دیر رسیدہ) علیگڈھ یونیورسٹی کورٹ کا ایک تاریخی جلسہ بند کمرے میں منعقد کیا گیا معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۶۵ء

سر عزیز اللہ خاں نائب امیر جامعہ نے صدارت کرتے ہوئے استدعا کی کہ اعتماد و عدم اعتماد کی تحریک پر سب سے

پہلے بحث کیجائے سر عبدالقادر کو بالاتفاق صدنشین بنایا گیا۔

سر سر غلام محمد نے تحریک کی کہ نائب امیر جامعہ کو چاہیے کہ وہ اپنا استعفا پیش کر دیں تاکہ تحقیقاتی

کمیٹی کے مجوزہ اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے میں سہولت ہو۔

دوران بحث راجہ صاحب محمود آباد نے تجویز پیش کی کہ اس تحریک واپس لے لیا جائے اور اسکے بعد مسٹر

ولایت احمد سے استدعا کی کہ نائب امیر جامعہ کی خدمات کے اعتراف سے متعلق کوئی تحریک نہ پیش کیجائے۔

اس تحریک کو منظور کیا گیا اور نائب امیر جامعہ پھر اپنی نشست پر آ بیٹھے۔ بعد ازاں ڈاکٹر ضیاء الدین کا

استعفا منظور کر لیا اور نائب امیر جامعہ نے پرو وائس چانسلر کی خدمات جو انھوں نے یونیورسٹی کی خاطر انجام دیں تعریف کی

اسکے بعد جسٹس سلیمان نے ایک تحریک پیش کی کہ تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات کو منظور ہو تحریک منظور کیجائے

چنانچہ یہ تحریک منظور کی گئی۔ اور ایک ماہر تعلیم کو پرو وائس چانسلر کی جگہ میں مقرر کرنے کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی

اور ایک کمیٹی اس غرض سے قائم کیگئی کہ رپورٹ تحقیقات کی نسبت مجلس انتظامی کی سفارشات کی نسبت تجویز پیش کرے

آج کی حاضرین جلسہ میں منجملہ دیگر اصحاب کے نواب صاحب چھتاری نواب محمد یوسف جسٹس نعمت اللہ بیگ اور محمد یعقوب بھی تھے

علی گڑھ ۴ مئی۔ وائس چانسلر علیگڈھ یونیورسٹی اعلان کرتے ہیں کہ مسٹر ولنسر کی خدمات ۱۲ ماہ کیلئے حاصل کی گئی ہیں۔ غرض یہہ ہے کہ استفساری کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں مناسب تغیرات عمل میں لائے جائیں۔ وائس چانسلر نے مجلس انتظامی سے حاصل شدہ اختیارات کی رو سے عملہ کے سینئر ممبر ایم ایم شریف کو عارضی طور پر وائس چانسلر مقرر کیا اور یہہ کہ تین سال کیلئے ایک خاص پرو وائس چانسلر کے انتخاب کا کام ایک کمیٹی کے سپرد کیا جس کے ارکین والی بھوپال وائس چانسلر سر عبدالرحیم مسٹر جسٹس سلیمان سر ابراہیم رحمت اللہ مہاراجہ محمود آباد سر عبدالقادر ہیں۔ اجلاس آئندہ کے پہلے پہلے امید کیجاتی ہے کہ اس افسر کا تقرر ہو جائے گا۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ متذکرہ بالا کمیٹی کی تحریک پر پرو وائس چانسلر کی خدمت کیلئے عارضی طور پر مسٹر ایم ایم شریف کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ اپنی جگہہ پر یہہ انتخاب کیسا ہی درست کیوں نہ خیال کیا جائے، لیکن بہر صورت نواب مسعود جنگ بہادر کے لئے سعی نہایت موزوں ہوگی۔ سر سید کے پوتے اور مسٹر محمود کے بیٹے ہونے کی بنا پر بھی اس خدمت کے پیش کئے جانے کا خیال بجائے خود مناسب ہے، اور پھر یہ امر واقعہ ہے کہ ممالک محروسہ سرکار آصفیہ کے ایک مفید سررشتہ کو نواب مسعود جنگ ایک مدت تک کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے ہیں، اور امید ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر کے فرائض بھی باحسن الوجوہ انجام دے سکیں گے۔

اولڈبوائز

۱ ۔ گزشتہ سال میں ہم نے کمیٹی مسجد نظامیہ کے بعض اُن ارکان کا نام لیا تھا، جو علیگڈھ کے فرزند ہیں۔ اب ہمیں برادر مکرم نواب فخر یار جنگ بہادر کی ایک مطبوعہ تحریر سے معلوم ہوا کہ کمیٹی کے ارکان میں جن ناموں کا اضافہ ہوا ہے اُن میں ہمارے مندرجہ ذیل بھائی بھی شریک ہیں :۔

(۱) کرنل عظمت اللہ سردار بہادر (۲) مولوی اظہر حسن صاحب (۳) نواب صمد یار جنگ بہادر (۴) مولوی سید محی الدین محمود صاحب (۵) مولوی سید محمد تقی صاحب (۶) مولوی مظہر حسین صاحب (۷) مولوی محمد یونس صاحب (۸) مولوی سید محی الدین صاحب (۹) مولوی سید محمد اعظم صاحب (۱۰) مولوی سید محمد حسن بلگرامی صاحب (۱۱) نواب ناظر یار جنگ بہادر (۱۲) نواب بشیر یار جنگ بہادر (ہمارے آنریری اولڈبوائے نواب صدر یار جنگ بہادر کا نام بھی اس فہرست میں شریک ہے حضور پرنور کا شاہانہ عطیہ (پانچ لاکھ سکہ انگریزی) داخل بنک ہوچکا ہے۔ دوسرے باخبر لوگوں میں ہمیں برادر مکرم نواب محی الدین یار جنگ بہادر اور برادر عزیز میجر مرزا محسن بیگ صاحب کے نام بھی نظر آتے ہیں۔

۲ ۔ حال ہی میں حضور پرنور نے بعض جاگیرات واگزاشت فرمائی ہیں۔ اس غرض کیلئے تھوڑا عرصہ ہوا ایک کمیٹی زیر صدارت مسٹر ٹاسکو مقرر ہوئی تھی، اور دو ارکان میں سے منجملہ ایک ہمارے بھائی نواب صمد یار جنگ بہادر معتمد فوج بھی تھے۔

۳ ۔ مولوی شاہ نواز خاں صاحب مہتمم خفیہ پولیس کے ناظر ٹر پر مامور ہونے کے سلسلہ میں

جو تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں، ان میں بعض فرزندان علیگڈھ کا تبادلہ بھی بروئے عمل آیا ہے۔ مہتممی خفیہ پولیس پر ہمارے بھائی مولوی شاہ محمد خاں صاحب حیدرآباد آئے ہیں، اور انکی معاونت میں برادر عزیز مولوی سید علمدار حسین صاحب کو دیا گیا ہے، جو اب تک ضلع اورنگ آباد میں مددگار مہتمم کوتوالی تھے۔ یہہ بھی اتفاق ہے کہ ان دونوں کی جگہ جو حضرات مامور کئے گئے ہیں وہ بھی ہمارے کالج کے فرزند ہیں۔ مسٹر خاں کی جگہ آصف آباد پر مولوی فریدالدین صاحب کا تبادلہ ورنگل ہی سے ہوا ہے۔ اور نظام آباد سے مسٹر تاج عالم، سید علمدار حسین صاحب کی جگہ اورنگ آباد گئے ہیں حیدرآباد آنیوالے بھائی اچھے نعمت خانوں سے ہشیار رہیں۔ کہ ایک خضر صورت بزرگ انکے ڈائننگ روم پر چھاپا مارنے کی فکر میں ہیں۔ یہہ بزرگوار تنہا نہونگے، بلکہ اپنی ذریات کو ساتھ لائیں گے۔

۴۔ برادرم مسٹر احمدالدین عالم پور ضلع رائچور سے تحریر فرماتے ہیں کہ پرچے جسقدر پہنچے وہ پہنچے، اور جو کوئی آئندہ پہنچے گا وہ بطور تبرک سرو چشم پر رکھا جائے گا۔ خداوند عالم اس کی اشاعت وارادت میں روزافزوں ترقی عطا فرمائے۔ ایک پرچہ کے "یاد ایام" کے مضمون نے دل ہلادیا، گویا اپنی قدیم زندگی وزندہ دلی کے سینما کا ایک فلم تھا، جو نظروں کے سامنے آیا اور چلا گیا" ہم اپنے بھائی سے دریافت کرتے ہیں کہ آپکو کس نے منع کیا ہے کہ اپنے "یاد ایام" یا اور کسی مضمون پر خامہ فرسائی نہیں فرماتے۔

۵۔ بہت سے لوگ یہہ معلوم کرکے خوش ہونگے کہ برادر مکرم مولوی اصغر علی خاں صاحب ہوگا معتمد باب حکومت کی آمدنی میں سو روپیہ ماہانہ الونس کا اضافہ ہوگیا ہے۔ یہہ بیچارے خدا معلوم کتنی مدت سے پیٹ کے مارے ہیں، اور کوئی باورچی ان کی نظروں میں نہیں سماتا۔ شاید چراغ تلے اندھیرے کی مثل اس موقعہ پر صادق آتی ہے کہ انہیں اپنے معتمد مولوی سید محمد مہدی صاحب کے اٹاوہ والے باورچی کی خبر نہیں، جو حیدرآباد میں بیٹھ کر اٹاوہ کی نانیں کھلایا کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ترقی یاب بھائی کے احباب اسپر قانع ہوجائیں گے۔ رہے ہم سو ہم نے یہہ تصفیہ کرلیا ہے کہ اُن کے پاس مدراس سے شکوں کا پارسل آئے، اور ہم اُسے راہ ہی میں اُچک لیں۔

۶۔ کہتے ہیں کہ ہمارے برادر عزیز مسٹر کریم احمد خاں کو پڑھانے کی نوکری کے بعد اب مہتمم تعلیمات

ضلع ناندیڑ بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے ان بھائی پر حاجی فخر یار جنگ کا سایہ پڑ گیا ہے اور الحمد للہ کہ گھر بیٹھے حج کا ثواب حاصل کر لیا کرتے ہیں۔

۷۔ حضور پر نور خلد اللہ ملکہٗ نے اس مرتبہ شہزادگان بلند اقبال کو شیر کے شکار کی اجازت عطا فرمائی، اور اس کام کے سلسلہ میں اعلیٰ پیمانہ پر انتظامات بروئے عمل آنے لگے تو اپنے اہتمام اور کارکنوں کی ہمنگواری کا شرف و افتخار چند اولڈ بوائز کو بھی عطا فرمایا گیا۔ برادرم مولوی فرید الدین صاحب کے سپرد شکار گاہ کے حفاظتی انتظامات تھے، اور عزیزی سید فائق حسین کی نگرانی میں شاہانہ کیمپ کے آرائشی نقشی دونوں پرانے تجربہ کار تھے، اسلئے اپنے اپنے انتظامات کو ایسے اچھے طریقہ پر انجام دیا کہ شہزادگان والا تبار نے اظہار خوشنودی فرمایا اور اشاف کے تمام اہل بصیرت خوبی کار کے قائل ہو گئے۔ "خرما" اور "ثواب" کی مثل ایسے ہی مواقع کیلئے موزوں ہوا کرتی ہے۔ حیدرآباد سے بھی علیگڈھ کے چند فوجی کمانڈر سے اپنے فرائض کے سلسلہ میں نرسم پیٹھ پہنچ گئے تھے، اسلئے سب نے اپنے اوقات فرصت کو جنگل میں منگل منانے پر صرف کیا۔ ہمارے ان بھائیوں میں کرنل عظمت اللہ سردار بہادر، میجر عبد الجبار خان، لفٹننٹ غلام معین الدین، لفٹننٹ نظام علی بیگ، اور لفٹننٹ قیصر مرزا بیگ کے نام شریک ہیں۔

۸۔ برادر مکرم و محترم مولوی عبد الحق صاحب عنقریب وظیفہ حسن خدمت حاصل کر کے خانہ نشین ہونے والے ہیں۔ ہمارے یہ بھائی صدر معلم مدرسہ آصفیہ کی حیثیت سے جب سے ارض دکن پر وارد ہوئے، اپنی زندگی کے دنوں کو نہایت استقلال کے ساتھ اچھا زمانہ آنے کے انتظار میں گزارتے رہے اس عرصہ میں، ہمیں یاد پڑتا ہے کہ نظامت کوتوالی، معتمد مالگزاری (صیغۂ ابکاری) میں سی ای اے حاصل کے بعد، معتمدی عدالت میں مترجم کی حیثیت سے داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن یہاں بھی کالے بادل مولوی صاحب کے سر پر منڈلانے شروع ہو گئے۔ بالآخر اس وقت کے ناظم تعلیمات ڈاکٹر نواب سراج یار جنگ بہادر نے ان کی جانب التفات فرمایا، اور سررشتہ تعلیمات میں لے لیا۔ ڈاکٹر الیم لطیفی کا زمانہ ان کے سازگار نہ ہوا لیکن نواب مسعود جنگ بہادر نے مولوی صاحب کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، اور مناسب موقعہ معاونت فرماتے رہے، تا اینکہ اب پرنسپل اورنگ آباد کالج سے مولوی عبد الحق صاحب وظیفہ حاصل

فرمارہے ہیں ۔ تاہم امید ہے کہ اپنی باقی زندگی کسی اچھے مقام پر بیٹھ کر مفید کام میں صرف فرمائینگے ۔
مولوی عبید الحق صاحب کی جگہ ہمارے برادر عزیز مولوی سجاد مرزا صاحب ایم ۔ اے کینٹ)
صدر مہتمم صوبہ گلبرگہ کا انتخاب ہوا ہے ۔ اسی سلسلہ میں دار العلوم ہائی اسکول کی پرنسپل کی خدمت
برادرم مولوی سید حسین صاحب بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی مدد مدرس پرچھنی کو ملی ہے ہم اپنے ان بھائیوں
کو دلی مبارکباد دیتے ہیں ۔

۱۰ ۔ باتباع فرمان خسروی سررشتہ کورٹ سے سمستان گدوال کی حکومت رانی صاحبہ کی سپرد
کی گئی تو لازمی طور پر اسکے انتظام کیلئے کسی عہدہ دار مال کا مقرر کیا جانا ضروری ہوا ۔ اس کام کیلئے
ہمارے برادر مکرم مولوی عزیز حسن صاحب کا تقرر منصب نظامت پر عمل میں آیا ۔ یہ بالکل حسن اتفاق
ہے کہ مددگار مستہتمال (صیغہ آبکاری) کی خدمت علی گڑھ کے ایک دوسرے فرزند مولوی قمر الدین صاحب
کے پاس نام ہوئی ہے ۔ ہم اپنے دونوں بھائیوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں ۔ برادری کیجانب سے
مٹھائی کا تقاضہ اس لئے نہیں کرتے کہ دونوں صاحب سیدھی سے خم کیجانب اشارہ کر دیں گے ۔

۱۱ ۔ برادرم مولوی میر تراب علی خاں صاحب رجسٹرار لیجسلیٹو کونسل کو حال میں درجہ کی ترقی
عطا ہوئی ہے ، اور پیسے بھی بڑھے ہیں ، اسلئے اپنے بہت سے بھائیوں کی جانب سے مبارکباد
پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ خداوند عالم ہماری بھاوج کو صحت کامل عطا فرمائے اور وہ اپنے میاں کی ترقی
سے خاطر خواہ بہرہ مند ہوں ۔

۱۲ ۔ ہمارے بھائیوں میں سے مسٹر سید خورشید حسن گورنمنٹ پریس کے سپرنٹنڈنٹ
مقرر ہوئے ہیں ، اور ان سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید جعفر حسن ، مددگار پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
قرار پائے ہیں ۔ خوشی کی دعوت دونوں بھائی ایک ساتھ نہیں دے سکتے ، اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہمار
کی لیچیوں کی تواضع کرکے جان بچائی جائے ۔ دعوت سے پہلے مبارکباد ہم ان دونوں کے والدین
کو دینا چاہتے ہیں ، خاص کر ماں کو جنھوں نے اپنی اولاد کی تربیت میں بڑا حصہ لیا ہے ۔

۱۳ ۔ یکے بعد دیگرے ہیں دو سانحوں کی اطلاع سے الم اندوز ہونے کا موقعہ ملا یقیناً تمام

اولڈ بوائز یہ معلوم کر کے افسوس کریں گے کہ برادرم سید عسکری حسن کے والد ماجد اور برادرم سید خورشید حسن کے برادر اکبر نواب جبار یار جنگ بہادر نے مرض سرطان سے حیدرآباد میں وفات پائی، اور دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے۔ دوسری اطلاع بھی ویسی ہی غمناک ہے۔ برادر عزیز مسٹر سرور حسن کے والد ماجد اور برادرم مسٹر خواجہ نور حسن کے برادر بزرگ مولوی خواجہ انور حسن صاحب نے بیت المقدس اور مصر کی راہ میں وفات پائی۔ دونوں بھائیوں کا یہ ہمراہ خدا میں ہوا تھا، مگر عالم غربت میں ایک بھائی دوسرے سے جدا ہو گیا۔ خداوند عالم دونوں مرنیوالوں کو جنت میں مراتب اعلیٰ عطا فرمائے۔ پسماندوں کو صبر جمیل۔

<<<<<<<<<<<<<<<<<<<<<

ہمیں یہ معلوم کر کے بیحد خوشی ہوئی کہ برادرم مولوی قاسم حسن صاحب کی دختر نیک اختر کی شادی برادر مکرم مولوی ابن حسن صاحب کے فرزند مسٹر ابو الحسن سے ۲۹۔ رمضان المبارک سنہ [illegible] کو دہلی میں ہوئی۔ نکاح کے موقعہ پر ڈاکٹر انصاری، بھائی محمد یعقوب (قوم)، آنریبل شاہ محمد زبیر، مسٹر آصف امام، مولوی محمد شفیع داؤدی اور دوسرے بہت سے معززین کا مجمع تھا۔ کیا عجب ہے ڈاکٹر صاحب دولہا کے باوا جان نے وہ وقت یاد دلایا ہو، جب وہ اسٹریچر پر پڑے ہوئے پیروں سے اپنے ملنے والوں کی مدارات میں مشغول تھے۔ بھائی قاسم ہم سے کہتے ہیں کہ ہنگولی آؤ، اور وحدت دولہا ہم کہتے ہیں کہ نواب نذیر جنگ بہادر نے جب سے اولڈ بوائے کے فرائض ہمارے سپرد فرمائے ہیں، ہم کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں۔ ان سے فرصت ہو اور رسالا اپنے پیروں کھڑا ہو جائے تو شاید ہمیں کہیں باہر جانے کا موقعہ مل سکے۔ بہرطور اس موقعہ کی مبارکباد دولہا دلہن اور لڑکے دونوں کے والدین قبول فرمائیں۔

اولڈ بوائے

اولڈ بوائے

Regd : No. M.2335

نشان ٹپہ سرکار آصفیہ ۵۸

جلد ۲ — نمبر ۹ و ۱۰

علیگڈھ اولڈ بوائز کا ادبی، تاریخی، تعلیمی اور تفریحی ماہنامہ

فہرست مضامین بابتہ ماہ مئی و جون ۱۹۲۸ء

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۱۰-۱۲ سلطانپورہ حیدرآباد دکن سے شائع کیا

قیمت سالانہ ۔ قیمت ششماہی

امداد باہمی

عطیہ مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر

شاہوں کی ساری شوکت امداد باہمی ہے
کہیے جسے رعیت امداد باہمی ہے

باہم ہیں چار عنصر اضداد سب ہیں یکجا
یہہ فطرتی ہدایت امداد باہمی ہے

ہمدرد ہیں جو باہم انسان کے سارے اعضا
یہہ مقتضائے فطرت امداد باہمی ہے

باہم حواس خمسہ رکھتے ہیں ربط کیسا
یہہ غائبانہ دولت امداد باہمی ہے

محنت کے بعد راحت راحت کے ساتھ دولت
دولت کی اک علامت امداد باہمی ہے

امداد بھائیوں کی امداد اپنی جانو
اور انکے ساتھ شرکت امداد باہمی ہے

اصلی ہماری ہمت اصلی ہماری جرأت
اللہ کی عنایت امداد باہمی ہے

گر ایک کی ہو محنت اور دوسرے کی دولت
یہہ بھی تو فی الحقیقت امداد باہمی ہے

اے شاد دل لگا کر سن تو مری نصیحت
دونوں جہاں کی دولت امداد باہمی ہے

ہمارے مخدوم نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال کا خیال ہے کہ میر انیس کی زبان وشاعری کا حُسن، اسوقت تک نہیں کھل سکتا، جبتک اُنکے خاندان، اور اُن کے بزرگوں کے حالات، اور اُن کی تعلیم وتربیت، اور پھر اُن کے مذاق کا کافی علم نہو۔ اس لحاظ سے موصوف نے، اس خانوادہ کا حال قلمبند کر دیا ہے۔ اپنے اس بیان کو انھوں نے، میر امامی ہروی سے شروع کر کے میر خلیق (والد بزرگوار میر انیس) پر ختم کیا ہے۔ امامی ہروی اس خاندان کے پہلے بزرگ ہیں، جو عہد شاہجہانی میں ہندوستان آئے، اور متوسلین شاہی میں داخل ہوے۔

میر نفیس (خلف میر انیس) کی زبان سے مرثیہ ؎

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری

ہیں، یہہ مصرعہ ؎

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

کہلوایا گیا تھا، جو بہت مشہور ہوا، اور اب تک زبان زد خاص وعام ہے۔ اس لحاظ سے ضرور ہوا کہ میر ضاحک کا مشرح طور پر ذکر کیا جائے، کہ وہ اِس خاندان میں اوّل مرثیہ گو ہیں، اور جنھیں یاد کر کے نفیس نے خود کو پانچواں مداح تسلیم کرایا ہے۔ اِس مداحی اور مرثیہ گوئی کا سلسلہ یوں نظر آتا ہے۔

میر ضاحک۔ میر حسن۔ میر خلیق۔ میر انیس۔ میر نفیس۔

ہمارے ادیب الملک (خیال) نے اس خاندان کی اول مرثیہ گو ضاحک کی بابت شاعری پر خاص نظر کی،
انکی تعلیم و تربیت کو بتایا، اور میر ضاحک صاحب کی مرثیہ گوئی پر تنقید کر کے بتایا کہ اس خاندان میں اردو کا ذوق ابتدا سے
رہا، اور شاعری کا مذاق صحیح اس خانوادہ کا آئین سمجھا گیا ہے نیز یہ کہ یہی اثرات و اسباب تھے جنہوں نے
آخر اس ملک و قوم میں ایسا باکمال شخص پیدا کر دیا جس کا مثل نہ پہلے کوئی تھا اور نہ آئندہ پیدا ہونے کی
امید ہے، یہ پہلا اور دوسرا مضمون کلکتہ کے مشہور رسالہ آفتاب میں شایع ہو چکا ہے۔

اس نادر سلسلہ میں میر حسن دوسرے بزرگوار ہیں، جن کی زبان و شاعری ہمیشہ ممتاز رہی، اور پھر
ان کی مرثیہ گوئی بھی سراہی گئی۔ اس لحاظ سے ضاحک کے بعد حسن کے حالات کا انکشاف بھی ہمارے
مخدوم کے قلم نے ایک ایسے طرز و انداز میں کر دیا جو مجتہدانہ ہے۔ انھوں نے حسن کے گھر کا حال روشن
کر کے انکی تعلیم و تربیت، اور علمیت و وقعت کو بھی جلوہ دیا، اور اس بیان کو انکی بے نظیر مثنوی سحر البیان
سے شروع کیا ہے۔ اس ذکر کا پہلا حصہ (یعنی مثنوی مذکور کی حمد) ابھی ہم تک پہنچا ہے، جسے ہم بذوق
و شوق اپنے رسالہ میں شایع کرتے ہیں۔ امید کہ ناظرین اولڈ بوائے اس کو بغور مطالعہ فرما کر اس کی
کما حقہ قدر فرمائیں گے۔

ادیب الملک حضرت خیال کے ادب و انشاء کے متعلق ہم کو کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ
مضمون پامال ہو چکا ہے، اور ملک کے مشہور ادیبوں نے انکی نسبت اپنا زور ختم کر دیا ہے لسان القوم
مولانا صفی لکھنوی کلکتہ کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

کون کلکتہ؟ نظر گاہ خیال خوش مقال
نثر اردو کو ہے جس پر ناز، وہ نازک خیال

ہماری گزارش اسوقت صرف اسقدر ہے کہ عالمانہ انداز، اور انکے جدید طرز استدلال پر
خاص نظر کیجائے جس کی نظیر ہماری ایشیائی زبانوں میں دکھائی نہیں دیتی، اور ہمارے اہل انشا پر
جس کی تقلید فرض ہے۔ — اولڈ بوائے

اردو کا مکتب دلی میں کھلا ہوا اور اب اس کا شہرہ دور دور پھیل رہا اور ہر طرف اسکے پرستار

پیدا ہو رہے تھے کہ اس (مکتب) کے لئے خدا نے ایک ایسا شاگرد بھیجا جو آگے چل کر اس اسکول کا پروفیسر اور اس زبان کا مسلم الثبوت استاد مانا گیا۔

میر ضاحک کے گھر کو حسن کے وجود سے ۱۱۴۰ھ میں شرف حاصل ہوا۔ یہہ زمانہ محمد شاہ اور دلّی کی اس رونق کا تھا جس کا سماں ایک عرصہ تک ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ حسن نے ہوش سنبھالتے ہی اُس اُجڑتی بزار (دلّی) سے وہ نقدِ جنس حاصل کیا جو واقعی انمول تھا اور جس کا ذخیرہ بھی زندگی کے ہر شعبہ و مدارج میں کام آتا اور نمایاں رہا۔

اُس عہد کے لوگوں کے طریقہ تعلیم و تربیت سے واقفیت کیلئے پُرانی بیاضوں اور یادداشتوں پر نظر کی ضرورت ہے جس پر غور کئے بغیر ہمارا وہ تمدن سمجھ میں نہیں آسکتا جسے گنوا کر آج ہم خسر الدنیا والآخرہ کی صداقت ہو گئے۔ تاریخ دانوں اور واقف کاروں پر پوشیدہ نہیں کہ اسوقت ہمارے عمدہ گھروں کی صحبت و معاشرت خود ایک معلم بے بدل اور ایک ایسی استاد تھی جس کا جواب آجکل کی مشہور و باقاعدہ یونیورسٹیاں بھی نہیں دے سکتیں۔

حسن جس گھر میں پیدا ہوئے وہ علم و ادب کا درسگاہ سمجھا اور مذہب و اخلاق کا مدرسہ مانا جاتا تھا۔ علاوہ اسکے اسوقت تک تحصیل علوم کا شوق عام اور عربی و فارسی کے درس و تدریس کا دروازہ کھلا ہوا اور ہر اچھے خاندان کیلئے اسکا حاصل کرنا لوازماتِ شرافت میں سے تھا۔ اسلئے انھوں نے اپنی جوانی تک وہ سب حاصل کر لیا جو انکے خاندان اور اسوقت کی صحبت کے ایک رکن کے لئے لازمی و ضروری تھا۔

اُس زمانہ کے شرفا و نجبا میں علوم ظاہری کی تحصیل کے ساتھ ساتھ علوم باطنی کا کسب و کشف بھی تتمۂ شرافت تصور ہوتا تھا، اور اسکی تحصیل کے مدرسہ بھی شوقینوں کیلئے کھلے ہوئے تھے۔ یہہ طریقہ ہمارے یہاں گو ایک عرصہ سے جاری تھا لیکن عالمگیر کے بعد اور جبکہ سلطنت میں انقلاب و زوال شروع ہوا تو گدازیِ دل بڑھ گئی اور فرخ سیر کے وقت تک علوم باطنی کا چرچا بھی عام ہوگیا۔

محمد شاہ کے زمانہ کو یاد کرنیوالے، اُس عہد کی صرف اُن آزادیوں، بیفکریوں اور خصوصاً اُن رنگ رلیوں کو جلوہ دیتے ہیں جو جلوخانہ دلّی میں اسوقت بظاہر آئینہ تھیں۔ مگر اس تصویر کا دوسرا رُخ مٹا دیا جاتا اور دماغ اس سے خالی رہ کر طرح طرح کے ولولوں کا ارژنگ بن جاتا ہے۔

اُس دور میں علوم و فنون کی ترقی کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے لیکن اتنا اشارہ ہے موقعہ نہ ہو گا کہ ہندوستان پر مسلمانوں کے تسلط کے بعد ہی یہہ ملک پھر اپنا قدیم رنگ اختیار کرنے لگا۔ ہندوؤں کے زمانۂ عروج میں علوم و فنون نے جو ترقی کی وہ ظاہر ہے لیکن اس عہد میں مذہب کو بھی جو رونق ہوئی اسکی نظیر دنیا بمشکل پیش کر سکتی ہے۔ سلطنت کے زوال اور اس قدیم مذہبی قوم (ہنود) کے انحطاط پر، جیساکہ قاعدہ ہے، اصلی مذہب کا ولولہ و غلغلہ بھی یہاں کمزور ہونے لگا، تا اینکہ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا گھر بنایا اور آخر یہاں کے قدیم مذہب سے اپنے جدید مذہب کی آواز لڑانا شروع کردی۔ علماء و مشائخین کا زبردست گروہ اسیوقت قائم ہوا، اور غوریوں، خلجیوں کے وقت تک علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کی تخم ریزی بھی ہونے لگی۔ سلطان جی (نظام الدین اولیا) کا دلّی میں قیام اُسپر مزید آور گداز ئی دل کیلئے نہایت مفید ثابت ہوا۔ ادب فارسی کے پتلے پر کچھ قبل سے مذہبی و اخلاقی جامہ پہنایا جا رہا تھا اور اسکے اثر سے نہ صرف زمین ایران ہی متاثر ہو رہی تھی بلکہ کل فارسی داں اقوام و ممالک پر اسکا گہرا اثر چھایا ہوا اور ہند بھی اس ناز و نیاز سے خالی نہ تھا۔ یہاں ان ہی سلطان الاولیا کی برکت و توجہ سے آخر میر خسرو کا طوطیٔ زبان بھی چہکا، اور انکے کلام نے اُس اثر میں خاطر خواہ اضافہ کرکے اِس رنگ (مذہب و تصوف) کو اور شوخ کردیا۔

مغلوں کا زمانہ اصل بابر سے شروع ہوتا ہے لیکن اسکے مختصر یعنی چار سالہ قیام ہند میں اور پھر ہمایوں کی گردش تقدیر کے سبب گو مذہب کی آواز بلند نہ ہوسکی لیکن یہہ وہی قدیمی اثر تھا کہ اکبر کو یہاں دوبارہ تسلط حاصل ہوتے ہی مذہبی رنگ جمنا اور مختلف پیرایہ میں اس کا اظہار شروع ہوگیا اور پھر اسکے دوہی پشت بعد اسی گھر میں دادا کا سا باخبر شاہزادہ پیدا ہوا جسنے عرب و ہند کے عرفان و تصوف میں رشتۂ اتحاد قائم کردینا چاہا۔ یہہ کوشش و کاوش خالی کیونکر جا سکتی تھی؟ اور یہہ اسی کا نتیجہ تھا کہ دلّی کی زمین پرستر مُد منصور سمجھا گیا! اور اسکے بعد اس عہد تک، جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں، وہ اثر و رنگ برتبہ اور گہرا ہوتا چلا۔ اور محمد شاہ کے وقت میں، جہاں ایکطرف عیش و نشاط کے ساز چھڑے تو دوسری طرف اخلاق و تصوف کے نعرے بھی گونجتے اور دلوں کو ہلاتے رہے!

نواب نوازش علیخاں اسی عہد کے اُمرا میں سے ہیں جنکے گھر (دلّی) میں محفل میلاد و مجالس عزا کی بنیاد

پڑھی۔ اور حضرت خواجہ ناصر عندلیب (خواجہ میر درد کے والد) اسی زمانہ کے وہ صاحب باطن بزرگ ہیں جن کا مدرسہ و تکیہ مذہب و اخلاق کے درس کیلئے مشہور خاص و عام رہا۔ اور ان دونوں بزرگوں کی برکت سے یہہ مذہبی چرچا آخر گھر گھر پھیل گیا۔

یہہ رنگ مذہب و تصوف کا اُن خصوصاً دلّی میں اسطرح عرصہ سے قائم تھا۔ میر حسن وہاں پیدا ہوئے۔ اور ایک نامی خاندان میں نشو و نما و پرورش پانے کی وجہہ سے اُن تمام اثروں کے ساتھ جو اس وقت چھائے ہوئے تھے، اس خاص اثر سے بھی وہ کسطرح بچ سکتے تھے؟ اور یہی وجہہ تھی کہ فہم و رشد کو آتے ہی ہم اُنھیں خواجہ میر درد کی صحبت میں اور پھر ان کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کرتا ہوا پاتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ "لیکن طرز سخن دیگراں کماہی از من سرانجام نہ شد۔ بقدمِ دیگر بزرگاں مثل حضرت خواجہ میر درد کہ درد مند بہائے اوشاں عالمگیر است و از کلام دردِ اوشاں جگر عالمے پر درد، ذات بابرکات اوشاں مایل درویشان چوں فرو فرو .... دیگرے را بخیالِ خود قائم نہ کردم کہ وضع آنرا پسندم و دل بگفتنِ انہا بندم"[۱]!!

حق ہے! اس صحبت کے نصیب ہونے اور پھر مذہب تصوف سے آشنا ہو جانے کے بعد ان کا دل پھر کدھر لگتا؟ اسی مزے اور یکسوئی کا نتیجہ تھا کہ عنفوان شباب میں جب دلّی چھوڑ کر لکھنؤ آ رہے تھے تو شیخ وقت[۲] کے حضور میں یہہ رباعی پیش کر کے دُعا لیتے ہیں!

جاناں ز تو اُمید نگاہے داریم	اُمید نگاہے ز تو گاہے داریم
ما کُشتۂ چشم سُرمہ سائے تو ایم	نے نالہ و نے فغاں، نہ آہے داریم

اور پھر جب فیض آباد آتے تو اسیطرح کی صحبت میں دل لگاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "چوں در فیض آباد رسیدم، بخدمت میر حبیب اللہ برادر زادہ شاہ حسن قدس سرہٗ کہ درویش معروف اند و میر ابراہیم نور اللہ مضجعہ برادر ایشاں نیز مشہور صحبت گزیدم"[۳]!

---

[۱] دیباچہ کلیات حسن قلمی۔ [۲] غالباً شیخ علی حزیں۔ [۳] دیباچہ کلیات حسن قلمی۔

یہ تھیں وہ صحبتیں جن کے فیض سے انکی طبیعت و فطرت پیدا ہوئی، پھر اُنہی کی بدولت (انکے ذریعہ سے) ہمارے یہاں وہ اعلیٰ مذاق شاعری قائم ہوگیا جس کا مثل نہیں، جس میں فطرت اور قدرتی شاعری کا اظہار کچھ تو ان ہی کے وقت میں ہوگیا لیکن اسکی تکمیل انکے پوتے میر انیس کے ذریعہ سے مقدر تھی اور وہ ہوکر رہا۔

میر حسن، اصل بچپنے ہی سے ایک عظیم الشان کام کے انجام کیلئے تیار ہو رہے تھے اور قدرت نے اس کام کی خاطر انھیں منتخب کرکے ایسی تعلیم و تربیت پر لگا دیا جسکی تکمیل کے بغیر اس امر کا خاطر خواہ انجام ممکن نہ تھا۔ یہ عظیم الشان کام انکی اس بے نظیر مثنوی کا سرانجام تھا جو دنیا میں سحرالبیان کے نام سے ظاہر ہوئی اور بدر کامل بن کر چمکی۔ اس مثنوی کو جیسے بغور پڑھا، وہی کہہ سکتا ہے کہ جب تک دنیا و زندگی کے مختلف شعبہ و مدارج میں کسی کو دخل تام نہ ہو ایسی کوئی شے اسکے دماغ و قلم سے نکل نہیں سکتی۔

اس عجیب و غریب تصنیف کے مختلف رنگ پہلو میں جن کے مختصر طور پر دکھا دینے کی ہم آگے کوشش کریں گے۔ ان رنگوں میں سے سب میں اوّل اور پختہ رنگ اُس معرفت کا ہے جس سے بسم اللہ کی گئی اور جو انکی اس عمدہ تعلیم و تربیت کی شاہد ہے جسکی تحصیل کے بغیر ایسے نادر و عالی مضامین انسانی تخیل کی سرحد سے باہر ہیں۔

انکی اس معرفت کا امتیازانہ و عاقلانہ پہلو یہ ہے کہ مسئلہ وجود (باری تعالیٰ) کو بیچون و چرا تسلیم کر لینے کے بعد اپنی حمد، مسئلہ توحید کے اثبات سے شروع کرتے ہیں اور پھر صفات کے وسیع و بے پایاں اسرار میدان کو اپنے زور قلم سے برشائستگی سر کرنے اور پھر علمائے ظاہر و باطن دونوں کا خیال رکھ کر بیچ کا رستہ اختیار کرتے ہیں۔ سنو کہتے ہیں۔

حمد

کروں پہلے توحید یزداں رقم — جھکا جسکے سجدے میں اوّل قلم
سر لوح پر رکھ بیاض جبیں — کہا۔ دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
نہیں کوئی تیرا، نہ ہوگا شریک — تری ذات ہے، وحدہٗ لاشریک
ورے سب ہیں اُس سے، وہی سب سے پیش — ہمیشہ سے ہے اور رہے گا ہمیش

یہہ اشعار تقریباً ۱۱۹۹ھ میں یعنی آج سے ڈیڑھ سو برس قبل کہے گئے۔ انکی زبان و طرزِ ادا کی نسبت واقعی فقرا کسقدر چسپت و درست ہے۔ کہ حسن کے گھر کے سوا اس زبان کا حسن کہیں اور اسطرح جلوہ نہ دے سکا!

اس معرفت میں یہہ ذکر توحید، واقعی آپ اپنا جواب اور حسن کے ادراک کا شاہد قوی ہے اور یہہ اسی نیک تربیت کا صلہ و نتیجہ ہے جو انہیں حاصل ہوئی اور جسکی بدولت یہہ اپنے ہمعصروں میں ہمیشہ ممتاز دکھائی دیئے اور پھر ان کے اخلاف میں یہہ درک و امتیاز، زمانہ کی ترقی کے ساتھ قوی تر ہو گیا۔

اس ذکر میں وہ اپنا فرض بتاتے اور سے

کروں پہلے توحید یزداں رقم

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کی لطف و اختصار کے ساتھ تفسیر کرتے ہیں۔ اور اپنے موصوف کے لئے فصیح ترین لفظ "یزدان" منتخب کر لیتے ہیں۔ اوّل مصرعہ میں "پہلے" کا لفظ اور دوسرے مصرعہ میں "اوّل" لا کر نہ صرف ایک صنعت شاعری ہی کو پورا کرتے ہیں بلکہ پہلے انسانی فرض بتاتے اور پھر اس "قلم" کو جس کا زور مسلم ہے جھکوا کر الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کی شان نمایاں کر دیتے ہیں! پھر قلم سجدے میں گیا اور لوح محفوظ پر اپنی پیشانی رکھ کر، اس کائنات کیطرف سے گویا ہوا کہ۔ دوسرا کوئی تجھ سا نہیں۔ آگے اسپر اور زور دیکر اسی مطلب کو دہراتے اور وحدہ لاشریک کا بہترین ترجمہ، در زبان کرتے ہیں سے

نہیں کوئی تیرا، نہو گا شریک

بعد کے دونوں شعر حفظ و ظیفہ کے لائق ہیں۔ "قدیم"، جو صفاتِ باری میں ایک اہم و ضروری صفت ہے اسے اپنی افصح زبان میں کسطرح سمجھا دیتے ہیں؟

وہ ہے سب ہیں اس سے، او وہی سب کو پیش

ہمیشہ سے ہے اور رہے گا ہمیش

اب پھر وحدت کیطرف عود کرتے ہیں کہ صفات میں سبق اوّل یہی ہے، جسکے مان لینے کے بعد باقی صفات کی معرفت آسان ہے سے چمن میں ہے وحدت کے یکتا وہ گل، کہہ کر چپ نہیں ہوتے بلکہ اسکے ساتھ ہی کچھ

ﮯ اردو کانفرنس منعقدہ ... کی تقریر صدارت

اور کہتے اور حرفِ بیان (کہ) کی کڑی سے دوسرے مصرعہ کو، اوّل سے یوں جوڑ دیتے ہیں ؎

کہ مشتاق ہیں جس کے یاں، جز و کُل،

گُل اور کُل، کا تمثیل قافیہ و صنعت توا کیطرف، یہاں، وحدت الوجود، کے ساتھ کثرت و جلوت کی کیسی شان ظاہر کردی۔ اور لفظ مشتاق، نے کس غضب کا شاعرانہ انداز پیدا کر کے، معشوق و محبوب اصلی و حقیقی کیطرف فطرتی کشش کو کسطرح نمایاں کر دیا۔

یہہ ہے وہ ذکرِ توحید جسکی مثال دُنیا کی کسی زبان و شاعری میں ملنا ممکن نہیں۔ فردوسی اس ذکر میں بہت پیش پیش ہے اور دیگر شعراء عموماً اسی کی تقلید کرتے چلے آئے اور اپنی حمد میں اس کی اتباع سے بچ نہ سکے۔ ابوالقاسم نے اس باب میں جو کچھ کہا وہ ایک لطیف حکایت کے ساتھ یوں ادا ہوا ہے کہ

مولانا گرکانی (شیخ ابوالقاسم) رحمۃ اللہ علیہ کہ بزرگ عصر بود، بنماز جنازہ او (فردوسی) حاضر نہ گشت و گفت، فردوسی مردِ عالم و زاہد بود، ترکِ سیرت خود کردہ عمر در سخن بد بنیانان صرف کردہ، بر چنیں کس نماز کردن واجب نیست و نہ باید نماز کرد۔ چوں شب در آمد، شیخ مذکور بہشت را در خواب دید، و قصرِ با عظمت در نظر پدید آمدہ، انجا در شد، سرپرے از یاقوت دید، گفت ایں سریر آزاں کیست؟ رضواں در جواب گفت کہ از آں فردوسی است۔ دراں حال دید کہ فردوسی پیدا شدہ و جامۂ سبز پوشیدہ تاجِ زمرد رنگ بر سر داشت، پرسید کہ اے فردوسی ایں جاہ و حرمت از کجا پیدا کردہ؟ گفت از یک دو بیتِ توحید، حضرت حق سُبحانہٗ و آں بیتِ توحید کہ گفتہ ام ایں است، ؎

ستائش کنم ایزدِ پاک را | کہ گویا و بینا کند خاک را
بہ مورے دہد مالشِ نرہ شیر | کند پشہ بر پیلِ جنگی دلیر
جہاں را بلندی و پستی توئی | ندانم چہ ؟ ہر چہ ہستی توئی (دیباچہ شاہنامہ)

واقعی نہایت پاکیزہ اشعار ہیں لیکن شقِ اوّل یعنی ذکرِ توحید، سے سر تا پا اور جیتک

یہہ ذکر واضح نہ ہوئے دیگر صفات کا بیان لایعنی ! حسن نے اسے خوب سمجھا اور اس عیب سے اپنے کلام کو پاک رکھا !

اس حمد میں دیگر صفات، یوں بیان ہوئے ہیں۔ ؎

وہی مالک الملک دنیا و دیں　　ہے قبضہ میں اس کے زمان و زمیں
سدا ہے نمودوں کی اس سے نمود　　دل بستگاں کا ہے اس سے کشود
اسی کی نظر سے ہے ہم سب کی دید　　اُسی کے سخن پر ہے گفت و شنید
نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے　　وہ کچھ شے نہیں، پر ہر اک شے میں ہے
نہ گوہر میں وہ ہے، نہ ہے سنگ میں　　ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں
وہ ظاہر میں ہر چند ظاہر نہیں　　پہ ظاہر کوئی اس سے باہر نہیں
تامل سے کیجے اگر غور کچھ　　تو سب کچھ وہی ہے نہیں اور کچھ
اسی گل کی بو سے ہے خوشبو گلاب　　پھرے ہے لئے ساتھ دریا حباب
پر اس جوش میں آ کے بہتا نہیں　　سمجھنے کی ہے بات کہتا نہیں!

قدیم، قادر، عالم و حی (زندہ) اور مرید (صاحب ارادہ) اور مدرک و متکلم وغیرہ اُس ذات کے صفات ثبوتیہ ہیں۔ اس بیان کے شروع ہی میں ؎

ہمیشہ سے ہے اور رہے گا ہمیش

کہہ کر، قدیم، کو سمجھا دیا کہ وہ شرط اوّل ہے! اور بعد کے اشعار میں باقی صفات کی تشریح و توضیح کر دی۔

صفات سلبیہ (یعنی وہ صفتیں جو اس ذات سے متعلق نہیں ہوسکتیں) کو بھی بہ لطافت اور شاعرانہ رنگ میں بتا گئے! ان صفات سے چونکہ مدعی کو انکار ہے اسلئے، لا الٰہ الا اللہ کے " لا " (نہیں) کیطرح، کلام و بیان کو "نفی" سے شروع کر دینا عین بلاغت اور زور طبیعت ہے ؎

نہیں اُس سے خالی غرض کوئی شے
اور
نہ گوہر میں ہے وہ نہ ہے سنگ میں

یہہ دونوں شعر پُر زور نہیں اور نہ اسے شروع ہوئے اور اسطرح وہ نئی کوتاہ او سمجھا گیا!

اس حمد میں فردوسی نے بھی حق یہہ ہے کہ پُر زور لگایا اور سے

بہ نورسے ورد مالشس شیرہ شیر کند پشہ بر پیل جنگی دلیر

میں اُسنے اپنی قوت طبیعت صرف کردی لیکن اوّل تو بیت کے دونوں مصرعوں کا مطلب واحد ہے۔ دوسرے بیان میں شاعرانہ انداز قائم نہ رہ سکا اور کلام شاہی کے آسمان سے اتر نظم کی زمین پر آرہا۔ برخلاف اسکے حسن نے جو کچھ کہا وہ شاعری کی معراج ہے اسے

سدا ہے موجون کی اس سے نمود دل بستگاں کو ہے اس سے کشود!

کہہ کر کسی خاص مخلوق کی قید سے بیان کو آزاد رکھا اور ایک عالم کو اُس قادر کے تحت و تصرف میں دیدیا! میر حسن کے وقت تک ہماری زبان و شاعری فارسی کی مطیع و مقلد تھی، اور اسوقت اس ادب اور فارسی کی تخیل سے چھٹکارا بھی نہ تھا لیکن حسن نے وہ بیڑی توڑی اور آزاد ہو کر اپنا راستہ الگ نکال لیا۔

یہہ حمد ظاہر ہے کہ ایک مسلمان اور پھر کسی خاص عقیدے کے پابند کی طبیعت کا نتیجہ ہے لیکن انکا یہ بیان کسی خاص ملت و فرقہ مخصوص اور اس میں محدود نہیں سمجھا جا سکتا۔ بلکہ یہہ معرفت دیر و حرم، دونوں جگہہ ایکطرح گونج سکتی ہے!

یہی وہ فطری و وہبی شاعری ہے جسے ارمز لیست اینپغیری، کا واجب و اعلیٰ خطاب ملا اور جسے حسن رس حسن نے ادا کر گئے، اور پھر ان کے خاندان میں میر انیس جیسے خاتم انے گئے!!

خیال

برادرم مولوی مسعود علی صاحب بی۔ اے ایل ایل بی (جالنہ) کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے اولڈ بوائے کی توسیع اشاعت میں اب پھر کوشش کرنی شروع کی ہے، اور انکے نتیجے ہوسے پانچ ناموں میں سے تین کے پیسے بھی ہم کو وصول ہو چکے ہیں۔ دوسرے بھائیوں سے بھی ہم سعادتمندی کی توقع رکھتے ہیں۔

افادات لبیب

از صاحبِ عالم حضرت لبیب دہلوی

سانس کی گرم روی کو تپشِ غم نہ سمجھ
دل کی فریاد و فغاں کو مرا ماتم نہ سمجھ

دیدۂ جاں کو رقیبِ رہِ الفت نہ بنا
گوشِ دل کو سخنِ یار کا محرم نہ سمجھ

آگ ہی آگ ہے لیکن ہمہ تن خاکستر
غیر پروانہ کسی کو مرا ہمدم نہ سمجھ

جس کا ہر گام محبت ہو شرمندۂ عجز
ہو فرشتہ بھی تو اسکو بنِ آدم نہ سمجھ

سرِ صد روح سے بھی مرکبِ ہمت ہے پرے
نقش وہ جس کو کبھی عشاق کا عالم نہ سمجھ

سربسر جلوہ گہِ یار ہے سارا عالم
اک فقط طور کے جلوے ہی کو عالم نہ سمجھ

مرض الموت کے پردے میں ہے پیغامِ وصال
اپنے مر مٹنے کو جی اٹھنے سے کچھ کم نہ سمجھ

مرنے والے کیلئے دیدۂ خونبار ہے تنگ
سراب رہِ الفت ہے اسے یم نہ سمجھ

عارضِ یار و دلِ ریش و زخم کے سوا
ہر گلِ تازہ کو پروردۂ شبنم نہ سمجھ

حسنِ ظن شرط رہِ عشق ہے ہشیار لبیب
اسکو برہم بھی اگر پائے تو برہم نہ سمجھ

یوں ہی سی شکایت پر تم نہ یوں خفا ہوتے
اب بھی آشنا ہیں ہم تم تو آشنا ہوتے

عشق کے سوا ہم سے کام اور کیا ہوتا
تم پہ گر نہ مر جاتے کاہیکی دوا ہوتے

مر کے بھی نہ چھٹ سکتی آپ کی وفاداری
آپ کا پتا دیتے آپ بے پتا ہوتے

موج کیطرح ہم بھی رقص کرتے ساحل تک
راہ کوئے جاناں میں نقش رہ نما ہوتے

تیرے سرفروشوں میں ہم سے کون بڑھ سکتا
ہم تو خاکساری سے سب کی خاکپا ہوتے

ایک زخم سائل کو سخت جاں کیا سمجھے
زخم ایسے گوناگوں تن پہ جابجا ہوتے

شرح سوزش پنہاں کسطرح بیاں ہوتی
دل سے جو دھوئیں اٹھتے آہِ نارسا ہوتے

جان و دل کے پھندوں سے آپ گر چھڑا دیتے
دیکھنا! یہہ دیوانے سب سے ماورا ہوتے

تم اگر نہ کر سکتے عاشقوں کی دلداری
اپنے دیدہ و دل میں آپ مبتلا ہوتے

حشر میں تہیدستی اپنی اقتضا یہہ ہے
ہم جہاں کہیں ہوتے مرد بے نوا ہوتے

چشم مست ساقی سے ہے لبیب مجبوری
ورنہ آپ تو اچھے خاصے پارسا ہوتے

جامعۂ علی گڑھ کی انجمن

لندن میں ضیافتی جلسہ

لندن ۲۶ مئی۔ سوائے ہوٹل لندن میں جامعہ ملیہ کی انجمن کا سالانہ ضیافتی جلسہ ہوا۔ سر محمد رفیق نے صدارت کی۔ مہاراجہ جرودوان نے صدر جامعہ کا جام صحت تجویز کیا۔ اور اس سلسلہ میں ہندوستان کے دو بڑے فرقوں یعنے ہندو مسلمانوں میں مفاہمت کی اپیل کی کیونکہ اسکے بغیر قومی ترقی کی شاہراہ نہیں کھل سکتی۔

اس کا جواب دیتے ہوئے صدر نشین نے کہا کہ علی گڑھ میں فرقہ وارانہ خیالات کی اشاعت نہیں ہے اور نہ وہ فرقہ وارانہ اصول کو ترجیح دیتا ہے انھوں نے سب سے درخواست کی کہ بانی جامعہ کی روایات کو برقرار رکھیں۔

مسٹر سرنواس اینگار نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسائل دراصل صحیح اصولی تعلیم مسائل سے وابستہ ہیں انھوں نے سب سے درخواست کی کہ سیاسات سے مذہب کو الگ تھلگ رکھیں اور وہی اتحاد اپنے ملک میں پیدا کریں جو آج ہم ہندوستان سے باہر رہنے والے تو نہیں ہیں مخلوط انتخاب اس کے سلسلہ میں بہت سودمند ثابت ہونگے ۔

مُسلم یونیورسٹی

مُسلمانانِ ہند نے آج سے کچھ اوپر پچاس برس قبل سر سیّد علیہ الرحمہ کی چیخ پکار کے سبب سے مغربی طرزِ تعلیم کی طرف کچھ توجہ کی اِنہی کی جدّ و جہد اور انکے رُفقاء کی مدد سے اسقدر رقم بھی فراہم ہوگئی کہ جس سے علی گڑھ میں مسلمان نوجوانوں کی رہائش اور تعلیم کا انتظام ہوا جناب جسٹس سیّد محمود کے علم اور ایثار، نواب محسن الملک مرحوم کی جادو بیانی سے علی گڑھ مقبولِ عام ہوا۔ پھر نواب وقار الملک مغفور اور انکے رفقاء نے اپنی کوشش سے مدرسۃ العلوم کو اس قابل کر دیا کہ سر سیّد کی وہ تمنا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرے پوری ہوگئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم۔ علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی بن گیا۔ اور مسلمانان ہند کے نونہالوں کی اعلیٰ دماغی، جسمانی، روحانی تعلیم کا مرکز قائم ہوگیا۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اب علی گڑھ کا نظم و نسق ایسے ہاتھوں میں آگیا جو علی گڑھ ہی کی فضا میں رہ سہہ کر پلے بڑھے تھے۔ مسلمانانِ ہند کو ان سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب جو قابل ترین مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں تنظیم جدید کے وقت سے پرو وائس چانسلر رہے۔ وائس چانسلروں میں راجہ صاحب محمود آباد اور نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کے نام نامی کیساتھ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا نام بھی نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ راجہ صاحب محمود آباد اور نواب مزمل اللہ خاں صاحب سے رقمی امداد کے علاوہ یونیورسٹی کو کسی اور امداد ملنے کی توقع نہیں ہو سکتی لیکن صاحبزادہ آفتاب احمد

خاں صاحب ان دونوں کے برعکس تھے وہ علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک جیسی زبردست ہستیوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھتے تھے۔ علی گڑھ کے مختلف فضاؤں سے روشناس تھے۔ یورپ کی نہ صرف اعلیٰ تعلیم پا چکے بلکہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد پھر یورپ کو دیکھ بھال کر واپس ہوئے تھے۔ چنانچہ جب صاحبزادہ صاحب اکرم چانسلر ہوئے تو یہ امر تعجب خیز نہیں ہے کہ عام طور پر خیال ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کی اب قسمت جاگی ہے کہ اس کا وائس چانسلر یورپ کا تعلیم یافتہ اور اولڈ بوائے ہے اس کا پرو وائس چانسلر اور پرنسپل بھی یورپ کا تعلیم یافتہ اور اولڈ بوائے ہے۔ ایسی قابلیت مع روایات کے اشخاص کے ہاتھ میں جب علی گڑھ کی باگ رہی تو تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ دوسرا ہی رنگ دکھائی دینے لگا۔ بجائے اسکے کہ یہ دونوں مل جل کر مسلمانوں کی ناؤ کو صحیح راستہ پر چلاتے آپس میں ایسے الجھنے لگے کہ ایک دوسرے کے مخالف کو اپنا کام کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ کشتی جس کو مسلمانوں نے اپنا خون سینچ کر تیار کیا تھا۔ موجوں کے تھپیڑوں سے صحیح راستہ سے بھٹک گئی۔ اس افسوسناک حالت کے اظہار سے ہمارا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ صاحبزادہ صاحب کی صداقت یا ڈاکٹر صاحب کی قابلیت کو مشتبہ ٹھہرائیں۔ ہم صرف نتیجہ پر نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ صاحبزادہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی دوعملی سے علی گڑھ یونیورسٹی اور وہاں کے فارغ التحصیل اشخاص کے متعلق ایسی ایسی تشویشناک افواہیں پھیلیں اور اس کے گھر گھر چرچے ہوئے کہ جناب بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا مجبور ہوئیں کہ حکومت ہند کی مدد لیکر اصلی حالت کا انکشاف کریں۔ رحمت اللہ کی تحقیقاتی کمیٹی جس کے دو اراکین اس زمانہ میں جبکہ سوراج کے واسطے ہر طرف سے صدائیں بلند ہو رہی ہیں انگریز تھے اور وہ بھی کیسے انگریز جو حکومت ہند کی ملازمت میں ہیں۔ اس کمیٹی کے صدر بیشک سر ابراہیم رحمت اللہ تھے لیکن اہل فہم کیلئے یہ امر قابل غور ہے کہ وہی علی گڑھ جہاں نصف صدی سے جدید تعلیم جاری ہے ایک شخص بھی ایسا پیش کر سکا جو اپنی ذاتی قابلیت اور آزاد خیالی و مستقل مزاجی کے سبب سے اپنی یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی میں جگہ پاتا۔ تاہم یہ امر باعث اطمینان ہے کہ رحمت اللہ تحقیقاتی کمیٹی نے نہایت آزادی کے ساتھ علی گڑھ کی

موجودہ حالت کو ظاہر کر دیا۔ اس نے صاف صاف یہ بتلا دیا کہ علی گڑھ میں تعلیمی فضا مفقود ہو گئی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر تعلیم دینے کے بجائے فرقہ بندی میں مصروف ہیں اور ہندوستان کی سیاسی زندگی میں نام حاصل کرنے کے جویاں ہیں۔ لڑکے حصول تعلیم کے بجائے اپنے اپنے پروفیسروں کے واسطے اوٹ فراہم کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یونیورسٹی کے قواعد وضوابط برائے نام ہیں حد یہ ہے کہ پروفیسران فرقہ بندی کے لحاظ سے خدمت اور ترقی پاتے ہیں اور لڑکے ذاتی سعی کی بجائے پروفیسروں کی مہربانیوں سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کے گریجویٹ ایسے نکمے ہونے لگے ہیں کہ انکو عہدہ داران متعلقہ خدمت دینے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ علی گڑھ کی روایات کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اگر اصلاح کی جلد کوشش نہ کی گئی تو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے جسقدر بھی امیدیں ہیں اس پر پانی پھر جائے گا۔

رحمت اللہ کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ نے مسلمانان ہند کی تعلیمی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے اور اب نہ صرف ان لوگوں کا جنہوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی ہے بلکہ تمام مسلمانان ہند کا فرض ہے کہ اپنے ذاتی خیالات کو پس پشت ڈالکر علی گڑھ کو سرسید مرحوم کے خیال کے مطابق علی گڑھ بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ علی گڑھ کا آدا ئی روز بگڑا جب سے کہ علی گڑھ ایسے اشخاص کی رہبری سے محروم ہو گیا جو ذاتی قابلیت اور علی گڑھ کی محبت کے علاوہ انتظامی امور کا تجربہ رکھتے تھے۔ سرسید مرحوم اور سید محمود مرحوم کے جیسے غیر معمولی اشخاص کے بعد علی گڑھ کا عروج انہی لوگوں کی بدولت ہوا جنہوں نے ریاست حیدرآباد میں بڑی بڑی خدمتوں پر پہونچکر انتظامی کام کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ ہماری قطعی رائے ہے کہ اصلاح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے واسطے خصوصاً ایسے نازک وقت میں ہم کو ایسے شخص کی تلاش کرنی چاہیے جو قابل ہو۔ علی گڑھ کی روایات سے واقف ہو لیکن موجودہ فرقہ بندی سے بے تعلق ہو ہر قسم کے خیال کے مسلمانوں میں باوقعت ہو اور حکومت ہند میں بھی بارسوخ ہو۔ انتظامی تجربہ رکھتا ہو فکر معاش سے بے فکر ہو۔

راقم خیر طلب

میں راولپنڈی میں

برادرم ۔ السلام علیکم ۔ لاہور سے عریضہ ارسال کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اولڈ بوائے کا وی ۔ پی منگوانے کے لئے اپنے پتہ سے مطلع کرونگا ۔ اسوقت تک مجھ کو خود علم نہ تھا کہ کس تاریخ میں میں کہاں ہونگا ۔ اب اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہوں ۔ اب براہ کرم وی ۔ پی میرے وطن کے پتہ پر روانہ فرمائیں عید الضحیٰ سے قبل وہاں پہنچ جاؤنگا اسلئے ۲۹ یا ۳۰ مئی کو وی پی وہاں ملجائے جسکے لئے اگر ۲۵ کو حیدر آباد سے روانہ کیا گیا تو مناسب وقت ہوگا ۔ میرا پتہ

پٹیالی ضلع ایٹہ

آپ کہیں گے کہ یہہ کون دیہقانی ہے جو ایسے غیر معروف مقام میں رہتا ہے اپنے کو اولڈ بوائے کہتا ہے اور وہاں وی ۔ پی منگواتا ہے ۔ خدانخواستہ اگر یہہ خیال آپکے دل میں گذرا تو آپکا دل یہانتک پڑھنے کے بعد خود آپ سے کہیگا کہ اڈیٹر صاحب آپ مشاہیر ہند کی تاریخی واقعات سے ناواقف ہیں اور یہہ آپکی سخت شکست ہوگی ۔ مجھے لکھتے ہوئے اسکا اندیشہ ہو رہا ہے ۔ پٹیالی واقعی غیر معروف ہے مگر حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش کا مقام ہے ۔ بلاد فارس سے ہند پہنچکر امیر خسرو مرحوم مغفور کے والد ماجد نے بلبن کے زمانہ میں یہیں سکونت اختیار کی تھی ۔

اب تو آپ مرعوب ہوئے ہونگے ۔ طالب علمی کے زمانہ کا اسکے متعلق ایک واقعہ یاد آگیا نواب اسحٰق خاں صاحب مرحوم مغفور حضرت امیر خسرو کے بڑے عاشق تھے اور حیات خسرو نہایت اہتمام کے ساتھ میرے ایک ہم ضلع سے تیار کرا رہے تھے ۔

نواب صاحب میرے والد ماجد مرحوم کے دیرینہ دوست تھے۔ میں اکثر خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اگر تنہا ہوتے تو ہمیشہ خطاب کرتے کہ "آؤ حضرت امیر خسرو کے ہموطن" اور میں نے بھی ایک مرتبہ ادب سے عرض کیا کہ سرکار اس قصبہ میں پانچسو سال میں ایک بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو خود اس کی ہنسکر تشریح فرمادی کہ ٹھیک ہے پہلے پانچسو سال میں حضرت خسرو گذرے اور اب تم ہو اور چونکہ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا اسلئے خاموشی سے عرض کردیا کہ "جی حضور نگاہیں مجھ پر ہی پڑتی ہیں"

کہیے۔ بھائی صاحب اگر مرعوب ہونے میں کسر رہ گئی تھی تو وہ پوری ہوگئی جیسے یہ تو آپکی دلچسپی کیلئے تھا اب آمدم برسر مطلب۔ معذرت خواہ ہوں کہ میں پیشہ ور مضمون نگار ہونے کی وجہ سے اپنے مدعا کو طول دیدیتا ہوں پیشہ ور وہی نہیں ہوتے جو اخبار کے اڈیٹر ہوتے ہیں یا مضمون نگاری کو اپنا ذریعہ معاش بناتے ہیں اور وہ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں کیونکہ اسکے اہل ہوتے ہیں مگر محض شوقیہ پیشہ ور وہ ہوتے ہیں جن کو مضمون نگاری کا خبط ہوتا ہے اور اسکے اہل نہیں ہوتے! الحمدللہ مجھے خبط تو نہیں ہے اور اہلیت کا دعویٰ اسلئے نہیں ہے کہ دماغ کا توازن ابتک درست ہے۔ اسقدر لکھنے کے بعد خیال آیا کہ توازن ضرور کہیں سے بگڑا ہوا ہے۔ لکھنے کیا بیٹھے تھے اور لکھ کیا رہے ہو۔

تو مدعا یہہ ہے کہ یونیورسٹی اب ایک نئے دور سے گذر رہی ہے اور اخبارات میں اسکے مستقبل کے متعلق علی گڑہ سے دلچسپی لینے والے حضرات نے اپنی رائے کا اظہار بھی کردیا ہے جس روز مجھے یہہ معلوم ہوا تھا کہ رپورٹ تیار ہوگئی اور علی گڑہ پہنچ گئی ہے اور ڈاکٹر صاحب کو مستعفی ہونا پڑا تو اسی روز میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو لکھا تھا جسمیں میں ہر معاملہ میں تبدیل خیالات کیا کرتا ہوں کہ اب کونسا وقت موزوں ہوگا جب ہمارے لایق وفایق اور ہردلعزیز بھائی سید راس مسعود صاحب اس میراث پدر کو آکر سنبھالیں گے اس خط میں بھی میں نے یہی لکھا تھا کہ علی گڑھ میراث پدر و جد تو ہے ہی مگر اتنا تو کوئی شخص یہہ نہیں کہہ سکتا کہ علم پدر میں کسی قسم کی کمی ہے۔

مسٹر راس مسعود کی علمی اور انتظامی قابلیت کی تعریف خلاف محل ہے کیونکہ ہر وہ شخص جس کا تحریک علی گڑھ سے تعلق ہے انکے ان خداداد قابلیتوں کا معترف ہے۔

سوال صرف یہہ ہے کہ وہ کب علی گڑھ آکر اس ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لیں کمیٹی کی سفارش ہے کہ ایک خاص افسر تین سال کیلئے مقرر کیا جائے جو یونیورسٹی کے نظام کو مرتب کرے اور جو اس میں خامیاں ہیں انکو دور کرے اور وہ اس عہدہ پر تین سال تک مامور ہے اور دوبارہ وہ کسی عہدہ کیلئے منتخب نہ کیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اولڈ بوائے ایک بہترین آلہ ہے جسکے ذریعہ سے میں اپنے خیالات کار کنان یونیورسٹی و ممبران کورٹ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

چونکہ میں علی گڑھ اکثر جاتا رہتا ہوں اور اساتذہ وطلبا سے ملتا رہتا ہوں اسلئے ایک مدت تک حالات سے واقف بھی ہوں تحقیقاتی کمیٹی کے دوران میں وہاں کچھ عرصہ تک موجود تھا۔

مسلم یونیورسٹی میں بہت زیادہ خرابیاں نہیں ہیں جیسا کہ اخباروں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے مگر جو خرابیاں ہیں وہ ایسی ہیں کہ انکا احاطہ اثر مختلف شعبوں پر جاگزیں ہے۔ بنیادی خرابی میری رائے میں یوں ہوئی کہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے ہر شعبہ میں اپنے دوستوں کو یا کالج کی اصطلاح میں "پٹھوؤں" کو ترقیاں دینا اور تقرر کرنا شروع کیا۔ اور ایسا کرنے میں انھوں نے کبھی اسکا خیال نہیں کیا کہ آیا جس شخص کا وہ تقرر کر رہے ہیں وہ اس کام کا اہل ہے یا نہیں۔ ممبران کورٹ کے انتخاب کے وقت بھی یہہ اصول پیش نگاہ رہتا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہہ ہوا کہ تیسرے درجہ کے لوگ ہر شعبہ میں داخل ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب کو ایسے لوگوں کی ضرورت اسلئے تھی کہ وہ انکے اشارے پر چلیں اور یہہ انکے حواریین ایسا کرتے بھی تھے بلکہ انکی تعریف کا پروپگنڈا کرنے کا حق رفاقت اب تک ادا کر رہے ہیں۔ فریق بندی غالباً ڈاکٹر صاحب کی عادت ثانیہ ہوگئی تھی بدنیتی سے نہ تھی۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ بہرحال اسکا نتیجہ جو نکلا وہ سب کے سامنے ہے۔ اسلئے اب اگر علی گڑھ کو درست کرنا ہے تو جس شخص کے سپرد یہہ خدمت ہوگی اسکے سامنے سب سے سخت کام یہہ ہوگا کہ آپ نا اہل لوگوں کو وہاں سے علیحدہ کرے جو فریق بندی کے تحت میں مقرر کئے گئے تھے اور جنکے بازار میں قیمت " ڈیڑھ سو دو سو سے زیادہ نہ تھی۔ میں شاعری نہیں کر رہا ہوں بلکہ اسکے مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب

عرصہ حیات جب یورپ سے واپس آئے تو سیدھے علی گڑھ پہنچے اور مطمئن تھے کہ وہاں ان کو جگہ ملے گی مگر ناکامیاب واپس چلے آئے اور ریاضی کے شعبہ میں جگہ ایک تیسرے درجہ کے ایم اے ہندو صاحب کو دیدی گئی۔ ڈاکٹر ملک نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے علی گڑھ کے طالب علم ہو کر ایم۔اے ریاضی میں کیا۔ یورپ گئے اور کیمبرج سے ایم اے کیا۔ جرمن سے پی۔ ایچ۔ ڈی میں فرسٹ کلاس ڈگری لی حالانکہ انکے استاد ڈاکٹر ضیاءالدین سیکنڈ کلاس ڈگری وہیں سے لائے تھے۔ مگر ڈاکٹر ملک کو جگہ نہ ملی۔ صرف اسلئے کہ وہ آزاد رائے رکھنے والے تھے۔ [illegible] جو کیمبرج یا آکسفورڈ سے فرسٹ کلاس ڈگری لائے تھے جو شاید اب تک کوئی ہندوستانی نہیں لایا تھا اور علی گڑھ سے محروم ہو کر لاہور کے اسلامیہ کالج میں جگہ لی حالانکہ علی گڑھ میں اس مضمون کا کوئی پروفیسر اب تک مقرر نہیں ہوا ہے اور جگہ خالی ہے۔

بہرحال یہہ واقعات اپنے بیان کی تائید میں لکھنے پڑے۔ سوال یہہ ہے کہ اس خس و خاشاک کو کون صاف کرے۔

میری رائے میں تو کمیٹی کی رائے کو اس حد تک منظور کرنا چاہیے کہ ایک خاص افسر ایک سال کے لئے مقرر کیا جائے جو نااہل لوگوں کو چلتا کرے اور دوسرے نقائص کو بھی دور کرے اور سال بھر کے بعد مسٹر راس مسعود صاحب بحیثیت پرو وائس چانسلر مقرر ہوں اور چند سال اس عہدہ پر کام کرکے جب موزوں شخص اس کام کا مل جائے تو وائس چانسلر بنیں اور علی گڑھ کو پروان چڑھائیں۔ ہم یہہ نہیں چاہتے کہ وہ اس فرقہ بندی کے جھگڑے میں ڈالدیئے جائیں جس سے وہ ہزارہا میل دور ہیں۔ جس کو وہ علیحدہ کریں گے وہ یہی کہے گا کہ چونکہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مجھ سے ناخوش تھے اسلئے مسعود صاحب نے مجھے نکال دیا۔ جب کبھی بھی وہ علی گڑھ آئیں گے اب یا کچھ دیر بعد وہ اس قسم کی حرکات سے بالاتر رہیں گے مگر اہل غرض کسی کو بدنام کئے بغیر نہیں رہتے۔ نیز وہ سفر کو جا رہے ہیں اسوقت تک وہاں سے بھی واپس آجائینگے۔ چونکہ مضمون طول ہوگیا ہے اسلئے ختم کرتا ہوں اور اس طوالت کی معافی کا خواہاں۔ آپکو تعجب تو نہوگا اگر جولائی میں آپ سے حیدرآباد میں ملاقات ہو۔

آپکا بھائی **اشفاق علی** از راولپنڈی

اشخاصِ ڈراما

ارل آف کیویرشیم
وسکونٹ گورنگ ۔ اُس کا بیٹا
سر رابرٹ چلٹرن ۔ نائب معتمد وزیر خارجہ
ماسنجاک ۔ لندن میں فرانسیسی سفارت خانہ کا ایلچی
مسٹر مانٹ فورڈ
میسن ۔ رابرٹ چلٹرن کا بٹلر
فپس ۔ گورنگ کا ملازم
جیمس } ہرکارے
ہیرلڈ } ہرکارے
لیڈی چلٹرن
لیڈی مارکبی
کونٹس آف بیسلڈن
مسز مارچ مانٹ
مس میبل چلٹرن ۔ چلٹرن کی بہن
مسز شیویلی

مثالی شوہر

اسکر وائلڈ کے آئیڈیل ہسبنڈ کا ترجمہ

از

محمد نذیر الدین ایم اے

پہلا ایکٹ

سین

رابرٹ چلٹرن کے مکان کا ہشت پہلو کمرہ

کمرہ خوب روشن اور مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہے۔ زینہ پر لیڈی چلٹرن کھڑی دعوتیوں کا استقبال کر رہی ہے۔ زینہ پر کی کمان میں ایک بہت بڑا بلوریں جھاڑ لٹک رہا ہے جو موم بتیوں کی روشنی سے جگ مگ کر رہا ہے۔ اسکی روشنی دیوار پر لٹکے ہوئے ایک پردے پر پڑ رہی ہے جس میں "محبت کی فتح" کے منظر کو نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ داہنی جانب کمرہ موسیقی کا راستہ ہے جہاں سے پیانو کی سُریلی مگر دھیمی آواز آ رہی ہے۔

میسن: [مہمانوں کی آمد کا اعلان زینہ پر سے کرتے ہوئے]

مسٹر اور لیڈی جینج بارفورڈ۔ لارڈ کیورشہم

(لارڈ کیورشہم ستر سال کا بوڑھا مگر مضبوط کاٹھی کا شخص ہے)

لارڈکیورشہم۔ لیڈی چلٹرن! آداب عرض ہے۔ میرا ناکارہ لڑکا یہاں ہو تو نہیں گیا؟

لیڈی چلٹرن:۔ (مسکراتے ہوئے) لارڈ گورنگ شاید ابھی نہیں آئے۔

میبل چلٹرن:۔ (لارڈ کیورشہم کے قریب آکر) لارڈ گورنگ کو آپ کیوں ناکارہ فرماتے ہیں!

[میبل چلٹرن انگریزی طرز کے حسن کا ایک مکمل نمونہ ہے جو نگترے کی نو شگفتہ کلی کی شان لیے ہوئے ہے۔ اس میں پھول جیسی نکہت اور نکہت جیسی آزادی پائیجاتی ہے اسکے کھلے ہوئے بال ہوا سے ہل ہل کر سنہری موجوں کا سماں پیش نظر کر دیتے ہیں اسکی ہراد امیں لطیف تلطم کا راز نہاں ہے اور معصومیت کی حیرت فزا جرأت اسکی رگ و ریشہ میں جاری و ساری ہے۔ اسکا چھوٹا سا منہ کسی کے جواب کے انتظار میں نیم وا ہے]

لارڈکیورشہم:۔ اسلئے کہ وہ اپنی زندگی بیکاری میں صرف کرتا ہے۔

میبل چلٹرن:۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جو شخص شفق پھوٹتے ہی اسپ تک رفتار پر تفریح کرنے نکلے ہفتہ میں تین بار تھیٹر سے سرور سے لطف اٹھائے دن میں کوئی پانچ دفعہ کپڑے بدلے اور رات رات بھر ضیافتوں میں مصروف رہے اسکو بیکار کہا جائے۔ حیرت ہے۔

لارڈکیورشہم:۔ (مسکراکر اور آنکھوں میں آنکھیں ملاکر) تم تو بہت جادو بیان معلوم ہوتی ہو اور اسکے ساتھ نہایت حسین۔

میبل چلٹرن:۔ شکریہ کبھی کبھی تو آیا کیجئے۔ آپ جانتے ہیں بدھ کا دن ہم گھر پر ہی گذارا کرتے ہیں۔

لارڈکیورشہم:۔ آجکل کہیں نہیں جاتا لندن کی سوسائٹی سے بیزار ہوں۔

میبل چلٹرن:۔ خوب! میں تو لندن کی سوسائٹی کو بہت عزیز رکھتی ہوں۔ میرے خیال میں اسمیں بہت کچھ اصلاح ہو چکی ہے کیونکہ اب یہ بالکلیہ خوشنما احمقوں اور بعقلدار پاگلوں پر مشتمل ہے۔ سوسائٹی کی روح رواں یہی افراد ہیں۔

لارڈکیورشہم:۔ یہ بھی خوب! اچھا گورنگ کیا ہے خوشنما احمق یا ....

میبل چلٹرن:۔ (متانت سے) میں لارڈ گورنگ کو فی الحال ایک بالکل جداگانہ گروہ میں شامل کرنے مجبور ہوں لیکن بہرحال وہ بہت جلد اپنی حالت بدلدیں گے۔

لارڈ کیورشہم :- کسطرح ؟

میبل چلٹرن :- [ادّبا ذرا جھک کر] لارڈ کیورشہم! اس سے آپ عنقریب واقف ہونگے۔

میسن :- [مہمانوں کی آمد کا اعلان کرتے ہوئے] لیڈی مارکبی۔ مسز شیولی۔

[لیڈی مارکبی اور مسز شیولی داخل ہوتی ہیں۔ لیڈی مارکبی خوش اخلاق کریم النفس معمر عورت ہے۔ مسز شیولی جو اسکے ساتھ ہے بلند قامت اور کچھ دبلی ہے۔ ہونٹ بہت پتلے ہیں جو بہت گہرے رنگ سے رنگے گئے ہیں۔ زردی مائل چہرہ پر گویا سُرخ رنگ کی ایک لکیر ہے۔ بالوں میں سرخی جھلکتی ہے۔ ناک عقابی اور گردن قدرے دراز ہے۔ سبزی مائل بھوری آنکھیں چین سے نہیں رہتیں۔ سرخ رنگ کا غازہ چہرہ کی فطری زردی کو ظاہر ہونے نہیں دیتا۔۔۔۔۔ اپنی تمام حرکات و سکنات میں وہ بے انتہا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی وہ آرٹ کا شہ پارہ ہے جس میں مختلف لفریبیاں جلوہ گر ہیں۔]

لیڈی مارکبی :- پیاری گرٹروڈ! تسلیم۔ میں ممنون ہوں آپ نے مسز شیولی کو ساتھ لانے کی اجازت دی۔ دو ایسی خوبصورت عورتیں کسطرح ایک دوسرے سے ناآشنا رہ سکتی ہیں

لیڈی چلٹرن :- [مسکراتے ہوئے مسز شیولی کیطرف بڑھتی ہے لیکن یکایک رک کر دور سے ہی سلام لیتی ہے] خیال پڑتا ہے کہ مسز شیولی اور میں اس سے پہلے مل چکے ہیں۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مسز شیولی نے دوسری شادی رچائی ہے۔

لیڈی مارکبی :- [خوش مزاجی سے] آجکل جتنی دفعہ شادی کرنے کا موقع ملے لوگ شادی کر لیتے ہیں۔ (ڈچس آف ماربرو سے) پیاری ڈچس ڈیوک کا کیا حال ہے۔ دماغ ابھی کمزور ہے! خیر۔ اسکی تو امید ہی تھی۔ انکے والد کا بھی یہی حال تھا۔ نسلی امراض کا کیا علاج ؟

مسز شیولی :- (اپنے پنکھے سے کھیلتے ہوئے) لیڈی چلٹرن! کیا درحقیقت ہم اس سے پہلے مل چکے ہیں

مجھے یاد نہیں کہ کہاں۔ ہاں مدت سے انگلستان کے باہر تھی۔

لیڈی چلٹرن: مسز شیولی! مدرسہ میں ہم دونوں ساتھ رہے ہیں۔

مسز شیولی: [تکبرانہ انداز میں] اچھا! میں نے تو مدرسہ کی زندگی کو بالکل بھلا دیا۔ دھندلا سا خیال ہے کہ اس زمانہ کو حقارت سے دیکھا کرتی تھی۔

لیڈی چلٹرن: کیا تعجب!

مسز شیولی: [ازراہ لطیف پیرایہ میں] لیڈی چلٹرن! کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ کے شوہر سے ملنے کی آرزومند ہوں جب سے وہ وزیر خارجہ ہیں ہمیں وینا میں (Vienna) انکی شہرت بڑھ رہی ہے۔ اخباروں میں لوگ انکا نام صحیح لکھنے لگے ہیں جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ انکی شہرت خاصی ہو چکی ہے۔

لیڈی چلٹرن: میں نہیں سمجھتی کہ آپ میں اور انمیں کوئی چیز مشترک ہو سکتی ہے۔

[چلی جاتی ہے]

نان جیاک: اوہو! مسز شیولی! آپ یہاں کیسے؟ برلن کی ملاقات کے بعد سے اب کہیں اس چاند پر نظر پڑی۔

مسز شیولی: بالکل درست۔ پانچ سال قبل۔

نان جیاک: اور آپ چشم بددور پہلے سے زیادہ کمسن اور حسین معلوم ہوتی ہیں۔ کیا بات ہے کہ آپ کا حسن روز افزوں ہے۔

مسز شیولی: بات یہ ہے کہ میں صرف تم جیسے حسین افراد سے ہمکلام ہوتی ہوں۔

نان جیاک: اچھا تو ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں!

[سر رابرٹ چلٹرن داخل ہوتا ہے عمر چالیس سال لیکن کم عمر معلوم ہوتا ہے۔ داڑھی مونچھ چٹ جسم سڈول ہے۔ بال اور آنکھیں سیاہ ہیں! اہم شخصیت لیکن غیر متعارف جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے۔ نہایت معزز و مہذب۔ اسکی حرکات و سکنات سے

ایک خاص وقار نمایاں ہے جس میں غرور کی جھلک پائی جاتی ہے۔ لوگ اس کے
انداز سے محسوس کرتے ہیں کہ اس کو اپنی کامیابی کا احساس ہے۔ متلون مزاج۔
منہ چھوٹا اور ٹھوڑی ذرا نوکدار۔ آنکھیں اندر گھسی ہوئیں مگر نشیلی۔ چہرہ سے اس بات کا
پتہ چلتا ہے کہ جذبہ (Passion) اور عقل (Intallect) دونوں میں
انتہائی فصل ہے ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑتا گویا کہ قوت ارادی کے کسی نا معلوم
لائحہ عمل سے تخیل اور جذبہ کو بالکل جدا کر دیا گیا ہے۔ ہاتھوں میں قدرے رعشہ ہے۔
خوبصورت کہنا غیر صحیح ہوگا لیکن قبول صورت ضرور کہا جا سکتا ہے۔]

سر رابرٹ چلٹرن :۔ لیڈی مارکبی! آداب عرض ہے۔ میرے خیال میں مسز جان کو آپ اپنے ساتھ
لیتی آئی ہیں۔

لیڈی مارکبی :۔ جی نہیں۔ مسز جان سے زیادہ جاذب ہستی میرے ساتھ ہے۔ انکا مزاج جب سے
وہ سیاسیات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ فی الحقیقت
جب سے دار العوام سود مند ہونے کی طرف کوشاں ہے اس سے بہت کچھ نقصان
پہنچ رہا ہے۔

چلٹرن :۔ معاف کیجیے ایسا نہیں ہے۔ اچھا یہ تو فرمائیے کہ وہ کون صاحب ہیں جن کو یہاں
لا کر آپ نے ہمیں ممنون فرمایا۔

لیڈی مارکبی :۔ انکا نام مسز شیویلی ہے! شاید ڈورسٹ شائر شیویلیز خاندان سے ہیں لیکن حقیقت حال
یہ ہے کہ میں ناواقف ہوں۔ فی زمانہ خاندانوں میں اسقدر آمیزش ہو چکی ہے کہ
کسی شخص کو ہم سمجھتے ہیں کچھ اور وہ نکلتا ہے کچھ اور۔

چلٹرن :۔ مسز شیویلی!! یاد پڑتا ہے کہ میں اس نام سے واقف ہوں۔

لیڈی مارکبی :۔ وہ حال ہی میں وینیا سے تشریف لائے ہیں۔

چلٹرن :۔ ہاں ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا وہ کون ہیں۔

لیڈی مارکبی :- مجھے یقین ہے آپ سے ملانے والی ہوں۔ (مسز شیولی سے) مائی ڈیر سر رابرٹ چلٹرن تو اشتیاق دید میں مرے جاتے ہیں۔

چلٹرن :- (سلام کرتے ہوئے) ہر کجا ہر شخص مسز شیولی کا متوقع ہے۔ دنیا میں جو ہمارے سفیر ہیں وہ تو سوائے انکے کچھ لکھتے ہی نہیں ہیں۔

مسز شیولی :- شکریہ سر رابرٹ۔ اشنائی جب تعریف و توصیف سے شروع ہوتی ہے تو یقیناً اسکا نتیجہ سچی دوستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسکی ابتدا کا یہ ٹھیک راستہ ہے مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ لیڈی چلٹرن کو میں پہلے سے جانتی ہوں۔

چلٹرن :- فی الحقیقت!

مسز شیولی :- جی ہاں۔ انہوں نے مجھے ابھی یاد دلایا کہ ہم دونوں مدرسے میں ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انکو ہمیشہ نیک چلنی کا انعام ملا کرتا تھا۔

چلٹرن :- (مسکراتے ہوئے) اور آپ نے کونسے انعامات حاصل کئے۔

مسز شیولی :- مجھے تو تعلیمی زمانہ کے بعد انعامات ملے اور شاید ان میں سے کوئی بھی نیک چلنی کا نہ تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔

چلٹرن :- مجھے یقین ہے کہ وہ کسی خاص دلفریب چیز سے متعلق ہونگے۔

مسز شیولی :- میں نہیں جانتی کہ آیا عورتوں کو ہمیشہ اپنی دلکشی و خوبروئی کا صلہ ملا کرتا ہے میں سمجھتی ہوں کہ اکثر انکو اسکا خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ آجکل نسوانی حسن کو اسکے پرستاروں کی وفاشعاری سے جسقدر نقصان پہنچتا ہے اسقدر کسی اور چیز سے نہیں۔ ورنہ کیا بات ہے کہ لندن کی تقریباً تمام حسین عورتوں کے چہروں پر مردنی سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

چلٹرن :- کسقدر ہیبت شکن فلسفہ آپ بیان کر رہی ہیں! آپکو مسز شیولی کسی گروہ میں شامل کرنیکی کوشش کرنا بے ادبی میں داخل ہوگا۔ لیکن کیا میں آپ سے یہ دریافت

کر سکتا ہوں کہ آیا آپ درحقیقت رجائی (Optimistic) ہیں یا قنوطی (Pessimistic) فی زمانہ تو صرف یہی دو مذہب رہ گئے ہیں۔

مسز شیویلی :۔ میں کچھ بھی نہیں۔ رجائیت کی ابتدا زہرخند سے اور قنوطیت کی انتہا سُلی عینک پر ہوا کرتی ہے اور سچی بات تو یہہ ہے کہ یہہ سب دکھاوے ہیں۔

چلٹرن :۔ گویا آپ فطرت کے موافق زندگی پسند کرتی ہیں۔

مسز شیویلی :۔ ہاں بعض اوقات لیکن یہہ اسقدر مشکل کام ہے کہ اسکا نبھانا ممکن نہیں۔

چلٹرن :۔ تو پھر علمائے نفسیات جن کا اسقدر چرچا ہے اس نظریہ کو کیا کہیں گے۔

مسز شیویلی :۔ عورتوں کی قوت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ نفسیات انکی تفسیر سے عاجز ہے۔ مردوں کو تحلیل کیا جاسکتا ہے لیکن عورتیں ...... صرف پرستش کیجا سکتی ہیں۔

چلٹرن :۔ کیا آپ کا یہہ خیال ہے کہ سائنس عورتوں کے معمہ کو حل نہیں کر سکتی؟

مسز شیویلی :۔ سائنس غیر ظاہر کی تشریح سے قاصر ہے یہی وجہہ ہے کہ اس دنیا میں اس علم کا مستقبل بھی تاریک ہے۔

چلٹرن :۔ گویا عورتیں غیر ظاہر کو تعبیر کرتی ہیں۔

مسز شیویلی :۔ ہاں خوش پوش عورتیں۔

چلٹرن :۔ (ذرا جھجک کر) معاف کیجیے کہ یہاں مجھے آپ سے اختلاف ہے لیکن ذرا بیٹھ جایئے اور فرمایئے کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے آپکو اپنے پر رونق شہر ویانا کو چھوڑ کر ہمارے غمکدہ لنڈن تک زحمت فرمائی پر مجبور کیا یا یہ سوال بیکار تو نہیں؟

مسز شیویلی :۔ سوالات کبھی بیکار نہیں ہوتے۔ ہاں جوابات بعض اوقات ہوا کرتے ہیں۔

چلٹرن :۔ خیر۔ بہرصورت کیا میں یہہ جان سکتا ہوں کہ غرض سیاسیات سے ہے یا صرف تفریح۔

مسز شیویلی :۔ سیاسیات ہی صرف میری تفریح ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آجکل چوچلے یا ناز نخرے کرنا تہذیب میں داخل نہیں جب تک کہ چالیس(۴۰) کی عمر نہ ہو جائے اسطرح ہم غریب

عورتوں کو جو تجسس کے اندر ہیں سوائے سیاسیات اور امور رفاہ عام کے اور کیا رہجاتا ہے۔ اور امور رفاہ عام میرے خیال میں صرف اُن لوگوں کا شیوہ ہے۔ جو اپنے دوست اقربا کو ایذا رسانی کے خواہشمند ہوں۔ میں سیاسیات کو ترجیح دیتی ہوں۔ میرے اپنے خیال میں یہی چیز۔۔۔ زیادہ موزوں ہے۔

چلٹرن: ۔ اس میں شک نہیں کہ سیاسی زندگی ایک شریف زندگی ہے۔

مسز شیویلی: ۔ بعض اوقات۔ اور بعض اوقات ایک چالاک بازی سر رابرٹ! اور بعض اوقات ایذا رساں۔

چلٹرن: ۔ آپ اِسکو کیا محسوس کرتی ہیں؟

مسز شیویلی: ۔ میں؟ ان تینوں کا مجموعہ (اپنا پنکھا گراتی ہے)

چلٹرن: ۔ (پنکھا اُٹھا کر دیتا ہے) اجازت دیجئے۔

مسز شیویلی: ۔ شکریہ

چلٹرن: ۔ لیکن آپنے ابتک یہہ نہیں فرمایا کہ لندن کی اسطرح اچانک عزت افزائی کا باعث کیا ہے۔ ہمارا موسم (بہار) تو تقریباً ختم ہے۔

مسز شیویلی: ۔ معاف رکھئے مجھے لندن کے موسم کی پروا نہیں۔ اس میں ازدواجیت کا زہر از حد سرایت کر گیا ہے۔ یہاں عورتیں یا تو شوہروں کے شکار میں رہتی ہیں یا ان سے گریز کرنے کی فکر میں۔ میں آپ سے ملنا چاہتی تھی یہہ بالکل صحیح ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ عورت کا انتہائے نظر کیا ہوا کرتا ہے۔ اتنا ہی بلند جتنا مرد کا۔ مجھے بے انتہا خواہش تھی کہ آپ سے ملوں اور۔۔۔۔۔ آپسے درخواست کروں کہ آپ میرا ہاتھ بٹائیں۔

چلٹرن: ۔ مسز شیویلی۔ مجھے امید ہے کہ وہ کوئی معمولی کام نہ ہوگا۔ میں ان چھوٹے چھوٹے کاموں کو بہت مشکل سمجھتا ہوں۔

مسز شیویلی: ۔ (کچھ غور کر کے) نہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ کوئی چھوٹا کام ہے۔

باقی

گاہے ماہے

اولڈ بوائے کے تیسرے جنم کے وقت میں اپنا ناچیز قلمی سا چق اخلاص کی کشتی میں لگا کر حاضر ہوا تھا
اس کے بعد سے بچہ کی درازی عمر کے واسطے گھر بیٹھے برابر دعا کرتا ہوں، البتہ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بچہ کیواسطے
پھر کوئی کھلونا بھی لیکر حاضر ہوتا۔ بھائی، میں اب بڈھا ہو چلا ہوں۔ نہ اب وہ مضمون آفریں امنگیں ہیں، نہ وہ
ولولہ انگیز جوش ہے طبیعت بجھ گئی، حوصلے پست ہو گئے، داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع خاموش ہوں ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل تو
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

خدا کے فضل سے فرزندان کالج اور فرزندان یونیورسٹی میں اب اسقدر نوجوان صاحب قلم موجود
ہیں، کہ انکے ہوتے ہوئے مجھ جیسے شکستہ قلم ریختہ نگار سے بھائی منظر کا متواتر خامہ فرسائی کی امید رکھنا
سراسر ظلم ہے ؎

چو باد صبا در گلستاں وزد　　　　چمیدن درخت جواں را سزد

یہ اور بات ہے کہ گاہے ماہے دیرینہ احباب کی الفت لازوال کا جزبہ تخیل نا قلم میں حرکت
پیدا کر دیتا ہے اور مولانائے روم کی نالہ کُن نے کیطرح اوس سے داستان جدائی پیدا ہو جائے۔
کسقدر نا انصافی ہے کہ بھائی منظر کو بھی دلی میں میری چند دعوتیں کھانا ناگوار ہے، حالانکہ احباب
حیدرآباد کی مہمان نوازی ہے حضرت کو خود ایک مہینہ میں مشکل سے دو تین وقت اپنے مکان پر کھانا
کھانیکی نوبت آتی ہے اور مولانا شوکت علی صاحب کے حیدرآباد میں قیام کے زمانہ میں تو ہفتوں بھائی منظر کے

باورچی خانہ میں آگ نہیں جلی ۔

مجھے نہایت مسرت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کوآپریٹیو سوسائٹی کی اسکیم پردۂ تخیل سے نکل کر میدان قرطاس پر آگئی۔ خدا وہ دن کرے کہ یہ کاغذی پیکر ہماری آنکھوں کے سامنے عملی صورت میں آجائے۔ تجارت کے معاملات میں مجھے اسقدر ید طولیٰ حاصل ہے جسقدر بھائی منظر کو قانونی مسائل میں۔ اسکے متعلق اگر آپ کو کوئی سودمند مشورہ دے سکتے ہیں تو بھائی بشیر مرزا صاحب (جو کہ کلکتہ کے دارالتجارۃ میں ایک عرصہ سے وثیقہ نویسی کر رہے ہیں) یا ہماری اور بھائی منظر کی کاروباری زندگی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہاں یونیورسٹی کے احاطہ میں اگر اس کام کو کوئی چلا سکتا ہے تو وہ دو گرامی مولانا یعنی اے۔ صاحب ایم۔ ایل۔ سی اور استاذی خاں صاحب میر ولایت حسین صاحب ہیں۔ جن پر بفضلہ تعالیٰ حال میں جوانی لوٹ کر آئی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ یہ دونوں صاحب کوآپریٹیو سوسائٹی کی گاڑی کو باد رفتار طیارہ کیطرح اڑائے پھریں گے۔ اس سے زیادہ لکھنے کیلئے خیال کا میدان تنگ ہے۔

اولڈ بوائے میں کبھی کبھی یاران نجد کے دم بادم کے مضامین دیکھکر دل باغ باغ ہو جاتا ہے انمیں سے بہت سے احباب کو دیکھے ہوئے سالہا سال گذر گئے۔ انکی صورت دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں اور انکے پر لطف صحبتوں کو دل ڈھونڈتا ہے۔ کاش! وہ طالب علمی کا زمانہ پھر لوٹ آتا اور پھر وہی صحبتیں اور وہی دلبستگی کے سامان مہیا ہو جاتے۔

وقت پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

خدا جانے مادر کالج سے کیوں اسقدر انکو بے اعتنائی ہوگئی کہ کبھی برسوں میں بھی ایک مرتبہ میکہ کا نام نہیں لیتے۔ سالہا سال گذر گئے کہ اولڈ بوائز ڈے محض ایک سالانہ رسم کیطرح منعقد کیا جاتا ہے۔ میں تو کئی سال سے یہی دیکھتا ہوں کہ ڈے کے موقعہ پر بھی گرد و نواح علی گڈھ کو چھوڑ کر باہر کی سہاگن بیٹیاں مشکل سے دو ایک نظر آجاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دنیوی مکروہات میں مبتلا ہو کر گھر بار چھوڑنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن اگر دلمیں میکہ کی محبت کچھ باقی ہو تو غیر ممکن ہے کہ پانچ چار سال کے بعد بھی ایک مرتبہ دو تین روز کے لئے وقت نہ نکل سکے۔ اولڈ بوائز ڈے کو کامیاب بنانے کے تدابیر سوچنا ہے۔ اگر ہم میں سے ہر ایک پانچ برس میں

ایک مرتبہ حریم کالج کا طواف اپنے اوپر فرض قرار دیتے تو ہر سال سیکڑوں زائر عرفاۃ علی گڑھ پر جمع ہو جایا کرتے، غرضکہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو پُر رونق بنانے کے واسطے ہمارے میکدہ سے ساقی کو ذرا زیادہ انجمن آرائی کی ضرورت ہے۔ الفت کی مئے کہن کو کچھ ایسا دو آتشہ بنا دیں کہ ایک مرتبہ جسکے منہ کو لگجائے پھر عمر بھر اُس کا نشہ نہ اُترے۔ سال بھر میں محض ایک مرتبہ زاہد خشک کیطرح صلائے عام کا جام سفالیں پیش کرنا افسردگان چمن کے پژمردہ دلوں میں جان ڈالنے کیواسطے کافی نہیں ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ڈنر کی تاریخ سے مہینوں پہلے نوید وصل ارباب وفا کے کانوں میں پہونچ جائے اور پھر بار بار وعدہ وصل کو بتکرار التجا سے دُہرایا جائے تب کہیں جذبۂ دل کی آزمائش اور امتحان ہو سکتا ہے ہر ڈنر کے موقعہ پر تفریحات اور مشاغل کا نت نیا دل آویز اور دلچسپ پروگرام تیار کیا جائے۔ مثلاً اولڈ بوائز اور طلبائے حال کے آپس میں کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، اور ٹینس کی میچیں پیشتر سے مقرر کیجائیں، اور اسطرح پر علاوہ سامان تفریح کے، مادر کالج کی کنواری بیٹیوں کو اپنے سہاگن بہنوں سے ملنے جلنے اور موانست پیدا کرنے کا موقعہ ملجائے۔ چند سال سے یہہ بہت بری رسم قائم ہوگئی ہے کہ طلبائے سابق و حال کو اولڈ بوائز کے اجتماع کے موقعہ پر شکل اقلیدس کے خطوط متوازی کی طرح ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جاتا ہے، یہانتک کہ گذشتہ ڈنر کے موقعہ پر بڑے اور چھوٹے بھائیوں کو ایک وقت ایک ساتھ کھانا کھانیکا موقعہ بھی نہیں ملا۔ اسی مغائرت اور اجنبیت کا یہہ نتیجہ ہے کہ کالج سے نکلنے کے بعد بھی بھائیوں کی ایک نسل دوسری نسل سے اکثر ناآشنا اور غیر مانوس رہتی ہے۔ اور رشتۂ الفت جو قیام کالج سے سرسید علیہ الرحمہ کا مقصود اصلی تھا وہ روز بروز کمزور اور بودا پڑتا جاتا ہے۔ ہمارے اس اجتماع ملی کو زیادہ پر رونق بنانے کی ایک صورت یہہ بھی ہے کہ جسطرح میلوں، عرسوں، اور تیرتھوں کے جاتریوں کے واسطے ریلوی رعایتی ٹکٹ جاری کرتی ہے اسیطرح اولڈ بوائز ڈنر کے واسطے بھی کنسشن ٹکٹ جاری کرانے کی کوشش کیجائے اس معاملہ میں ہمارے پُر جوش بھائی مسٹر غلام محمد صاحب جنھوں نے ریل کے محکمہ میں ایک علی گڑھی بٹالین قائم کردی ہے بہت کچھ امداد کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اس ترغیب کیوجہہ سے ڈنری جاتریوں کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ ہو جائیگا۔

اسوقت مسلم یونیورسٹی کی مختصر تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ نے مسلم پبلک میں ایک قسم کی سنسنی پیدا کردی ہے اور عرصہ کے بعد اب پھر اخبارات میں لیلیٰ مجنوں کی داستانیں نظر آتی ہیں مرغ موسم نما کی حرکت بتاتی ہے کہ عنقریب یونیورسٹی کے آئین اور نظام عمل میں اہم تغیرات رونما ہونیوالے ہیں۔ کیا فرزندان کالج کا یہہ فرض نہیں ہے کہ اس عالم رستخیز میں اپنے سو کام بند کرکے ایک مرتبہ علی گڑھ آئیں اور اپنی آنکھوں سے وہاں کی حالات دیکھیں اور اپنے کانوں سے واقعات سنیں۔ حالت بیماری میں اپنے اوپر تکلیف گوارا کرکے آپ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو دیکھنے اور انکی عیادت کرنے کیواسطے جاتے ہیں جن سے بن پڑتا ہے بیمار کی کچھ خدمت اور تیمارداری بھی کرتے ہیں، طریق علاج اور انتخاب اطباء کے متعلق رائے دیتے ہیں اور جسطرح بن پڑتا ہے بیمار کے تکالیف کم کرتے اور اس کا دل بہلانے کے تدابیر کرتے ہیں۔ آج ہماری خردسال یونیورسٹی بیمار اور علیل ہے۔ رحمت اللہ کمیٹی کے ڈاکٹروں نے تشخیص مرض کرکے نسخہ تجویز کردیا ہے لیکن جبتک دوا کا ٹھیک وقت پر اہتمام کے ساتھ استعمال کرایا جائے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟ فرزندان کالج کسی طرح حق مادری سے سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ اگر وہ اسوقت بھی کروٹ نہ لیں اور مریض یونیورسٹی کی تیمارداری اور مداوا میں شریک نہوں۔ میری ناچیز رائے یہہ ہے کہ اس مرتبہ نومبر کے مہینہ میں دیوالی کی تعطیل میں اولڈبوائز ڈنر منعقد کیا جائے اور ہمارے بھائیوں سے جہانتک ممکن ہو کثرت سے اس میں شرکت کی کوشش کریں اور ایک جگہ جمع ہوکر ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ علی گڑھ کے منور چہرہ پر جو دھبہ اور داغ آگئے ہیں وہ کسطرح صاف ہوسکتے ہیں۔ اس تجویز کو ابھی سے اس امید پر شایع کرتا ہوں کہ منتظمین ایسوسی ایشن کو اہتمام اور انتظام کیواسطے کافی وقت ملجائے اور ہمارے بھائی جو کثرت مشاغل کے شکوہ سنج رہتے ہیں، وہ بھی پہلے سے اپنے نظام الاوقات میں کچھ گنجایش رکھ لیں۔ مجھے امید ہے کہ "اولڈبوائے" بھی اس تجویز کی تائید میں پوری سرگرمی کیساتھ میرا ہم آہنگ ہوگا، اور بھائی منتظر خود بھی ایکمرتبہ احرام سفر باندھکر علی گڑھ کا رخ کریں گے۔

خاکسار محمد یعقوب، ازمرادآباد

باقی داستان فردائے شب۔

ڈاکٹر ناظر یار جنگ

ہم ایک مدت تک حیدرآباد کے مشاہیر عصر حاضرہ کے حالات جمع کرنے میں سرگرداں رہے اور بالآخر اسقدر کامیاب ہوئے کہ ایک کتاب کے لائق مواد ہمارے پاس جمع ہوگیا۔ اب خصوصیت کیساتھ فرزندان علی گڑھ کے حالات کو یکجا کرنے کی فکر ہے۔ کام مشکل ہے، اور خدا ہی سے توفیق استقلال کیلئے دست بدعا ہیں۔ اپنے اگلے پچھلے سال سے) ہم چاہتے ہیں کہ "اولڈ بوائے" کے صفحات بھی رنگین کرتے رہیں، اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے مختلف مدارج کے اولڈ بوائز کے حالات ہم پہنچائیں۔ کتاب کے لائق مواد فراہم ہوجائے گا، تو ہم اس کی اشاعت کی سعی بھی کریں گے۔ ہمارے ناظرین امید کہ اس جانب متوجہ ہونگے، اور اپنی ذات سے متعلق ہمارے سوالات کو حل فرماکر روانہ فرماوینگے۔ - اولڈ بوائے

ناظر یار جنگ بہادر (آنریبل نواب ... ڈاکٹر ناظر الدین حسن) خلف مولوی نظام الدین حسن صاحب مرحوم، سابق رکن عدالت العالیہ سرکار آصفیہ و ڈپٹی کمشنر صوبہ برار۔ ۲ مارچ ۱۸۸۱ء کو اپنے وطن قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتبی تعلیم کے بعد مدرستہ العلوم علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ جہاں گیارہ سال زیر تعلیم رہکر ۲ نومبر ۱۹۰۲ء کو بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہ امر بطور خاص قابل ذکر ہے کہ مقررہ نصاب میں عربی کو خصوصیت کے ساتھ جگہہ و یکجائی رہی، بلکہ عربی کی خاطر گھر پر بھی سعی کیگئی۔ سنہ ۱۹۰۴ء کے آخر آخر یورپ میں تعلیم کا آغاز ہوا، جہاں کیمبرج، لندن، اور ڈبلن میں تعلیم پاکر ایم۔ اے۔ ایل ایل بی اور ایل ایل ڈی کی ڈگریاں حاصل فرمائیں۔ دوران تعلیم میں اپنے اساتذہ سے صداقت نامہ حاصل فرماتے رہے۔

۲۰ رجنوری ۱۹۰۹ء کو بیرسٹر بنے، اور چند روز بعد انگلستان میں پریکٹس شروع کر دی۔ قیام انگلستان کے زمانہ میں اسکاٹ لینڈ، فرانس، جرمنی، اور سوئٹزر لینڈ کی سیاحت فرمائی، اور واپسی کے وقت مراکش، ہسپانیہ، قسطنطنیہ، اور قاہرہ کی سیر کی۔ یورپ کے قیام اور وہاں کے طرز ماند و بود سے اسقدر اثر پذیر ہوے اکہ ہمیشہ کیلئے خاص مشرقی بن گئے لیکن اس باب میں بڑا دخل مولوی نظام الدین حسن صاحب مرحوم کی اعلیٰ تربیت کو حاصل ہے، جو اپنے فرزند کیجانب سے ایک آن غافل نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر ناظر گھر پر رہے یا باہر، علیگڈھ میں قیام کیا یا ولایت میں، بہر حال ایک ضعیف العمر اتالیق ہمیشہ سایہ کیطرح انکے ساتھ رہے۔ ان بزرگوار کی نورانی صورت علیگڈھ میں ہمیں بھی نظر آتی تھی۔

ناظر الدین صاحب علی گڑھ میں کمانڈر کے لقب سے شہرت عام رکھتے تھے۔ اس کی وجہہ یہ تھی کہ جس زمانہ کو موجودہ نسل کے نوجوان، کرکٹ فٹبال وغیرہ پر صرف کرتے ہیں، ڈاکٹر ناظر اُسے فوجی قواعد، شہسواری، اور پولو پر صرف کیا کرتے تھے حقیقت حال یہ ہے کہ جو روح اس زمانہ میں ان کے اندر پیدا ہوئی تھی، اب تک تو ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ گھوڑے کی سواری کا شوق ایام طالب علمی میں ان کو بدرجہ غایت تھا۔ نواب سر افسر الملک بہادر کی بزرگانہ توجہہ نے اس شوق سے متعلق گویا سونے پر سہاگہ کا کام کیا، اور ڈاکٹر ناظر الدین کو امپیریل سروس لانسرس میں سواری کی مشق کا کافی موقعہ مل گیا جنگ عظیم کے دوران میں جب ہندوستان کی مدافعتی فوج کی تحریک ہوئی، تو انھوں نے بھی الہ آباد یونیورسٹی کور میں شرکت کر کے ۱۹۱۷ء میں لکھنؤ اور دیرہ دون میں فوجی تربیت حاصل کی۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ بیسوی صدی عیسوی کا پہلا دہا ختم ہوتے ہوتے، ڈاکٹر و بیرسٹر ناظر الدین صاحب ولایت سے وطن تشریف لے آئے، اور ۱۹ دسمبر ۱۹۱۰ء سے اپنے والد ماجد کے حکم سے لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی۔ لکھنؤ جیسے مقام پر غیر معمولی ذہن و ذکا کا آدمی کامیابی حاصل کیا کرتا ہے۔ ڈاکٹر ناظر بھی اس قسم کے نوجوان تھے کہ تھوڑے عرصہ میں اپنے ہم پیشہ لوگوں کی صف اوّل میں آ گئے۔ اس زمانہ میں انکی وکالت کی شہرت اسقدر ہو گئی تھی کہ دور دور جانے لگے تھے۔

حضور پرنور کے حکم محکم پر ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ ف کو سرکار آصفیہ کی ملازمت میں داخل ہوے،

اور نظامت صدر عدالت اورنگ آباد پر مامور فرمائے گئے۔ وہاں سے میدک، اور میدک سے گلبرگہ کا تبادلہ ہوا۔ جمادی الآخر سنہ ۱۳۴۳ھ کو تقریب سالگرہ مبارک، ناظر یار جنگ کے خطاب سے سرفرازی پائی۔ بہمن سنہ ۱۳۳۴ف میں رکنیت عدالت العالیہ پر ترقی یاب ہوئے۔

نواب ناظر یار جنگ بہادر من حیث مُصلح و مقرر، ایک خاص سیرت رکھتے ہیں، جس کا اثر علی العموم اُنکے حلقۂ احباب اور سوسائٹی پر پڑتا ہے۔ خدا کرے یہ بات ان کے فرزند مصطفےٰ کمال الدین حسن محمد غازی الدین حسن، اور محمد مظفر الدین حسن کو بھی حاصل ہو۔

ہمارے بھائی سردار اشرف خاں بہادر (گجرات پنجاب) میں بیٹھ کر بھائی ناظر گوالیاری کی طرح فرماتے ہیں کہ اولڈ بوائے کو حیدرآبادی نہ بناؤ۔ اور اسکے صفحات سارے ہندوستان کیلئے یکساں کھلے رہنے دو۔ بھائی کا یہ ارشاد ہمارے سر آنکھوں پر لیکن ہمارے تمام بھائی تھوڑی سی فکر فرما کر ہمیں یہ بتائیں کہ ہمارے پاس اُن کے گھروں کے حالات معلوم کرنے کے وسائل کیا ہیں؟ اِدھر اُدھر سے جب کبھی کوئی خبر ہم تک پہنچ جاتی ہے، ہم نمک مرچ لگا کر اس خوانِ نعمت پر ضرور چن دیا کرتے ہیں۔ سال میں ہر بھائی پر کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا ضرور گزرتا ہے، جس کے اثر سے دوسرے بھائی بھی لذت گیر ہوں، مگر شاید ہی کوئی صاحب ایسے ہوتے ہونگے جو اپنی خوشی میں ہمیں بھی شریک فرما لیا کرتے ہوں، ورنہ ہمیں خود ہی دوسرے کاموں کے ساتھ ہی خبروں کی تلاش بھی کرنی پڑتی ہے۔ اب رہا حیدرآباد، یہ بجائے خود اولڈ بوائز کی ایک دنیا ہے، جس میں ملک کے طول و عرض کے رہنے والے علیگڈھ کے نام لیوا موجود ہیں۔ یہ لوگ ہماری گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ ہم نہایت خوشی کے ساتھ اپنے تمام بھائیوں کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہر وہ اولڈ بوائے جس کو اپنے اس رسالے سے دلچسپی ہے، اسکے صفحات کی ایک ایک سطر کو اپنے کام میں لاسکتا ہے۔

شادی بریگیڈ

ترانے کی دھوپ میں اولڈ بوائز کا ایک زبردست بریگیڈ نواب احمد بیگ خاں (جنہوں نے کالج میں تعلیم تو نہیں پائی مگر کھلنڈروں کی صحبت میں اچھے خاصے .... مکمل ہو گئے ہیں) شادی کی وجہ سے کئی دن خیریت آباد سے کبھی چار مینار اور کبھی سیف گلشن پہ دہاوا کرتا رہا (محفل عقد میں اکثر سہرے پڑھے گئے تو چچا نے اپنے بھتیجے کی طرف دیکھا (یہ علیگڈھی رشتہ ہے) بھتیجے بھی سعادتمند بھتیجے کہاں رکنے والے تھے فوراً شعر لکھنا شروع کر دیے اور چچا کو بھی سگریٹ سوز کا خطاب عطا کر دیا۔ اصل مسودہ سلسلہ بسلسلہ ہم تک پہونچ گیا اور ہم اُسے شائع کئے دیتے ہیں۔ اولڈ بوائے

میکدۂ نشاط میں چلنے دے بادۂ کہن
فضل خدا سے ساقیا جمع ہیں آج نورتن

آج دِلوں سے دُور ہیں اِسطرح رنج اور محن
رحمت حق سے جسطرح رہتا ہے دور اہرمن

سیف نواز جنگ کے گھر پہ ہے ایک اژدہام
جمع ہوئے ہیں ایک جا صاحب سیف اہل فن

بزم طرب کی یوں مثال صحن چمن سے کسطرح
کھلتے نہیں ہیں ایک جا گیندا گلاب نسترن

سرو خرام باغ عام پینے یہی میاں جمال
جن کی ہوا سے مشک بیز نافۂ آہوئے ختن

ناظم بزم رقص ہیں قاسم اکل و شرب ہیں
ہانپ رہے ہیں ظاہراً دل ہے مگر مگن مگن

گاہ بشان مسخری گاہ بطرز دلبری
آغا کے بھی زبان پر لطف کے آج ہیں فن

غوث کے زرق برق ٹھاٹھ رشتی کی چھڑ ہے ید
کچھ تو ہے سینے کا ابھار چست بھرا سپہ پیرہن

جلوہ فروز بزم ہیں صاحب چشم پُر فسوں
اور بنے ٹھنے ہوئے اک طرف ابو الحسن

[illegible] انبساط کی مار رہے ہیں ڈائیں ڈول — بزم میں زین العابدیں ماتھے پہ ڈالے شکن
[illegible] سوز گھور رہے ہیں دور سے — ہاتھ میں لیکے کیمرا حُسن کے بنکے ممتحن
بچھڑوں [illegible] سینگ کاٹ کر آئے ہیں ڈاکٹر لطیف — آج کے دن اتار کر گاندھی اپنا پیرہن
بت کی [illegible] ل میں چھپے ہوئے بدن چرائے — بیٹھے ہیں سب کے بیچ میں دلھا بنے ہوئی دلہن
سہرے [illegible] بوجھ سے کھاتی ہے تین بل کمر — موتی کے لڑ کا بوجھ کچھ پھول میں سر پہ ایک من
ماں [illegible] پھول بنوں کے اشتیاق کے — سہرے میں یوں تو ظاہرا گوندی گئی ہے یاسمن
گل سے ہیں دیدوں کس طرح رُخ کی لطافت مثال — پھول ہیں کب یہ نازکی غنچہ کا یہ کہاں دہن
ناک ذرا اُٹھی ہوئی آنکھ میں ہیں جلا وتیں — ابرو کھچے ہوئے کماں اور وہ جبیں پہ شکن
چہرے پہ وہ چمک کہ تک بجلیاں لپک کوندجائیں — سہرے کو ہاتھ سے ہٹا دیکھی جو سوئے انجمن
نکلے نقاب روئے یار چشم نظارہ میں سے بیر — کلیوں کا آج یہ دماغ پھولوں کا آج یہ چلن

پھول اُمید کے کھلے، دورے انبساط کا
پوری وہ آج ہو گئی دلمیں لگی تھی جو لگن

(شمشاد)

تسلیم - مزاج شریف - نواب عنایت جنگ بہادر کے یہاں آپ نے رسالہ "اولڈ بوائے" لطف فرمایا تھا۔ اسیروز میں نے پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ بڑی دلچسپی سے وقت گزرا۔ مولوی اشتفاق علی صاحب نے لکھا ہے کہ اس مرتبہ اچھی زمین میں جنم لیا ہے۔ توقع ہے کہ اولڈ بوائے کو عمر ابدی ملے گی" اچھی دعا، اچھی توجہ۔ میں بھی اس دُعا کا شریک ہوں حقیقت میں اس کام کو آپنے پھر جو زندہ کیا تو اولڈ بوائز علیگڈھ پر احسان فرمایا ہے۔ مولوی ناظر حسن صاحب انصاری کی بتائی ہوئی تجاویز بہت مفید ہیں بہت ممکن ہے کہ اس پرچہ کے احیا میں اُن سے کافی مدد ملے۔۔۔ خدا ایسا کرے کہ ہر طرف سے صدائے لبیک آپکو سنائی دے۔ علیگڈھ کے کھلنڈروں کو بھی تلاش کرونگا جو ملے گا آپکی طرف رجوع کرنیکی کوشش کرونگا۔ علمی خدمات کیلئے آپکی ہستی مغتنمات سے ہے۔ خدا تعالیٰ آپکو باصحت و عافیت سلامت رکھے۔ خاکسار غلام غوث خاں

بھوپال میں ھاکی

مکرمی۔ السلام علیکم۔

پرچہ بلا بعض مضامین کی تفصیل ہی دیکھنے پایا تھا کہ چھپا لیا گیا اگر تعجب ضرور ہے کہ میرے مضمون کو جگہ دیکر میری ہمت افزائی نہ کی گئی معلوم نہیں یہ خفگی کیوں ہے خیر اب آپکو ایک آدھ خبر سے مطلع کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ لے اب سنیئے۔

دوسری مئی سے دس مئی تک یہاں آل انڈیا اقتدا ھاکی ٹورنامنٹ ہوا علیگڈھ کی ہاکی ٹیم بھی آئی تھی سب ملا کر کل بارہ ٹیمیں تھیں سیکرٹری اس کپ کے ہمارے میجر ممتاز صاحب تھے۔ یہ سن کر یقیناً آپکو افسوس ہوگا کہ علیگڈھ کی ٹیم نواب پٹھاری کی ٹیم سے جس میں کہ سب جبل پور کے چیدہ چیدہ پلیرز کھیل رہے تھے سیمی فائنل میں ہار گئی۔ کھیلے نہایت اچھا مگر کچھ ناتجربہ کاری اور کچھ فیلڈ کے اچھے نہ ہونے کی وجہ سے ان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ٹیم میں پرانے صرف دو تھے باقی سب نئے تھے ان وجوہ سے انکے ہار جانے سے ایسا زیادہ افسوس نہیں ہوا۔ بہرحال علیگڈھ کو جیت کر ان لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مجرے بار تک کی نوبت پہونچ گئی تھی۔ اب فائنل آکر سلطانیہ پائنیر بھوپال سے پڑا جس میں تین علیگڈھ کے بیچارے اولڈ بوائز بھی کھیل رہے تھے ایک تو سکنڈ لفٹنٹ سید وزیر علی مشہور کرکٹر دوسرے منظور حسین کیڈیٹ اور تیسرے خواجہ علاء الدین کیڈیٹ یعنے یہ خاکسار۔ مجمع بکثرت تھا تمام افسرانِ ریاست و نواب زادگان شریک تھے۔ ہمارے اعلیحضرت سکندر صولت نواب صاحب بہادر چونکہ دورے پر تھے اسوجہ سے شریک نہ ہوسکے مگر نتیجہ معلوم کرنے کے لئے بیچین تھے چنانچہ ٹیلیفون کے ذریعہ سے خبر رسانی کا سلسلہ جاری رہا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم لوگوں نے کھیل شروع ہوتے ہی آٹھ سکینڈ میں ایک گول کر دیا۔ ان لوگوں نے دس منٹ تک سب

وہ گول ادا کردیا۔ کھیل بہت تیز ہورہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم نے پھر ایک گول کیا پھر انھوں نے
چند منٹ میں اُسے ادا کردیا۔ اتنے میں ہاف ٹائم ہوا پانچ منٹ کے وقفہ کے بعد
پھر کھیل ویسی ہی تیزی سے شروع ہوا اور برابر ہوا کیا۔ جب خاتمہ میں دس یا بارہ منٹ باقی تھے۔
ہم لوگوں نے پھر ایک گول کیا اور اسکے تین ہی چار منٹ کے بعد ایک اور کردیا۔ اب انکے دل ٹوٹ
چکے تھے۔ چنانچہ پانچ چار منٹ کے بعد خاتمہ بھی ہوگیا۔ اسطرح ہم لوگوں نے چار گول کئے اور
انھوں نے دو اور ہم لوگ دو گول سے جیت گئے۔ فوراً نواب صاحب کو ٹیلیفون کے ذریعہ سے خبر پہنچائی
گئی جس کو سنکر اعلیٰحضرت بیحد خوش ہوے۔ کپ اور مڈل نواب زادہ کپتان سعید الظفر خاں صاحب نے تقسیم
کئے۔ کپ اور سونے کے مڈلز ہم لوگوں کو یعنے سلطانیہ پائنیر بھوپال کی ٹیم کو ملے اور چاندی کے مڈلز نواب صاحب
پٹھاری کی ٹیم کو جو دوسرے رہے۔ دو اسپیشل پرائز دیے گئے ایک علیگڈھ کے
لفٹ آوٹ مسٹر علی ظہیر کو اور دوسرا نواب صاحب پٹھاری کے سنٹر ہاف مسٹر مرتضیٰ آف جبل پور کو۔ اب جا کے
علیگڈھ کی ہار کا غم غلط ہوا کیونکہ اس ٹیم کو (Charnpion) کہنا چاہیے۔ اب گویا
ہم لوگ چیمپین ہوگئے کیونکہ ہم لوگوں نے تین سال متواتر اس کپ کو جیت لیا ہے۔ اس سے بھی مطلع کرنا ضروری
سمجھتا ہوں کہ علیگڈھ ٹیم نواب زادہ کپتان رشید الظفر خاں صاحب کے دولتکدہ شملہ کوٹھی میں مہمان تھی۔
جملہ سامان آسائش و آرام ٹیم کیلیے مہیا تھے۔ ہر وقت دو تین موٹر کاریں انکی سواری کے لئے تیار رہتی
تھیں۔ یہ غالباً جناب کو معلوم ہی ہوگا کہ نواب زادہ صاحب علی گڑہ ہی میں سکینڈ ایر میں تعلیم حاصل
کر رہے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اس سال ڈیڑھ سال ہی کے عرصہ میں علیگڈھ کی سچی اسپرٹ کوٹ کوٹ
کے ان میں سرائت کر گئی ہے اور کالج میں نہایت ہردلعزیزی انکو حاصل ہے۔ اور خاص کر علیگڈھ کا
ہاکی کلب تو انکا بیحد ممنون ہے کیونکہ نواب زادہ صاحب نے ہمیشہ اُس سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور
برابر دامے درمے سخنے۔ قدمے اسکی مدد کرتے چلے آئے ہیں۔ ہاکی کلب والوں کی یہ خواہش ہے کہ
ہاکی کے لیے بھی ایک پویلین بن جائے جیسا کہ کرکٹ کا ہے اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے
بلکہ نہایت معمولی سی بات ہے کیونکہ انکی قومی امید ہے کہ نواب زادہ صاحب انکی اس خواہش کو پورا

کر کے ممبران ہاکی کلب کی ضرور ہمت افزائی فرمائیں گے اور اپنے یہاں کی مخیرانہ شہرت کو ضرور قائم رکھیں گے۔

آخر میں ہم نوجی اولڈ بوائز نے نان ونمک سے اپنے چھوٹے اور عزیز بھائیوں کی تواضع کی۔ اس میں سول کے اولڈ بوائز صاحبان بھی شریک تھے۔ نواب کیپٹن سید الظفر خاں صاحب ونواب زادہ کیپٹن رشید الظفر خاں صاحب نے بھی شرکت فرما کر ہم لوگوں کی ہمت افزائی فرمائی تھی۔ اس دعوت کی کامیابی کا سہرا ہمارے میجر ممتاز صاحب وسکنڈ لفٹنٹ ظہور احسن خاں صاحب کے سر ہے۔ ڈنر ختم ہونے پر لمبی لمبی تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہمارے طرف سے حسن محمد حیات صاحب سکرٹری لجسلیٹو کونسل یعنے (لارڈ حیات) نے جواب دیا اور قریب ایک گھنٹہ تک بولے۔ اپنے بھائیوں کو انکے فرائض سے آگاہ کیا اور بتایا کہ تمہارا تعلق یونیورسٹی سے دائمی رہنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ ڈگری خریدی اور چلدیئے۔ اور یہی علیگڈھ کی خاص خصوصیت ہے جو اور جگہ نہیں ملے گی۔ غرض کہ بہت سی مفید باتیں انکو بتائیں۔ اسکے بعد کھانا بڑھایا گیا۔ اور سب صاحبان قوالی سننے میں مشغول ہوئے یہ سلسلہ رات کے دو بجے تک جاری رہا۔ وہ کچھ عجیب سین تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ہر فرد خوش وخرم نظر آتا تھا معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ سب سگے بھائی ہیں! اور یہ ہمیشہ ہنسنے اور خوش رہنے کیلئے دنیا میں پیدا کئے گئے ہیں۔ میرا تو یہ ایمان ہے کہ سر سید الرحمتہ کی روح کو اسوقت خاص مسرت ہو رہی ہوگی کیونکہ اس برگزیدہ ہستی کا توشش ہی یہی تھا کہ مسلمان آپس میں شیر وشکر ہو کر رہیں جس کی تکمیل کیلئے علیگڈھ میں اس درسگاہ کی بنیاد ڈالی گئی جو بفضلہ یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ہم انکے ہیں اور وہ ہمارے ہیں۔ ۱۳ مئی کو میل ٹرین سے علیگڈھ ٹیم واپس گئی۔ اسٹیشن پر بھی اولڈ بوائز کی معقول تعداد تھی۔

نیاز مند خواجہ علاء الدین۔ بھوپال

یادِ ایام

(۳)

اپنے چھوٹے بھائیوں کی اطلاع کیلئے جو اسوقت طالب علمی کے زمانہ میں کھیلوں میں قدم زن ہیں عرض کرونگا کہ اچھا دوڑنے والا بننے کیلئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اوّل یہ کہ جسم کو قابو میں رکھا جائے اور دوسرے دوڑنے کے وقت قدم کی لمبائی۔ کامیابی ان دو باتوں پر منحصر ہے۔ جسم قابو میں رکھنے کو سب سے پہلے اپنے زائد گوشت اور چربی کو کم کر دو۔ یہ اسطرح ہوگی کہ غذا زیادہ مرغن نہ کھاؤ۔ پانی کم پیو۔ مصالحدار غذا نہ کھاؤ۔ جو اور دلیئے کا زیادہ استعمال کرو۔ اور صبح کو ورزش کے بعد سارے جسم کو کھردرے تولئے یا ٹاٹ یا کمبل کے ٹکڑے سے خوب ملو کہ پسینا آجائے۔ گرم گرم اگر ٹھنڈے پانی میں کود جاؤ تو نقصان نہ ہوگا۔ بشرطیکہ بدن بالکل سرد نہونے پائے۔ دوڑنے میں تین چیز کا خیال رکھو۔ قدم کی زیادہ سے زیادہ لمبائی۔ دوسرے یہ کہ سارے قدم برابر لمبائی کے ہوں تیسرے قدم کی یکے بعد دیگرے تیزی۔ میں نے اپنے قدم کو دس فیٹ تک بڑھایا: یعنے ایک قدم دوڑنے کے وقت دس فیٹ ہوتا تھا۔ لمبائی بڑھانے کیلئے پانوں اور گھٹنوں اور ہپس کی جرک (Jerk) سے کام لو۔ پنجوں پر دوڑو۔ دوڑتے وقت اگر پانوں کے پنجوں کی جرک سے اچھلنے اور گھٹنے کی جرک سے پانوں آگے ڈالنے اور ہپ کی جرک سے ساری ٹانگ دور آگے ڈالنے کی کوشش کروگے تو اپنے قد کے لحاظ سے لمبے سے لمبا قدم حاصل کر سکوگے۔

ادھر بہ سر مطلب جب میں کھیل کود میں شریک ہونے لگ گیا اور عہد توڑ کر نیکر و پتلون پہننا بھی شروع کر دیا تو شوکت صاحب کی خوشی کی حد نہ تھی (اب تو وہ میری پتلون اور ٹوپی سے بیزار ہیں۔ اجمیر میں

ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ لپٹ تو گئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ روپے میں ۱۲ر تو بھتیجا ہو)

اسوقت میں یونین اور کالج کے درمیانی بنگلہ میں رہتا تھا۔ گوشہ جنوب مشرق کے کمرے میں مولانا حالی صاحب رہتے تھے۔ میری دیوانگی موہوم کامیابی کے مقابلے میں ابھی بہت باقی تھی۔ ایکروز (ماہ جون میں) مولانا حالی صاحب جو عموماً بہت سویرے اُٹھتے اور بنگلے کے سامنے اپنی دھن میں قدم زن ہوتے تھے۔ صبح ہی سویرے میرے پاس آئے اور مجھ سے میرا حسب نسب پوچھ کر فرمانے لگے کہ تم بیمار ہو۔ رات تم بے آرام تھے تم رات بھر سوئے نہیں اور تمام رات پھرتے رہے ہو۔ میں تم کو ایک خط دونگا وہ لیکر تم حکیم واصل خاں صاحب کے پاس دہلی جاؤ اور علاج کراؤ۔ فوراً ہی وہ اندر جا کر دو خط لکھ لائے۔ ایک حکیم صاحب قبلہ کے نام اور دوسرا نواب احمد سعید خاں صاحب کے نام کہ انکے پاس ٹھہرنا۔

میں نے اس کو تائید ایزدی سمجھا اور دوسرے دن دہلی گیا۔ دہلی صبح کے چار بجے پہنچا۔ بدیں خیال کہ نواب احمد سعید خاں صاحب مجھے نہیں جانتے اور ڈپٹی ہادی حسین خاں صاحب قبلہ جو والد مرحوم کے عزیز دوست اور بھائی ہوتے تھے انکے پاس جاؤں۔ میں نے گاڑی والے کو ہدایت کی اور وہ ڈپٹی صاحب کے مکان پر جا ٹھیرا۔ ڈپٹی صاحب پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، بہت نیک نام محسن اور بڑے پائے کی لوگ تھے۔ والد مرحوم سے انکے پرانی دوستی اور محبت کے روابط تھے۔ دروازے پر دستک دی تو جواب نہ آیا۔ آواز دی تو فوراً ہی، پاس کے دیوانخانے سے اونچی آواز دی کہ فلانے جلدی دروازہ کھولو، یہ غیر نہیں ہمارے بھائی صاحب کی آواز ہے۔ اور میرا نام لیا، یہ خود ڈپٹی صاحب کی آواز تھی جو نماز کی تیاری میں تھے۔

دروازہ کھلا، میں اندر گیا، تو دیکھا کہ درمیانی قامت کی ایک شریف تصویر، نازک اندام، آنکھوں سے معذور وضو کی تیاری میں آستینیں چڑھائے سامنے نظر آئی۔ فوراً مجھ سے سوال ہوا کہ تم (میرا نام لیا) ہو۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں۔ فوراً اٹھکر مجھ سے لپٹ گئے اور کہا کہ کیا اچھا دن ہے۔ مجھ سے اپنے بھائی کی بو آتی ہے۔ میں نے تم کو تین سال کی عمر میں دیکھا تھا لیکن میں قیافہ اور تمہاری آواز سے پہچان گیا۔ فوراً دیوانخانے میں لے گئے اور سارے گھرانے کی حالات اور سلامتی کی پرسش میں نماز کی بھی خبر نہ رہی۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے، اور کسی صاحب صداقت اور دوستی والے محبت بھرے دل تھے۔

صبح کو آدمی ساتھ کر کے انھوں نے حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں مجھے روانہ کیا۔ حکیم صاحب قبلہ خدا ان کو مغفرت کرے نہایت فہیم اور عاقل و متحمل و باوقار ہستی تھی۔ میں نے عرض حال کرنا چاہا، تو فرمایا کہ نبض دیکھ لی ہے، میں خود کہے دیتا ہوں کہ شکایت کیا ہے، اور انھوں نے میری شکایات کو خود ہی دہرایا۔ اللہ اللہ کیا شان مسیحائی ہے۔ غرضکہ چھ چھ دن کے وقفے سے دہلی جا کر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ کچھ عرصہ بعد میں بالکل تندرست انسان بن گیا۔

انہی ایام میں ایک دن نیا سلیپر پہنکر نماز کیلئے مسجد گیا تو کسی نے سلیپر اوڑالیا۔ مظفر علی خاں صاحب کا تسخر سب کو یاد ہوگا۔ انھیں ان صورتوں کے دیکھنے کو ترستی ہیں۔ کہنے لگے کہ بھائی جان اچھے جوتے پہنکر جو آتے ہیں وہ صرف "حاضر" کہنے کو آتے ہیں۔ آپ نے مفت نماز کی تکلیف کی گفتگو میں پرنسپل تذکرہ میں نے بک صاحب سے کہا کہ کچھ انتظام کیا جاسے کہ مسجد سے جوتے غائب نہ ہوجایا کریں تو وہ بہت ہنسے اور باتوں میں ٹالدیا۔ میں نے بھی پہلو بدلا اور کہا کہ بنگلہ سے نماز کی خاطر مسجد جانا بہت دشوار ہے صبح کو اٹھتے اٹھتے آفتاب نکل آتا ہے۔ نماز نہیں ہوسکتی ظہر کو کالج بھی جانا ہوتا ہے کچھ ناشتا بھی کرنا ہوتا ہے۔ مسجد جائیں تو کالج وقت پر نہیں جاسکتے۔ عصر کو مسجد آنے جانے میں کھیل کا وقت جاتا رہتا ہے مغرب کو کھیل کے بعد پسینے سے تر کپڑوں کے ساتھ نماز میں وقت ہوتی ہے عشا کو اتنی دور اندھیرے میں ٹھوکریں کھانا اور اگر ہم وظیفے میں لگ جائیں تو گیٹ بند ہو جاتا ہے واپس جانا مشکل اور بنگلہ پر سپردلائت حسین صاحب ہم کو غیر حاضر پاکر سزا دے دیتے ہیں کچھ انتظام کیا جاسے۔ اس پر بک صاحب کی آنکھیں کچھ روشن ہوئیں تو فرمایا کہ اچھا تم کو نماز کا بنگلہ جات کیلئے مانیٹر مقرر کرونگا۔ بنگلہ والے سب کالج کے بیرونی برآمدے میں عشا کے نماز کیلئے حاضر رہیں۔ میں خود آکر دیکھونگا۔ اوٹھ کر چلا آیا مقصد حاصل ہوگیا۔ تمام بنگلہ والوں کو اطلاع دی کہ نماز بخشوا آیا ہوں۔ ایک وقت کی تکلیف کیجئے غرضکہ شتاق حسین صاحب (بہاولپور پرنسپل) ابوالحسن صاحب، صاحب، میاں احسان الحق صاحب (ریشن جج جہلم) نواب بوم رامپوری۔ ضیاءالدین صاحب (علیگڑھ) ضیاء اللہ صاحب (انجنیئر دہلی) وغیرہ کا غول کالج کے برآمدے میں مشغول نماز ہوا۔ نماز کہاں کی وہاں صرف بک صاحب کی عکیا دہ رہ اندکا امتحان تھا۔

غرضکہ نماز کے اختتام کے قریب وہ بھی ایڑی زور سے زمین پر مارتے ہوئے آموجود ہوئے اور کہا کہ بہت اچھا ہے، ایک رجسٹر روزمرہ کی حاضری کا بنایا جاسے اور تم کو نماز کا مانیٹر مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ مشتاق صاحب زاہدی کے فکر خیر کا نتیجہ تھا۔ احسان صاحب اور ابوالحسن صاحب نے ہم کو دعائیں دیں اور میں مانیٹر نماز بن گیا۔ صبح تو مشتاق صاحب زاہدی نے ایک رجسٹر تیار کیا۔ نام لکھے اور پندرہ دن کی سب کی حاضری پُر کردی۔ پندرہ روز حاضری پُر کیا کرتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس لحاظ سے بنگلہ کی نماز کی حاضری مسجد کی حاضری کے رجسٹر سے نہایت باقاعدہ تھی، میں نے کالج میں ایک دن رجسٹر بک صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے رجسٹر دیکھکر ایک ایک نام پر غور کیا، اور مسکرائے، اور ادھر اُدھر نظر پھیر کر کہا کہ خوشی ہے کہ بنگلے کے سارے بورڈر نماز کے بہت پابند ہیں، واپسی پر میں نے مشتاق صاحب زاہدی کا شکریہ ادا کیا، اور ابوالحسن صاحب اور احسان صاحب کو مبارک باد دی اور مانیٹری کا سایہ بھی جتا یا کہ بھیا اگر ضرورت پڑے اور نماز کیلئے بلوا یا جائے تو ضرور جیسے ہو مونہہ دکھا جانا۔ اللہ میاں تو معاف کرہی دیں گے۔ بک صاحب سے جان چھڑانا مشکل ہو جائیگی اور مانیٹری کے لالے نہ پڑ جائیں لیکن میرے بنگلہ کی سب بھیڑیں اپنے اعتقاد میں درست تھیں۔ بلانے پر بھی کبھی نماز کی حاضری تک کے لئے قدم رنجہ نہ فرما سکے۔ ہاں قبلہ ضیاء الدین صاحب کبھی کبھی پوچھ لیا کرتے تھے، کہ کیا آج نماز ہوئی تھی۔

انہی ایام میں قواعد سکھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بک صاحب اس معاملہ میں بہت سرگرم تھے۔ بھائی سرفراز خاں مرحوم افسر کمانڈنگ مقرر ہوئے۔ سید زین الدین صاحب لفٹنٹ مقرر ہوئے۔ میں بھی سپاہیوں میں بھرتی ہوا۔ سینکڑوں لٹھ سرفراز خاں نے ایک دن میں تیار کرائے۔ اور بندوق کے بجائے یہ ہم کو تقسیم کئے گئے۔ ہر ایک لٹھ قد کے برابر اونچا تھا۔ مشتاق صاحب بلیو بلیک رتبا کو پینڈا۔ حامد علی حاجی محمد خاں اور بھیا سے یہ محمد عبداللہ مرحوم اور چچا ضیاء اللہ خاں مرحوم اور مغنی و اشفاق اس میں شامل ہوئے۔ ابوالحسن صاحب "صاحب" بھی اور میاں احسان صاحب بھی سپاہیوں میں بھرتی ہوئے۔ قواعد ہر روز صبح کو پکی پارک کے سامنے ہوتی۔ رضا خاں گوڑگانوں کا رہنے والا فوجی حوالدار

قواعد سکھانے کو بلوایا گیا۔ یہ جمناسٹک کے اُستاد بھی تھے۔ اچھے خوش مزاج متحمل شخص تھے۔ بعد میں یہ جمناسٹک میں میرے اسید حفیظ الحفیظ اور سب کے اُستاد ٹھہرے۔ سرفراز خاں صاحب بڑے زور سے حکم دیتے۔ ہم اطاعت کرتے۔ کسی کی غلطی پر سرفراز خاں صاحب کا غصہ قابل دید تھا۔ اُلوگدھا پاجی بھی کہتے سرفراز خاں کیلئے میں نیا شخص نہ تھا۔ ہمارے ہر دو خاندانوں میں پُرانے مراسم تھے اور بزرگ ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ میں شرارتاً سرفراز خاں صاحب کا غصہ دیکھنے کو، یا ریاضی پڑا تمیا کو کے ایما پر دانستہ غلطی کر جاتا۔ رائٹ کی جگہ لفٹ یا لفٹ کے حکم پر رائٹ مڑ جاتا، تو سرفراز خاں زور سے قدم زمین پر مارتے، ہاتھ ہلاتے آگے بڑھ کر رک جاتے، اور کچھ گالیاں بھی دیتے جاتے۔ ایک دو دفعہ اسیطرح غلطی کرنے پر سرفراز خاں صاحب نے مجھ کو حکم دیا کہ تم باہر آجاؤ اور میرے کمرے پر آکر قواعد سیکھو۔ قواعد کی مشق کے بعد میں ایک قیدی کی حیثیت میں لٹھ کندھے پر رکھے انکے پیچھے چلکر کمرے میں جاتا وہ اسوقت ۲۷ یا ۲۸ نمبر کی پکی بارک میں تھے۔ وہ کرسی لیکر سامنے بیٹھ جاتے اور مجھے حکم ہوتا۔

فال ان، لیفٹ ٹرن، رائٹ ٹرن، کوئک مارچ، میں درستی سے قواعد کرتا۔ تو جھنجلا کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور یوں فرمانا شروع کرتے کہ قواعد کے وقت جاکر تو گدھا بنجاتا ہے ابتو اچھی طرح قواعد سے واقف نظر آتا ہے۔ غرضکہ (ڈسمس) کا حکم ہونے پر بندوق (لٹھ) کو کونے میں رکھکر بھائی سرفراز کے سامنے کھڑا ہو کر جو کچھ میری زبان پر آتا ہزار گالیاں دیتا اور ہزار سُناتا۔ سرفراز صاحب چپکے سے اُٹھکر ساتھ کے کمرے میں لارڈ حامد صاحب کے پاس جاتے اور میں بھی انکے پیچھے وہاں فیصلہ یہ ہوتا کہ کس نے اُلو بنایا۔ اکثر بھائی سرفراز ہی کو ماننا پڑتا تھا لیکن وہ کبھی ماننے نہیں۔ کیا زمانہ تھا۔ کیا لوگ تھے۔ کیا دل تھے۔ کیا خلوص تھا کیا برادری تھی۔

دل ہی نہ رہا اُمید کیسی   جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی

چند ہی روز بعد کانفرنس علیگڈھ میں شروع ہوگئی۔ اسٹریچی ہال کے سامنے مشرق کیجانب سرسید کا خیمہ تھا جہاں شب و روز وہ وہاں رہتے تھے۔ اسٹاف اور مہمانوں کے خیمے بھی تھے۔ رات کے پہرہ کا انتظام ڈرل والوں کے سپرد ہوا۔ ہر شب اوقات مقررہ پر گارڈ بدلکر پہرہ دیتے۔

سید زین الدین لفٹنٹ اور سرفراز خاں افسر کمانڈنگ اپنی اپنی روزانہ پر اطمینان کو آتے۔ میرا پہرہ سرسید کے خیمے پر تھا۔ مجھے واقعہ یاد ہے کہ رات کو دو بجے ایک ارجنٹ ٹلگراف سرسید کے نام آیا۔ ٹلگراف لیکر میں اندر گیا۔ سرسید پڑے سوتے تھے۔ میں نے آہستہ سے آواز دی آپ اُٹھے پوچھا کیا ہے۔ میں نے ٹلگراف کا لفافہ پیش کیا۔ فرمایا کھولو۔ پڑھو۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک آنے والے انکے دوست کا تار تھا۔ فرمایا کہ صبح دفتر میں دے دینا اور لیٹ گئے۔ مجھے اتنک افسوس ہے کہ میں نے ٹلگراف بجائے صبح کو اُس وقت میں پیش کرتے سے رات کو اُن کو بے آرام کیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ سرسید کو دیکھنے کیلئے میں ہر روز موقع تاکتا رہتا تھا کہ ایسے بات کا موقع نصیب ہو۔ یہ موقع نصیب ہوا اور دو تین موقع نصیب ہوئے جن کا شرف مجھی کو حاصل ہوا اور کالج کے دوسرے کسی طالب علم کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔ ان کو بعد میں عرض کرونگا۔

میر عالم خاں گنڈاپور (ڈیرہ اسمٰعیل خاں) مرحوم جنھوں نے ولایت جاتے ہوئے راستے میں مصر میں وفات پائی میرے عزیز دوست تھے وہ اگر اتنک زندہ ہوتے تو انکی روشن خیالات اور ہوشمندی کو مدنظر رکھکر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ممبر کونسل، اور با اقتدار، اور مشہور شخص ہوتے، لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ آپ صاحب سے انکا بہت دوستانہ تھا۔ انکو خیال پیدا ہوا کہ اہل پنجاب سے بھی کسی کو لفٹنٹ ڈرل بنایا جاوے! در قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔ میرے لفٹنٹ ہونے پر شوکت صاحب کو خبر ملی۔ وہ مجھے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ مجھے ملے اور ہاتھ پکڑ کر الگ لے گئے۔ فرمانے لگے کہ دیکھو میں جو خواب تمھارے واسطے دیکھ رہا تھا اور جو سوچا تھا اُس کا آغاز شروع ہوگیا ہے۔ تم کو مبارک ہو سنبھلکر چلنا، اور بس۔ غرضکہ میں ڈرل کا لفٹنٹ مقرر ہوگیا۔ امتحان میں بھی کامیاب ہوگیا۔

خدا جنت میں جگہ دے۔ خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم سے اکثر موقعوں پر باتوں کا موقع مل جاتا وہ نہایت دوراندیش علم دوست اور فرشتہ خصلت انسان تھے۔ انکی تحریک سے مسٹر آرنلڈ نے مجھے اخوان الصفا کا ممبر مقرر کیا۔ شوکت صاحب اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ یونین کے الیکشن میں انھوں نے میرا نام پیش کر دیا اور میں یونین کی سلکٹ کمیٹی کا ممبر مقرر ہوگیا۔ کالج

کے (ایتھلیٹک اسپورٹس) میں میں ایک میل کے دوڑ میں اوّل آیا۔ اسی سال یونیورسٹی ایتھلیٹک اسپورٹس کا دور شروع ہو گیا تھا۔ محمد زماں خاں و سید عبد الحفیظ، حاجی محمد خاں، شوکت علی صاحب یونیورسٹی اسپورٹس کیلئے الہ آباد جانے کو چنے گئے۔ مجھے بھی مائل ریس کیلئے چنا گیا۔ ہر صبح اکثر مارسین صاحب اور ٹیننگ صاحب کرکٹ فیلڈ میں آیا کرتے کہ ٹورنمنٹ میں جانے والوں کو دوڑنے کی مشق کرائیں میں بہت کم ایسے موقعوں پر حاضر رہا۔ کیونکہ صبح ہی میں اپنے رفیق نواب غلام محمد خاں صاحب کے ہمراہ اسی مشق کی خاطر انکے گھوڑے کے ہمراہ دوڑتا قلعہ کو چلا جاتا تھا۔

اول سال کا ٹورنمنٹ الہ آباد میں ہوا محمد زماں خاں اور سید عبد الحفیظ اور حاجی محمد خاں اور شوکت علی صاحب اور میں علیگڈھ سے الہ آباد پہنچ گئے۔ الہ آباد میں مقابلہ سخت تھا۔ کئی چیدہ دوڑنے والے انگریز بھی مقابلہ میں آئے لیکن علیگڈھ کا نمبر اوّل رہا۔ سو گز، چوتھائی میل، ایک میل، ہرڈل ریس میں اوّل انعامات علیگڈھ کے حصّہ میں آئے، اور انکا سہرا محمد زماں خاں، سید عبد الحفیظ کے سر رہا۔ شوکت صاحب کو گولہ پھینکنے میں انعام ملا۔ گولا پھینکنے میں یہ ماشاء اللہ بہادر تھے لیکن دوڑنے میں یہ حالت تھی کہ ہماری گستاخیوں کی سزا کیلئے، یہ ہم کو پکڑنا چاہتے تو بھاگ نہ سکنے کی حالت میں، کھڑے ہو کر گالیاں دیکر ہی ٹھنڈا کر لیتے۔ میل کی دوڑ میں میں اوّل آیا۔ مارسین صاحب رخصت گئے ہوئے تھے جس گاڑی سے ہم سب علیگڈھ پہنچے، وہ بھی آگرہ سے آتے ہوئے اسی گاڑی سے آئے۔ راستے میں مجھے دیکھ کر فرمانے لگے، کہ میں نے تم کو تمھاری بیماری اور دل کی کمزوری کے باعث فٹ بال کھیلنے سے منع کر دیا تھا، اور تمھارا فٹ بال جانا بند کر دیا تھا، تم ایک میل کی دوڑ کے پیچھے لگ گئے۔ جب میں نے عرض کیا کہ میں ٹورنمنٹ میں میل کی دوڑ میں اوّل رہا، تو انھوں نے تعجب سے مجھ پر نظر دوڑا کر کہا بہت اچھا ہوا۔

کالج واپس آ کر مجھے اطمینان تھا کہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ رات کو سب مشاغل کے بعد جب احباب محمد امین فقیہہ صاحب کے ساتھ میز کے گرد چائے کو بیٹھے تو محمد امین صاحب نے کہا کہ بھائی اب الہ آباد کی اور سفر کی ساری داستان سناؤ۔ میں نے کہا کہ پہلے تو آپ کو میری نسبت بہت تشویش تھی کہ میں ضرور پاگل ہو جاؤں گا یا خودکشی کر لونگا۔ آپ راز کی تلاش میں تھے کہ سبب کیا تھا۔

میں نے کہا کہ راز فاش ہو گیا منزلِ مقصود کی راہ پر لگ گیا۔ میں کوشش اور مستقل ارادے کا ظہور پاتا ہوں۔ میں اپنی خواہش میں کامیاب ہو گیا یہی بیگانہ پن تھا۔ یہی تپش اور دیوانگی تھی۔ میرا اور محمد امین صاحب کا خرچ مشترک تھا۔ میں اپنا ماہانہ خرچ انکے ہاتھ دیتا اور وہ میرے اخراجات کے ضامن تھے۔ بجٹ بھی جب تک وہ کالج میں رہے انکے ہاتھ رہا۔ انکے احکام کی تعمیل کرتا جو حکم دیتے بجا لاتا۔ فوراً بات کاٹ کر پوچھا کہ (ہوم اسپورٹس) میں کچھ نقد بھی انعام ملے گا۔ میں نے کہا کہ ہاں (۵۰۰) روپے کی امید ہے تو بہت خوش ہوے اور فوراً کاغذ پنسل لیکر بجٹ کی کاٹ چھانٹ میں مصروف ہو گئے۔ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ امین صاحب سے شروع شناسائی کیسی ہوئی۔ آخر تک چھ سال دو میرے ساتھ بنگلے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک ہی محبت سے بھائی کی طرح رہے اور ادھر بھی ابتک ایک محبت سے بھرا ہوا گوشہ دل انکے لئے خالی ہے۔ محمد امین صاحب ایک نہایت آزاد مزاج، سرد و گرم زمانہ دیدہ، کم گو، فلاسفر اور محتاط شخص تھے۔ ہمت اور قربانی کا مادہ خوق العادہ تھا۔ یہ مجھ سے دو سال قبل بی اے ہو گئے۔ جب نیشنل کانگرس کے خلاف بک صاحب نے مسلمانوں کی کانفرنس کا اعلان دیا اور سائنٹفک ہال میں ایک لمبی اسپیچ دی، تو محمد امین صاحب نے بک صاحب کی اسپیچ کے آخر میں کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملگئی، انھوں نے ایک پر زور فصاحت اور مکمل معلومات سے بک صاحب کی اسپیچ کے خلاف بولنا شروع کیا۔ تھوڑا سا بولے تھے کہ بک صاحب نے بند کر دیا۔ بک صاحب ناراض ہو گئے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے بک صاحب سے کسی سارٹیفکیٹ کی تمنا نہ کی۔ بک صاحب نے پوچھا تو انھوں نے اسکی تمنا سے انکار کر دیا۔

"سیلانی"

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

پھر بہار آئی ہے، پھر خنداں چمن ہائے ہوئے — پھر بڑھا جوشِ جنوں، پھر زخمِ دل لے ہوئے

پھونک ڈالا سوزِ غم نے اشکباری اب کہاں — بچ رہے تھے چند آنسو دل کے چھالے ہوئے

(اشہر)

ہمارا کالج

علی گڑھ ۱۹ مئی۔ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد کو یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی انجمنوں نے وداعی ایڈریس پیش کیے۔

ڈاکٹر ضیاءالدین کی گاڑی گھوڑے سے جدا کر دی گئی۔ اور طالب علموں نے اسٹیشن تک اس کو کھینچا۔ طلبا کی بڑی تعداد اسٹیشن پر موجود تھی تاکہ انھیں جاتے وقت خدا حافظ کہے۔

وہ زمانہ جنگ کے بعد انگلستان اور براعظم کی تعلیمی ترقی و طریق تعلیم کے معلوم کرنے کیلئے ایک طویل دورہ کریں۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی عنصر کے اضافہ کی تجویز وار پر ہم نے احباب کیلئے جو کچھ لکھا تھا۔ اس کو ابھی دو تین مہینے سے زیادہ نہیں گزرا ہے۔ اسوقت ہمارے بعض بھائیوں نے کہا تھا کہ یہ بیجا تعصب ہے۔ انگریزوں کی کورانہ مخالفت ہے اور خواہ مخواہ تنگ نظری سے کام لیا جا رہا ہے۔ لیکن حال میں مسٹر ولش کی رپورٹ سے متعلق جو اطلاعات شائع ہوئی ہیں ان سے ان تمام خطرات کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے ابتدا میں ظاہر کیے تھے۔ مسٹر ولش ہز ایکسلنسی لارڈ ریڈنگ نے یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کی تدوین و ترتیب کیلئے مقرر کیا تھا۔ انھوں نے اب غور و بحث کے بعد جو رپورٹ پیش کی ہے۔ اس کا منشا الہ آباد کی ایک اطلاع کے مطابق یہ ہے کہ آئندہ سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم کا تعلق الہ آباد کے تعلیمی بورڈ سے ہو، اور مسلم یونیورسٹی صرف گریجویٹ پیدا کرنے کی مشین رہ جائے۔ یہ اطلاع اگر صحیح ہے، اور بظاہر اسکے صحیح ہونے کی

کوئی وجہ نہیں ہے، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ حکومت نے جنگ عظیم کے بعد مسلمانوں کے اضطراب کی تسکین کیلئے مسلم یونیورسٹی کا جو بے حقیقت کھلونا مسلمانوں کو دیا تھا اس کو بھی اب وہ واپس لینا چاہتی ہے۔
اول تو وہ یونیورسٹی خود ہی ایک اپاہج اور بے اختیار چیز تھی کیونکہ اپنا نصف کروڑ کے قریب روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی اس میں مسلمانوں کو آزاد قومی تعلیم کا حق نہیں دیا گیا تھا لیکن اب اگر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اختیارات بھی اس سے چھین لئے گئے تو وہ قطعاً بیکار اور بے معنی ہو جائے گی۔ ہم کو یونیورسٹی کی اس لئے ضرورت نہیں تھی کہ دوسری جگہ سے لڑکے ایف۔ اے پاس کر کے آئیں اور ہم ان کو دو چار سال میں بی۔ اے ایم۔ اے، اور ایل ایل بی وغیرہ کی ڈگریاں دیکر واپس بھیجدیں۔ بلکہ ہمارا اصلی مدعا تو یہ تھا کہ ہم ابتداء سے بچوں کو ایک خاص تعلیمی نظام و تربیت کے ماتحت تیار کریں تاکہ وہ کام کے مسلمان بن کر یونیورسٹی سے نکلیں۔ اول تو اس مقصد کو حکومت کی گہری مداخلت اور نگرانی ہی نے بڑی حد تک فوت کر دیا تھا، مگر اب سیڈولر کی تجویز پر عملدرآمد ہونے کے بعد تو وہ بالکل ہی زائل ہو جائیگا اس تجویز سے مسلم یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ پھر جبکہ مسلمان الٰہ آباد یونیورسٹی سے بھی اتنا ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو انہیں ایک نام نہاد مسلم یونیورسٹی پر لاکھوں روپیہ ہر سال خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ (اس اطلاع کی تردید کی گئی ہے)

نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب بہادر ایک محترم و اکرم فرد اور مسلم قوم کے برگزیدہ سرداروں میں، کیونکہ سرسید مرحوم کی پالیسی اور سرسید مرحوم کے تمام روایات کو زندہ رکھا ہے مگر نہایت افسوس ہے کہ آپ کی ذات خاص پر چار پانچ برس سے سخت سے سخت حادثے گزر رہے ہیں جن کی نسبت ہم صرف اسیقدر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک امتحان ہے کہ پہلے بڑی لائق نہایت سعادتمند نامی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ اور اب گزشتہ دنوں آپ کے اکلوتے فرزند مدرشید کا انتقال ہو گیا۔ گو ایسے حادثے اور ایسے واقعات ہر گھر میں ہوا کرتے ہیں مگر انکا اثر انہیں گھروں تک محدود رہتا ہے لیکن قوم کے کسی سردار پر یہی حادثہ گذرتا ہے تو قوم متاثر ہوتی ہے۔ اور اس کو قومی ماتم سمجھتے ہیں۔ خدائے پاک ہی جناب نواب صاحب کو صبر دیگا۔ کیونکہ ایسے امتحان کے پہلے وہ صبر کی صورت بھی پیدا کر دیا کرتا ہے۔ ان اللہ مع الصابرین۔ ان اللہ علی کل شئی قدیر۔

اولڈ بوائز

مولانا محمد علی صاحب نے اپنی لڑکی کی شادی کیلئے ۶ مئی مقرر کی تھی۔ نکاح کا وقت عصر مغرب کے مابین مقرر تھا۔ اسی تاریخ کو طارق سلمۂ کی بسم اللہ خوانی کی رسم کا بھی اعلان کیا گیا تھا (طارق مسٹر زاہد کے صاحبزادے کا نام ہے۔ یہ صاحبزادے مولانا محمد علی کے نواسے اور مولانا شوکت علی کے پوتے ہوتے ہیں) تاریخ شادی سے ایک دن پیشتر مولانا محمد علی صاحب کی طرف سے مخصوص احباب کے نام دعوتی خطوط جاری کئے گئے تھے اگرچہ مولانا نے اس تقریب کو انتہائی مختصر کر دیا تھا لیکن پھر بھی دہلی کے روسا، علماء اور تجار کی ایک کافی تعداد تھی۔ رامپور اور لکھنؤ سے بھی مولانا کے بعض احباب تشریف لائے تھے۔ نکاح کے وقت تک تقریباً تین سو مہمانوں کا مجمع ہو گیا تھا۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے جناب حکیم محمد جمیل خاں صاحب نے جو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کی۔ بسم اللہ پڑھانے سے پیشتر مولانا شوکت علی صاحب نے ایک مختصر تقریر میں حکیم مسیح الملک کا تذکرہ کیا۔ جس سے حاضرین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مولانا نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر آج مسیح الملک ہم میں ہوتے تو اس بچے کو انکی بسم اللہ خوانی کا شرف حاصل ہوتا۔ لیکن آج حکیم صاحب نہیں ہیں تو میں انکے خلف اکبر سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ طارق کو بسم اللہ پڑھائیں حکیم صاحب کی ادائگی رسم کے بعد مولانا شوکت علی صاحب نے مبلغ سو روپے کا ایک چیک جامعہ ملیہ کیلئے ڈاکٹر انصاری صاحب کو پیش کیا۔

بسم اللہ کی رسم کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمیعۃ علماء ہند و مفتی اعظم نے خطبۂ نکاح کی تلاوت کی اور عقد نکاح کیلئے ایجاب وقبول کا فریضہ ادا کیا۔ مولانا محمد علی نے صاحبزادی کے

نکاح کے بعد جمعیۃ علماء ہند کیلئے مبلغ ایک سو روپیہ۔ اور جامعہ ملیہ کیلئے پانسو روپیہ۔ خلافت کمیٹی کے لئے ایک سو روپے کا اعلان کیا۔ اور یہ روپیہ اسیوقت ادا کر دیا گیا۔

رات کو مولانا محمد علی کی طرف سے معزز مہمانوں کو پر تکلف دعوت دی گئی۔ معزز مہمانوں کو مسٹر ماجد علی صاحب کی طرف سے دوسرے روز کیلئے دعوت ولیمہ کے خطوط تقسیم کئے گئے۔ چنانچہ دوسرے روز بعد نماز مغرب دہلی کے معززین کی کافی تعداد دعوت میں شریک ہوئی۔ ہماری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ طارق سلمہٗ کو اپنے نانا اور دادا کی طرح قومی خادم بنائے۔ اور نئے دولہا دلہن کو اعمال صالحہ کی توفیق عطا ہو۔

کاش دوسرے مسلمان بھی علی برادران کی طرح اپنی شادیوں میں بجائے فضول خرچی اور رسومات مسرفہ کے قومی خدمت کا احساس پیدا کریں۔

دہلی ۲۶ مئی مولانا محمد علی صاحب شام کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب بی۔ بی۔ سی۔ آئی میل سے بمبئی تشریف لے گئے۔ مولانا ایک دن اجمیر میں ایکدن آبو میں۔ ایکدن احمد آباد میں قیام کرتے ہوئے ۳۰ مئی کو بمبئی پہنچے۔

مولانا نے اپنی روانگی سے ایک روز قبل جامع مسجد میں نہایت موثر تقریر فرمائی۔ لوگ اسقدر متاثر تھے کہ متعدد لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور مولانا کی اس جدائی کو وہ بہت زیادہ محسوس کر رہے تھے۔ جس وقت مولانا نے اپنی تقریر ختم کی ہے۔ لوگ مصافحہ اور معانقہ کیلئے آگے بڑھے جس کا گھنٹوں تک سلسلہ جاری رہا۔ اور لوگ اسوقت تک برابر آتے رہے۔ جب تک مولانا مسجد سے واپس تشریف نہ لائے۔

بسفر رفتنت مبارکباد بسلامت روی و باز آئی

پر بند لگائے گئے تھے۔

مولانائے محترم کی قیام گاہ پر (دفتر ہمدرد میں) شام کو چار ہی بجے سے احباب رخصت کرنے کیلئے آنے لگے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب حکیم محمد احمد خاں صاحب۔

حکیم محمد جمیل خاں صاحب۔ مسٹر عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ اور فرید احمد انصاری صاحب بیرسٹر بھی رخصت کرنے کیلئے تشریف لائے تھے ٹھیک نماز مغرب کے بعد مولانا معہ احباب کے اسٹیشن تشریف لے گئے۔ اسٹیشن پر بھی پہلے ہی سے لوگ موجود تھے! اور اسکے بعد بھی جب تک گاڑی کھڑی رہی برابر آتے رہے اور مولانا سب سے گفتگو فرماتے رہے۔ گاڑی چھوٹنے سے ذرا پہلے مولانا نے سب لوگوں سے معانقہ کیا اور بغلگیر ہوئے اور آٹھ بجکر ۲۰ منٹ پر اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ روانہ ہوگئے۔

برادر عزیز حکیم احمد شجاع صاحب نے ایک پارسل روانہ کیا تھا۔ پتہ صاف نہونے کے باعث فوج باقاعدہ والوں کے ہاتھ پڑگیا، اور سب کے سب لگے خوشیاں منانے۔ بھائی کپتان نظیر الاسلام کے گھر پر ایک روز پارسل کے افتتاح کا مقرر کیا گیا، اور گلے میں رسیاں ڈال ڈالکر لوگوں کو دعوتیں دینی شروع ہوئیں کھلنڈرے اور رازدار لوگ جمع کئے گئے، اور میجر ریاست علی مرزا، میجر عبدالصمد، کپتان میاں محمد بشیر، اور جناب "اولڈ بوائے صاحب" کے سوا اور بھی چند احباب اس کام کیلئے یکجا ہوگئے، تو قرآن پاک کی سورتیں دم کرکے پارسل کھولا گیا۔ ہم تو اپنی عینک گھر بھول آئے تھے، مگر میجر صمد کا بیان ہے (راست وروغ برگردن راوی) کہ پارسل میں سے مٹی کے دو پتلے نکلے، ایک ملتانی مٹی کا تھا، اور دوسرا راوی کی ریتی کا۔ نجح کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور جو لوگ لاہور کے "بیدانہ" کی امید میں تھے، بہت مایوس ہوئے، مگر تحفہ دوست کی طرف سے تھا، سب نے سر آنکھوں پر لیا۔ فی الفور ان دونوں کی رسم تسمیہ خوانی ادا کیگئی، "اللہ یار" اور "علی یار" نام رکھ دیئے گئے بیچارے بہت دور سے چلکر آئے تھے، تھوڑی دیر کے بعد بھوک بھوک پکارنے لگے (اُن کے) گھر والے نے کھانے پینے کا بھی انتظام کر دیا، اور آدھی رات تک آنیوالوں کی خاطر تکلیف اُٹھاتے رہے۔ کھانا تھا، مگر کھانا نہیں۔

بعض لوگ بہن بھائی کی محبت کے لحاظ سے خوش نصیب ہوا کرتے ہیں۔ ہماری طرح مولانا شوکت علی صاحب بچپن سے اپنی بڑی بہن کی محبت سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے لیکن اُن کی اور مولانا محمد علی صاحب کی قسمت میں شاید یہی لکھا تھا کہ جس وقت یہہ لوگ آوارہ وطن ہوں، بہن وطن میں انکی جدائی کی گھڑیاں شکر و صبر کے ساتھ گنا کرے۔ گزشتہ رمضان میں مولانا شوکت علی صاحب

حیدرآباد تشریف لائے تھے، تو ہم سے اپنی بڑی ہمشیر کی مہربانیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے تھے۔ یہ بہن اب خاک کی چادر اوڑھے ہوئے سرزمین وطن میں آرام کر رہی ہیں! اور اپنے پیچھے بہت سوگوار چھوڑ رہے ہیں۔ مولانا شوکت علی کے سینہ میں جو شوالہ قائم ہے، اُن میں محبت کی مورت کے ساتھ ہی، صبر و شکر کی دیوی بھی پر تو فگن ہے۔ پھر بھی ہم اپنا فریضہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کے اور دوسرے افراد خاندان کے ساتھ اس غم میں شرکت کریں۔ خداوند عالم ہمارے گھروں میں سے ایک گھر ان مرحومہ کیلئے بھی جنت میں مخصوص فرما دے، اور ہمارے بزرگوں کا جوار انھیں وہاں بھی نصیب ہو کہ روح و قلب کے لحاظ سے ہم اور اُنکے تقریباً تمام رشتہ دار ایک ہی ہیں۔

اس موقعہ پر ہم اپنے برادر عزیز مولوی محمد احسن صاحب وکیل (حیدرآباد) کی ہمشیر کی خبر رحلت پاکر کچھ کم اثر پذیر نہیں ہوئے۔ یہ مرحومہ بھی علیگڈھ کے نام پر فدا اور اپنے بھائی کی علیگڈھی تعلیم کے ساتھ بڑی وابستگی کا اظہار فرماتی رہتی تھیں۔ پسماندوں میں جن لوگوں کو چھوڑا ہے ان میں ایک فرزند بھی ہیں، جو ہمارے کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ ہمیں مرحومہ کے پسماندوں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے، اور دعا ہے کہ خداوند عالم جنت میں اس روح کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

ہمارے برادر مکرم مولوی بدر الحسن صاحب علیگڈھ کے بہت قدیم فرزند ہیں، اتنے پُرانے کہ اب تو پوتے کے دادا بھی ہو گئے ہیں۔ انکے تمام جسم کا کوئی بال ایسا نہیں جو سفید نہ ہو گیا ہو۔ اپنی عادت کے موافق نواب ذوالقدر جنگ بہادر نے انکی ملازمت کے آخری ایام میں مزید توسیع عنایت فرمادی، اور اسی پر بس نہ فرمایا بلکہ گریڈ میں ترقی دینے کی خواہش کا بھی اظہار کیا، تو دوسرے ہم درجہ ساتھیوں نے اسے اُچک لینے کی فکریں شروع کر دیں۔ سعی کرنیوالوں میں سے ایک ناکام اور دوسرے کامیاب ہو گئے۔ بدّو بھیا نے اِس موقعہ کے مناسب حال ایک قطعہ ارشاد فرمایا۔ بھائی کی چیز پر دوسرے بھائیوں کا حق بھی ہے۔ اس لئے ہم قطعہ کو اُن تک پہنچاتے ہیں۔

زمانہ میں کیا سے یہ کیا ہو گیا بھتیجا ہمارا چچا ہو گیا
مگر ظاہر الحق کو ذرا دیکھئے چچا کے چچا کا چچا ہو گیا

ایک صاحب دل بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ برادر مکرم مولوی اظہر حسن صاحب کے یہاں ڈائننگ روم تیار کیا گیا ہے، اور اُس میں حضرت میکائیل کے اہتمام سے پلیٹیں چُنی جا رہی ہیں۔ شاید انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ جناب اولڈ بوائے صاحب بھی میز کا ایک کونا دبائے بیٹھے ہیں۔ خواب کی تعبیر تو کوئی صاحب دل ہی دیں گے، مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ اب اولڈ بوائز کو مسٹر اظہر حسن سے ایک زبردست ڈنر مانگنے کا حق پیدا ہو گیا ہے کیونکہ ہمارے بھائی نواب ذوالقدر جنگ بہادر کی رخصت خاص کے موقعہ پر مسند ہی عدالت کی کرسی کو زینت دے چکے ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ ہمارے یہ بھائی شاہراہ ترقی پر گامزن ہونگے۔ اسلئے ہم پیشگی مبارک باد کے ساتھ یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ جیسے اب نیکنامی کے ساتھ کام کر رہے ہیں آئندہ بھی ایسی ہی سعی فرماتے رہیں ؎

گر بر سر نفس خود امیری مردی — ور بر دگرے نکتہ نگیری مردی
مردی نبود فتادہ را پائے زدن — گر دست فتادہ بگیری مردی

میجر نواب حبیب یار جنگ بہادر کے فرزندوں میں سے میجر حبیب محسن کے سوا سب کو علیگڈھ جانے اور وہاں کی تعلیمی فضا سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملا ہے۔ مسٹر حبیب عبداللہ، مسٹر حبیب محمد اور مسٹر حبیب علی ہمارے اس بیان کے شاہد ہیں۔ کہتے ہیں کہ گزشتہ شادیوں کے موسم میں نواب صاحب موصوف نے اپنے کئی فرزندوں کی شادیاں رچائیں۔ ہم ان میں سے برادرم مولوی حبیب محمد کی تقریب شادی میں شریک ہو سکے۔ اس موقعہ پر کھانا تو ہر مہمان کو بغیر تلاش کے مل گیا، اور بہت سے اولڈ بوائز ایک دوسرے کی ملاقات سے قلبی مسرت لیکر واپس ہوئے لیکن دو باتیں موقعہ کے مناسب حال جاذب نظر تھیں۔ انمیں سے پہلی بات تو اُس "ریڈیو" کی صورت تھی، جو مردوں میں دلھن بنی ہوئی، شادی کے جشن (دونوں یہ سمن سقفصی) اپنی باریک آواز میں سنا رہی تھی، اور دوسری ایک دلفریب شے اور بھی تھی جس پر سب کی نگاہیں پڑ رہی تھیں۔ وہ لوگ جنہوں نے اس شادی میں دیو صفت جوڑے کو گلے ملتے دیکھا ہے، اس لطف کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہماری نظر اُس وقت اِن دیو زادوں پر پڑی۔ پیر اور سر کے لحاظ سے تو دونوں میں گز بھر سے کم فصل نہ ہوگا، لیکن کمر کے دور میں صرف چار انگل کا فرق تھا۔ مسٹر کرم اللہ نے

ان دونوں کے نام اپنی مجوزہ اسکیم میں درج کر لئے تھے لیکن مسٹر مسعود احسن کی سعی نے شاندار کام کیا، کہ اب تک یہ تجویز عمل میں نہ آئی۔ بھائی حبیب محمد اور تمام انتظام کرنے والے اطمینان رکھیں کہ سارے مہمان پیٹ بھر کھانا کھا کر واپس ہوئے، اور جی بھر کر ناشکر گزار بیان کیا اور کو ہم آئندہ موقعہ کیلئے محفوظ ہیں اس لئے رکھتے ہیں، کہ چند ماہ بعد ہی اس کی ضرورت پھر پیش آنیوالی ہے۔

یہ معلوم کرکے ہمیں بڑی مسرت ہوئی کہ برادر عزیز مسٹر کاظم رضا رضوی ضلع الہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر ہوئے ہیں۔ یہ تقرر ہمیں امید ہے کہ برادرم مسٹر اسلام احمد خاں کی جگہ ہوا ہے، جنہوں نے رخصت حاصل فرمائی ہے۔ ہم دونوں کی ترقی اور استقلال کے دل سے خواہاں ہیں۔ استقلال کا لفظ ہم سب کو پیارا ہے، اسلئے سب کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ برادر مکرم مولوی ذوالفقار علی حقانی اپنی خدمت صدر رہتمی تعلیمات پر مستقل ہوگئے۔ اسیطرح برادرم خواجہ یوسف الدین صاحب کے جاگیردار کالج میں ترقی کے ساتھ آنے سے سب خوش ہیں۔ اسی کالج سے ہماری برادری کے ایک لائق فرد مسٹر محمد احمد کم ہو رہے ہیں، جن کو اورنگ آباد کالج میں ترقی دی گئی۔

برادر مکرم مولوی وقار الدین صاحب مددگار معتمد مالگزاری (شاخ آبکاری) کے منصب پر مامور ہوئے تو بہت سے ست الست اس فکر میں پڑ گئے ہوں گے کہ اب "راج لنگم" والے باغ سے

چھوٹے چھوٹے جھاڑوں کی میٹھی میٹھی ......

آسانی کے ساتھ لی جایا کرے گی، بلکہ بھائی وقار خود بھی اہتمام میں شرکت فرمایا کریں گے۔ لیکن پڑوسیوں کے سے بہتر سامان ہوگیا، اور اب وہ خدمت انکے سامنے پیش کیگئی، جس کیلئے ایک عرصہ تک باوجود ہوشیاری کے ان کو صبر کرنا پڑا تھا۔ ہم خوش ہیں کہ برادر محترم نواب رضا نواز جنگ بہادر کے صوبہ دار ہونیکے بعد ضلع اورنگ آباد کی اول تعلقداری پر بلحاظ استحقاق مولوی وقار الدین صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ محکمہ مال کے دوسرے تغیرات میں ہمارے بھائی مولوی غلام احمد خاں صاحب نائب معتمدی مالگزاری سے اول تعلقداری ضلع نلگنڈہ پر مامور ہوئے ہیں۔ اسیطرح محکمہ آبکاری میں برادرم مولوی عبدالقادر صاحب بی۔اے گلبرگہ سے اب تعلقداری آبکاری بلدہ پر حیدرآباد تشریف لے آئے ہیں۔ منہ میٹھا کرکے ہم مبارکباد دیتے ہیں گے۔

حیدرآباد دکن کے سررشتہ تعلیمات میں بعض حضرات کو ترقیاں ملی ہیں، اور بعض کا تبادلہ ہوا ہے سنتے ہیں کہ برادرم مولوی محمد احمد صاحب ایم اے جاگیردار کالج سے اورنگ آباد کالج کو تشریف لیجانیوالے ہیں، اور سیدک سے برادرم خواجہ یوسف الدین صاحب ایم اے ایک دوسرے ہی سلسلہ میں جاگیردار کالج میں رونق افروز ہونیوالے ہیں ہمیں اُمید ہے کہ برادرم مولوی عبدالعزیز صاحب بی اے ایک کے وداع اور دوسرے کے جلوہ کے موقعہ پر زبردست عصرانہ کا انتظام فرمائیں گے، جس سے یقیناً ہم ضرور غائب ہونگے۔ اسی سررشتہ تعلیمات کے ایک فرد مولوی مرزا محی الدین بیگ صاحب بی اے کو نظامت طبابت نے اُچک کر اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ بنایا ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ اس تقریب پر برادرم مولوی لطف احمد صاحب کو نین یا سنکونا کی میٹھی ٹکیاں تقسیم کرنیوالے ہیں۔

ہم اپنے بھائی مولوی حافظ علی صاحب کی تلاش میں ہیں، جو کبھی بیدر میں تھے۔ رسالہ اب بھی بیدر کے پتہ پر جایا کرتا ہے لیکن انکی نسبت اپنے دوسرے بھائیوں کی زبان سے کچھ سننے کے ہم مشتاق ہیں۔

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ فرزندان حضرت شاہ جعفر بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وطن قصبہ پھپھوند ضلع اٹاوہ میں ایک اصلاحی انجمن بنام "انجمن جعفریہ" قایم کی ہے۔ اسکے معتمد ہمارے بھائی سید شبیر حسین صاحب ہیں، اور انکے معاون سید افتخار علی صاحب علیگڑھ کے دو فرزند مسٹر سید اولاد حسین اور مسٹر سید علی بی اے بھی انتظامی کمیٹی میں ہیں، جن سے اُمید ہے کہ مقاصد انجمن میں بڑی مدد ملے گی۔ تعلیم و تربیت کے سوا فکر معاش اور صحت قائم رکھنے کے مشاغل ہمارے نوجوانوں کے پیش نظر رہیں تو کامیابی کی ضرور اُمید ہے۔

مسٹر ظہور احمد اور مسٹر نذیر احمد (الہ آباد) کے جاننے والے ممالک ہند کے گوشہ گوشہ میں موجود ہیں۔ مسٹر نذیر احمد ایک مدت سے (اور غالباً تعلیم ختم کرنے کے بعد سے) فن اخبارنویسی کو اختیار کئے ہوئے ہیں، اور ایک سے زیادہ مرتبہ ذاتی اخبارات کو کامیابی کے ساتھ چلا چکے ہیں۔ ہم جس زمانہ میں اولڈبوائے کے ادارت کے بنارس میں ذمہ وار تھے مسٹر نذیر احمد نے الہ آباد سے ہفتہ وار اخبار

"مساوات" جاری کیا تھا، اور کامیابی کے ساتھ کئی سال تک اس کو جاری رکھا۔ اسکے بعد تحریک خلافت کے سلسلہ میں بھی ایک اخبار جاری کیا۔ اب "کشاف" کے نام سے ایک اخبار جاری کر کے اسلام اور علیگڈھ کی روح کو تازہ کرنا چاہتے ہیں کئی مہینہ سے یہ اخبار ہمارے پاس آرہا ہے، اور ہم بھائی نذیر کے سنجیدہ مضامین کا لطف منزلوں دور سے اٹھا رہے ہیں۔ صوبہ متحدہ اور الہ آباد کو ایک ایسے اخبار کی ضرورت تھی، جس کو بھائی نذیر احمد نے پورا کر دیا۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ انکے بہت سے دوست اس کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ برادر محترم مولوی محمد عنایت اللہ صاحب کی مدت ملازمت میں، اور دو سال کی توسیع پیشگاہ مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ سے منظور فرمائی گئی ہے، اور اُن کے کام کو بھی قابل اطمینان تسلیم فرمایا گیا ہے۔ غالباً دارالترجمہ کی مدت بھی اسقدر ہے۔ اگر مولوی عنایت اللہ صاحب ایک اچھے ایٹ ہوم کا انتظام فرماتے ہیں، اور انمیں اپنے احباب اولڈبوائز کو کشادہ دلی کے ساتھ مدعو فرماتے ہیں، تو ہم بارگاہ خداوندی میں عرض کر کے دارالترجمہ کی مدت میں توسیع کی سعی کریں گے اور کیا عجب ہے کہ ہماری دُعا مقبول بھی ہو جائے۔

خان بہادر چودھری واجد حسین صاحب ڈائرکٹر حرفت و صنعت ممالک متحدہ آگرہ و اودھ بریلی سے لکھنؤ آرہے تھے جس وقت گاڑی لکھنؤ کے اسٹیشن چار باغ پر پہونچی، اور چودھری صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ اُتارنے کیلئے درجے میں گئے تو چودھری صاحب کو مردہ پایا۔ یہ خبر لکھنؤ میں ۲۸ جون کی سہ پہر کو مشتہر ہوگئی اور سول سرجن نے دیکھکر کہا کہ حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے یہ واقعہ ہوا ہے۔ آپ ضلع بارہ بنکی کے تعلقداروں میں تھے۔ اور آپ نے اپنی قوت بازو سے اس درجے تک ترقی کی تھی اور جو کام گورنمنٹ نے آپ کے سپرد کیا اس کو عاقلانہ و فرزانہ طریق عمل سے انجام کو پہونچایا اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آپ کی طرز عمل سے کسی قوم کو کوئی شکایت نہ تھی۔ خدائے پاک آپ پر رحمت نازل فرمائے اور اعزا و احباب کو صبر۔

کارسازان قضا و قدر نے چھتاری کے ایوان ریاست میں جس بچہ کو احمد سعید خاں کے

نام سے روشناس کیا تھا، اپنی بعد کی زندگی میں "حافظ" اور "نواب" کے ساتھ شہرۂ آفاق ہوگیا۔ تن پر جب خلعت سرخ تھا تو نوابی اور ہوم ممبری پائی، اور جب یہ سراپا، از سر تا پا، "سر" ہوگیا تو کاتبان قضا نے ایک پورے صوبہ کی حکومت سامنے لا ڈالی۔ سر مڈی مین انجہانی کے بعد ذاتی اور قانونی اعتبار سے حق تو نواب سر احمد سعید خاں بہادر ہی رکھتے ہیں کہ صوبجات متحدہ کی مسند حکومت پر پہلے ہندوستانی گورنر کی حیثیت سے متمکن ہوں، اگر کہتے ہیں کہ وہ "سر" جن کی شہرت مالکم ہیلی کے نام سے ہے۔ اس منصب کے زیادہ حقدار ہیں۔ ہم اپنے بھائی نواب سر احمد سعید خاں بہادر کو انکے نئے اعزاز پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اسیطرح ہم دعا کرتے ہیں کہ حضور ملک معظم کی عمر میں خدا برکت دے کہ ہمارے نواب حیدر نواز جنگ بہادر کے خدمات کو شایستہ قرار دیکر انکے مجسمہ پر بھی "سر" کا تاج رکھ دیا۔ حافظ صاحب کو چھوٹا لاٹ بنایا ہے، تو خداوند کریم ہمارے نواب صاحب کو ہندوستان کا بڑا لاٹ بنادے۔ بڑی بڑی دعائیں، بڑے بڑے لوگوں کے حصہ میں آگئیں، اور ایک دلی مبارکباد باقی ہے، وہ ہم اپنے بہت پیارے بھائی سید معین الدین کی جناب میں پیش کرتے ہیں، جو اسی موقعہ پر خاں صاحب سے "خان بہادر" بنادیے گئے ہیں۔ برادرم مسٹر مثنیٰ بھی ایسی ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہم اس امر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ اولڈ بوائز کا ایک زبردست ڈپوٹیشن برادران کرم نواب فخر یار جنگ بہادر و نواب ناظر یار جنگ بہادر کی ریذیڈنسیوں پر حاضر ہو۔ آپ پوچھیں گے کیوں؟ اسکے لئے ہمارا جواب یہ ہے کہ اول الذکر نے عزیزی مشتاق احمد کے تقرر پر، اور آخر الذکر نے برخوردار ظفر الدین حسن کے تولد پر برادری کی مدارات کا انتظام نہ فرمایا۔ اب ہم وٹنرا در ایٹ ہوم پر راضی نہیں ہیں بلکہ ان بوریوں کے مزیدار ستوؤں کے خواہاں ہیں جو شاہ امان اللہ یورپ سے اپنی جیبوں میں رکھ کر کابل لائے ہیں۔ ہمارے بھائی ایسا انتظام کرسکے تو ہم ان کو مستحق مبارکباد خیال کریں گے۔

برادرم محمد اسحق خاں صاحب ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ (علیگ) جو قانون مجریہ بار کونسل

مورخہ یکم جون ۱۹۲۰ء کی رو سے ایڈوکیٹ ہوگئے ہیں۔ اپنی سرگرمیوں کو قومی تحریکات کی طرف نہایت تندہی سے مبذول کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے حال ہی میں مسلم یتیم خانہ بستی کیلئے ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ آپ کی کوششوں سے ونڈیا کمیٹی نے ٹرسٹ کو پانچسو روپیہ کا ایک چیک روانہ فرمایا ہے جو ۱۶ رجون کو مِل گیا۔ اور ایک غریب مسلمان طالب علم کو چھ روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی اُسی جگہ سے منظور ہوا ہے بھائی محمد اسحٰق خاں صاحب دیگر مقامات اور مقامی طور پر بھی مسلم یتیم خانہ کے لئے کافی فنڈ جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ بہت جلد مسلم یتیم خانہ کی عمارت کی بنیاد پڑجائے گی جو مسلمانان بستی کے قومی تحریکات میں مرکزیت قائم کرکے ایک نئے باب کا آغاز کریگی۔ ہم مسٹر محمد اسحٰق خاں صاحب کو انکی ان مخلصانہ سرگرمیوں پر تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ اور دعا گو ہیں کہ خداوندکریم اُنکے خلوص و نیک نیتی و توفیق خیر میں برکت عطا فرمائے۔

میجر محمد شفیع ہمارے بھائیوں میں اپنی سیرت کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں یہ ہمارے مولانا شوکت علی صاحب کے ولائتی پرنے (اور ہمارے دیسی ریزے) کی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتے تھے، اور اپنے تمام ساتھیوں میں اسوجہ سے ممتاز رہے کہ حاضرالوقت طلبہ کی مدارات میں ہمیشہ سعی بلیغ سے کام لیتے تھے تسبیح اسوقت بھی اُنکے ہاتھ میں تھی، اور اب تو بڑھ کر گنٹھا ہوگئی ہے تعلیم سے فارغ ہوکر سرکار آصفیہ کی فوجی ملازمت میں شریک ہوئے، اور چالیس سال میں چیف آف دی اسٹاف کے منصب تک ترقی پاکر اب وظیفہ حسن خدمت پر گھر بیٹھے ہیں۔ ہمارے بھائی کے خدمات پسندیدہ کے باب میں جو فوجی جریدہ شائع ہوا ہے، اس سے میجر حاجی محمد شفیع کے مرتبہ کا کافی اظہار ہوتا ہے۔ ہمیں اس کو پڑھکر بڑی مسرت ہوئی میجر صاحب کے بعد ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ انکے فرائض ہمارے بھائی میجر عبدالجبار صاحب کے سپرد کئے گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ بھی اپنے سرکاری خدمات کو ایسی ہی تن دہی سے انجام دیں گے، جیسے کہ ابتک انجام دیتے رہے ہیں۔ بھتیجا۔ اس خوشی پر دعوت نہ دی تو کچھ نہ کیا۔

جامعہ خواتین ہند، پونا، اپنی قسم کی پہلی یونیورسٹی ہے، جس کا قیام شریمتی نتھی بائی داموھر

تھا کرسی کے نام پر کیا گیا ہے۔ ۱۷ر جون ۱۹۲۳ء کو اس کے افتتاح کی غرض سے باشندگان شہر پونا
وبمبئی کا جو اجتماع ہوا تھا، اس کے کشود کار کیلئے ہمارے برادر مکرم نواب مسعود جنگ بہادر کو یاد فرمایا گیا تھا۔
باوجودیکہ حیدرآباد نمایاں طور پر ہزاروں تعلیم یافتہ اپنے آغوش محبت میں لئے ہوئے، اور شاہراہ
تعلیم پر نہایت سرعت کے ساتھ ہر حصۂ ملک میں ہزاروں نوجوانان گامزن ہیں لیکن پونا کے رہنے والوں کی
نگاہوں میں اب تک اس کو تعلیمی اہمیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ شاید اس وجہ سے ہے کہ اس باب
میں چند ذہن کے بچے سرزمین دکن پر پیدا نہیں ہوئے، جو گلاب کی بوئے خوش کے مانند تمام مملکتِ ہند
کی فضا کو عطر آگین کر دیں۔ باشندگان پونا چاہتے تھے کہ تعلیم حیدرآباد کے قائد نواب مسعود جنگ بہادر
کی زبان سے اپنے اس خیال کی تصدیق کریں لیکن ان کو شاید اس کی خبر نہ تھی کہ جو شئے انکے
نزدیک نہایت اہم ہے، وہ ہمارے بھائی کے لئے پیش پا افتادہ چیزوں سے زیادہ حقیقت
نہیں رکھتی۔ ہمارے اس دعوے کی دلیل خود نواب مسعود جنگ بہادر کی وہ افتتاحی تقریر ہے جو پونا
میں نہایت ذوق و شوق سے سُنی گئی، اور جو روزانہ اخبارات کے ذریعہ ناظرین اولڈ بوائے کے بیشتر
حصہ کے سامنے آچکی ہے۔ بھائی مسعود قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے برمحل اپنی قابلیت اور جوالا مکھی
شخصیت کا سکہ باشندگان پونا کے دلوں پر بٹھا کر حیدرآباد کی لاج رکھ لی اور ظاہر کر دیا
کہ حیدرآباد درحقیقت وہ حیدرآباد نہیں جیسا کہ اغیار نے مشہور کر رکھا ہے۔ کاش کہ حیدرآباد آپ کی
خدمات سے مستفید ہوتا اور آپکو متعدد ایسے مواقع ملتے کہ ملک اور اہل ملک کی وہ حقیقی خدمت انجام دیجاتی
جس کی بحالت موجودہ سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ سُنتے ہیں کہ اسی سلسلہ میں برادران مولوی عبدالحق
مولوی محی الدین، اور مولوی سجاد مرزا بھی علیگڈھ کے ایک دستہ کے ساتھ اس موقعہ کا تماشہ دیکھنے
تشریف لے گئے تھے، اور وہاں بھی اُنھوں نے کھانے پینے میں کوئی تکلف نہیں کیا۔ بھائی کے وطن
کے کباب تو پونا میں کہاں میسر آئے ہونگے لیکن دال بھات کی شاید وہاں بھی کمی نہ ہوئی ہوگی
ہاں۔ یادش بخیر، مولوی عبدالحق صاحب جوار کے رہٹوں کے کئی ٹوکرے اورنگ آباد سے
بھائیوں کیلئے لے جانا چاہتے تھے لیکن گلبرگہ اور حیدرآباد کے کھلنڈروں نے مولویصاحب

اس تبرک کو راستہ ہی میں اچک لیا۔

ہمارا نوٹ مشکل ہی سے ختم ہونے پایا تھا کہ آخرش ہمیں افسوس کے ساتھ نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات سرکار آصفیہ کے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو جانے کا اعلان کرنا پڑا نیز یہ بھی کہ وہ ۲۰ / جولائی کی صبح کو بعزم انگلستان راہی بمبئی ہوئے۔ الوداع کے موقعہ پر ہمارے بھائی کو حیدرآباد نے جس دل اور جس طریقہ سے خدا حافظ کہا ہے، اس کی مفصل کیفیت ہم آئندہ پرچہ میں درج کریں گے۔

”نیو انڈیا“ کا نئی دہلی کا نامہ نگار بذریعہ تار اطلاع دیتا ہے:- بھوپال سے آئی ہوئی خانگی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہز ہائینس نواب بھوپال کو چند روز قبل ایک سخت حادثہ پیش آیا جب کہ آپ پولو کھیل رہے تھے آپ کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر انصاری کی جو تار کے وصول ہونے پر فوراً دہلی سے روانہ ہو گئے کل تک یہاں پہنچ جانے کی توقع تھی لیکن آپ کو بھوپال میں زیادہ عرصہ تک ٹھہرنا پڑیگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کا مزاج ابھی بہتر نہیں ہوا ہے اور ہز ہائینس ابھی بستر علالت پر ہیں۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ شافی مطلق حضور ممدوح کو جلد صحت عطا فرمائے۔

نوٹ - حضور ممدوح اب بفضلہ بعافیت ہیں۔

اولڈ بوائز ڈائرکٹری

علیگڈھ اولڈ بوائز!

براہ کرم علیگڈھ اولڈ بوائز ڈائرکٹری (زیر ترتیب انگریزی) میں اپنے حالات درج کرنے کی غرض سے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں۔

۱۔ نام معہ ولدیت و سکونت۔ مقام و تاریخ پیدائش۔

۲۔ تعلیم کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی۔ علیگڈھ میں کس جماعت میں داخل ہو کر کہاں تک تعلیم پائی۔ تعلیم کے زمانہ کے خصوصیات و امتیازات (اگر کچھ ہوں)

۳۔ علیگڈھ میں تفریحی مشاغل کیا تھے اور ان میں کیا نام پیدا کیا

۴۔ علیگڈھ میں عملی طور پر کن کاموں میں شرکت کا موقع ملا اس کے نتیجے۔

۵۔ علیگڈھ سے باہر جا کر کس قسم کی زندگی اختیار کی اور اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔

۶۔ ملک میں یا بیرون ملک کوئی اہم سفر کیا ہو تو اس کا ذکر

۷۔ ملک کی علمی، ادبی یا شعری خدمت انجام دی ہو تو اس کا تذکرہ۔

۸۔ شادی کب اور کہاں ہوئی۔ اولاد کی تعداد و فرزندوں کے نام۔

سید منظر علی

دار الطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن